Downloaded from Paksociety.com

ممبر آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
ممبر کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
APNS
CPNE

بانی
سہام مرزا

مدیراعلیٰ ________ منزہ سہام
گروپ ایڈیٹر ________ ناصر رضا
ایڈورٹائزنگ منیجر ________ زین شمسی

ایڈوائزر ________ دانیال شمسی
انکم ٹیکس ایڈوائزر ________ مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

اکتوبر 2017ء
جلد: 45☆شمارہ: 10
قیمت: 60 روپے

خط و کتابت کا پتا
88-C II۔ فرسٹ فلور۔ خیابانِ
جامی کمرشل۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی
فون نمبر: 021-35893121 - 35893122
ای میل: pearlpublications@hotmail.com

منیجر سرکولیشن: آفتاب عالم......رابطہ: 03343193174

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

باتیں ملاقاتیں

سلسلے وار ناول

منی ناول

مکمل ناول

ناولٹ

ناولٹ

افسانے

بازگشت

دوشیزہ میگزین

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ)......890 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ......5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا......6000 روپے
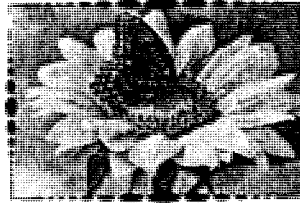
ماہنامہ سچی کہانیاں کراچی

پرل پبلی کیشنز کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ دوشیزہ اور سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی OB-7 تالپور روڈ، کراچی
Phone : 021-35893121 - 35893122
Email : pearlpublications@hotmail.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اب CSS ایک حقیقت

1) والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی اولاد اُن کا نام روشن کرے مگر فی زمانہ اکثر والدین اپنی خواہش کو بس اپنے دل میں ہی دبا کر رکھ لیتے ہیں۔

2) مشہور تعلیمی اداروں اور ان سے جڑے اساتذہ کی بھاری بھرکم فیس عام والدین کی پہنچ سے بہت دور ہوتی ہیں۔

3) ایسے میں ہم آپ کی رہنمائی کریں گے ہم آپ کی اولاد کو آپ کے لیے باعث فخر بنائیں گے۔

4) علم کی دنیا میں CSS ایک خواب۔

5) اس خواب کی حقیقی تعبیر کے لیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

6) انتہائی قابل ٹیچرز سے گھر بیٹھے اپنی لاڈلی بیٹی یا ہونہار سپوت کو CSS کی تیاری کرائیں۔

7) CSS میں آپ کی کامیابی کو ہم یقینی بنائیں گے۔

رابطہ کیجیے

www.facebook.com/srasheedkhan

کوئی فکر کی بات نہیں

چیف آپ نے لیفٹیننٹ ارسلان کے گھر آ کر اُن کے والدین سے تعزیت کی۔ قبر پر جا کر فاتحہ بھی پڑھی۔ آپ نے کہا جب میرا کوئی جوان شہید ہوتا ہے تب میں پوری رات جاگتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ بس آپ کا یہ کہنا ہی کافی ہے ہم بھی جانتے ہیں کہ فکر کی بات ہو ہی نہیں سکتی جس کے محافظ آپ جیسے ہوں وہاں فکر کیسی مگر چیف دل خون کے آنسو روتا اور کلیجہ منہ کو آتا ہے جب جوانوں کے خون سے پاک سرزمین نہاتی ہے۔ خاکی میں ملبوس میرے جوان روز اپنی دھرتی ماں پر قربان ہوتے ہیں اور اپنی ماں کو بے آسرا اور بے سہارا چھوڑ جاتے ہیں۔ چیف دکھ ہوتا ہے جب نااہل اور کرپٹ لوگ پوری شان و شوکت سے عدالتوں کا رخ کرتے ہیں۔ چیف شرم آتی ہے جب پیلٹ گن کا شکار کشمیری شہدا کے بجائے غزا کے شہید بچوں کی تصاویر اقوام متحدہ میں دکھا کر پاکستان کا تماشہ بنایا جاتا ہے۔ چیف آپ ہیں تو ہمیں کوئی فکر نہیں مگر جن کی وجہ سے پوری قوم شرمندہ ہے دکھی ہے، آزردہ ہے آپ سے التجا ہے اُن کی فکر ضرور کیجیے کیونکہ پاکستان ہماری آن ہے ہماری شان ہے، یہ ہے تو ہم ہیں اور ہم ہیں......تو سب ہیں۔

منزہ سہام

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اٹھائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

وہ تقریب جس کا انتظار کیا جاتا ہے۔

وہ تقریب جس میں ملک بھر سے قلم کاروں کا کارواں، اپنے محبت کرنے والوں کے روبرو ہوتا ہے۔

قلم کاروں کے قلم کا حق ادا کرنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش۔

بہت جلد......

اٹھائیسویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ کی تقریب اپنے روایتی رنگ میں جلوہ گر ہوگی۔

ذادراہ

غلام جو سردار بنے...

حضرت خبابؓ بن ارت (سادس الاسلام)

سید ابوعبداللہ خبابؓ بن ارت کا تعلق بنوتمیم قبیلہ سے تھا۔ تاریخ اس معاملے میں خاموش ہے کہ بنوتمیم کے اس خاندان پر کیا صعوبت نازل ہوئی کہ ان کے اس سپوت کو غلام بنا کر مکہ میں فروخت کر دیا گیا۔ حضرت خبابؓ ام نمار بنت سباع الخزاعیہ کے غلام تھے۔

حضرت خبابؓ ہنر مند آدمی تھے۔ لوہے سے تلواریں اور نیزے بنانا ان کا پیشہ تھا۔ محنتی تھے لہٰذا معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ مزے میں زندگی گزر رہی تھی۔ عین اسی زمانے میں رسول اکرمؐ نے حق کا آوازہ بلند کیا۔ حضرت خبابؓ نے بڑھ کر توحید کا دامن تھام لیا۔ وہ اسلام قبول کرنے والی اولین عظیم المرتبت ہستیوں میں شامل تھے۔

ان سے پہلے صرف پانچ افراد تھے جو ایمان کے شرف سے بہرہ مند ہوئے تھے یعنی حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید بن حارثہؓ اور ابوذر غفاریؓ۔

اس زمانے میں مکہ اہلِ ایمان پر تنگ تھا۔ اسلام قبول کرنا دنیا بھر کے مصائب اور اذیتوں کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

خود رسول اکرمؐ صبح شام مشرکین مکہ کے طعن و تشنیع اور اذیتوں کا شکار رہتے تھے ایسے عالم میں ایک بے یار و مددگار غریب الوطن غلام اِن کے عتاب سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔

لیکن حضرت خبابؓ نے اسلام قبول کرنے کے بعد ایک دن کے لیے بھی اس کو اخفا نہ رکھا اور یوں ''سادس الاسلام'' کا لقب پایا۔

ان کی آقا ام انمار نہایت ظالم عورت تھی۔ وہ بے اولاد تھی۔ علامہ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضرت خبابؓ کو لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں لٹاتی اور کبھی تپتے ہوئے لوہے سے ان کا سر داغا کرتی۔

اسلام لانے کے پہلے دن سے ان پر بے پناہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مظالم ڈھائے گئے۔کبھی ان کے کپڑے اتروا کر دہکتے انگاروں پر لٹادیا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیے جاتے یا کوئی قوی الہیکل شخص ان کے سینے پر بٹھا دیا جاتا تاکہ کروٹ نہ بدلنے پائیں۔

حضرت خبابؓ جلتے ہوئے کوئلوں پر کباب کی طرح بھنتے، جسم کی چربی پگھل پگھل کر انگاروں کو ٹھنڈا کر ڈالتی، زخموں کا علاج نہ کیا جاتا جس کے باعث زخم ناسور کی شکل اختیار کر لیتے لیکن تمام مظالم کے باوجود وہ حق کا دامن استقلال کے ساتھ تھامے رہے۔

رحمت عالم سرور کائناتؐ اس ظالم عورت کے مظالم کا حال سنتے تو بے حد دلگیر ہوتے۔حضرت خبابؓ کی دلجوئی فرماتے۔اس بد بخت عورت کو رسول اکرمؐ کی دلجوئی اور ہمدردی کا علم ہوتا تو مزید جوش کے ساتھ مظالم ڈھاتی، ظلم و تشدد سہتے سہتے ایک عرصہ گذر گیا۔ایک دن حضرت خبابؓ فریاد لے کر رحمت اللعالمین کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت رسول اکرمؐ کی دیوار کے سائے میں چادر سر کے نیچے رکھ کر آرام کر رہے تھے۔

حضرت خبابؓ نے رسول اکرمؐ سے عرض کی۔

''یارسول اللہ! اللہ کی مدد کب آئے گی۔''

یہ سن کر رسول اللہؐ اٹھ کر بیٹھ گئے۔غصے سے چہرہ مبارک سرخ ہوگیا۔آپؐ نے فرمایا

''تم سے پہلے گزشتہ زمانے میں ایسے لوگ بھی ہوئے تھے کہ لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت نوچ ڈالا گیا اور سوائے ہڈیوں اور پٹھوں کے کچھ نہ چھوڑا گیا لیکن ان کا ایمان متزلزل نہ ہوا ان کے سروں پر آرے چلائے گئے ان کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیا گیا لیکن انہوں نے دین کو نہ چھوڑا۔اللہ ضرور اپنے دین کو کامیاب کرے گا اور تم دیکھو گے کہ اکیلا سوار صنعا (یمن) سے لے کر حضر یا موت تک جائے اور سوائے عزوجل کے اس کو کسی کا ڈر نہ ہوگا۔''

حضور اکرمؐ کا ارشاد سن کر حضرت خبابؓ نے سر جھکا لیا اور صبر، حوصلے کا دامن مزید مضبوط کے ساتھ تھاما اور گھر چلے آئے۔

حضرت خبابؓ کی آقا ام انمار ان پر مظالم کے نئے نئے انداز آزماتی رہی۔

ایک دن حضرت خبابؓ نے رسول اکرمؐ سے اپنے لیے مدد کی دعا کی درخواست کی۔حضور اکرمؐ نے دعا کی یا الٰہی خباب کی مدد کر۔

علامہ اثیر نے لکھا ہے کہ حضور اکرمؐ کی دعا کے بعد ام انمار کے سر میں شدید درد شروع ہوگیا اور درد کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔وہ درد کی شدت سے کتوں کی طرح بھونکتی پھرتی تھی۔حکیموں نے اس کا علاج یہ بتایا کہ سر کو لوہے سے داغا جائے۔چنانچہ حضرت خبابؓ ہی کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ سرخ گرم لوہے سے اس کا سر داغیں۔چنانچہ وہ لوہا جو ام انمار حضرت خبابؓ کو داغنے کے لیے استعمال کرتی تھی اب اس کو اسی کو داغنے کے لیے استعمال کیا جاتا لیکن اس اذیت ناک علاج کے باوجود وہ صحت یاب نہ ہوسکی اور اسی مرض میں تڑپ تڑپ کر مرگئی۔

مشرکین مکہ کے دلوں میں نفرت اور انتقام کی ایسی آگ تھی کہ وہ جسمانی اذیت دے کر ٹھنڈی ہونے والی نہ تھی لہٰذا وہ مالی نقصان کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

عاص بن وائل مکہ کا ایک مشہور مشرک تھا حضرت خبابؓ کا کچھ روپیہ اس کے پاس باقی تھا وہ جب بھی روپیہ کی واپسی کا تقاضا کرتے تو وہ کہتا ''جب تک تم محمدؐ کا دین ترک نہ کرو گے میں تمہیں ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔''

جواب میں حضرت خبابؓ فرماتے کہ جب تک دوبارہ زندہ ہو کر اس دنیا میں نہ آئے میں محمدؐ کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔

عاص کہتا تو پھر انتظار کرو جب میں مر کر دوبارہ زندہ ہوں گا اور اپنے مال و اولاد پر متصرف ہوں گا تو تمہارا قرض لوٹا دوں گا۔

عاص دراصل اس طرح ایک طرف مسلمانوں کے عقیدہ آخرت کا مذاق اڑاتا اور دوسری طرف قرض کی ادائیگی سے بھی جان چھڑا لیتا۔

صحیح بخاری میں ہے کہ اس واقعہ پر قرآن حکیم کی یہ آیات نازل ہوئیں

''اے محمدؐ کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات سے کفر کیا اور کہا کہ (قیامت بھی) مجھے مال اور اولاد دی جائے گی کیا اس شخص کو غیب کا علم ہوگیا ہے یا اس نے رحمٰن سے یہ عہد لیا ہے۔ہرگز نہیں ہم اس کا یہ کہنا بھی لکھ لیتے ہیں اور اس کے لیے عذاب میں ڈھیل دیتے چلے جائیں گے اور جو کچھ یہ کہتا ہے اس کا ہم وارث ہوں گے اور یہ تنہا ہمارے سامنے لایا جائے گا۔''

(سورۃ مریم ۱۴)

حضرت خبابؓ عرصے تک ظلم و ستم سہتے رہے آخر کار جب ہجرت مدینہ کا حکم ہوا تو وہ رسول اکرمؐ سے اجازت لے کر ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے۔

مدینہ میں رسول اکرمؐ نے حضرت خبابؓ اور فراش بن صمہ کے غلام تمیم کے درمیان مواخات کرادی۔حضرت خبابؓ نے تمام غزوات میں رسول اکرمؐ کے ساتھ شرکت کی اور انتہائی شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔

حضرت خبابؓ اکثر رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپؐ سے دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ایک رات حضرت خبابؓ حضور اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپؐ نے ساری رات نماز پڑھنے میں گزار دی صبح ہوئی تو حضرت خبابؓ نے عرض کیا یارسول اللہؐ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان آج رات آپؐ نے جیسی نماز پڑھی اس سے پہلے کبھی نہیں پڑھی۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا یہ بیم و رجا کی نماز تھی۔میں نے بارگاہ رب العزت میں اپنی امت کے لیے تین چیزوں کی دعا مانگی تھی جن میں سے دو چیزیں منظور ہوگئیں اور تیسری چیز منظور نہیں کی گئی جو دعائیں قبول ہوئیں وہ یہ تھیں کہ اللہ دشمنوں کو مجھ پر غلبہ نہ دے اور اللہ میری امت کو کسی ایسے عذاب میں ہلاک نہ کرے جس سے گزشتہ امتیں ہلاک ہوئی تھیں۔

حضرت خبابؓ بے حد منکسر المزاج سادہ طبیعت اور مستغنی فطرت تھے۔ایک مرتبہ بہت سے اصحاب کے درمیان تشریف فرما تھے ان اصحاب نے حضرت خبابؓ سے درخواست کی کہ آپؓ ہمیں کسی بات کا حکم کریں تاکہ ہم اس پر عمل کریں انہوں نے فرمایا میں کون ہوں جو کسی بات کا حکم کروں ممکن ہے کہ میں لوگوں کو کسی بات کا حکم کروں اور خود اس پر عمل نہ کرتا ہوں۔

عہد فاروقی میں جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور غنائم کے ڈھیر کے ڈھیر مدینے آنے لگے تو حضرت خبابؓ بہت رویا کرتے اور فرماتے ہم نے رضائے الٰہی کی خاطر رسول اللہؐ کے ساتھ ہجرت کی اور ہمارا اجر اللہ کے ذمے رہا۔پر ہم سے بعض تو ایسے تھے کہ وفات پا گئے اور دنیا میں انہوں نے اپنے اجر کا کچھ پھل بھی نہ کھایا لیکن بعض کا پھل پک گیا اور وہ اسے توڑ کر کھا رہے ہیں۔معصبؓ نے وفات پائی تو ان کے کفن کے لیے ایک چھوٹی سی چادر کے سوا ہمارے پاس کوئی چیز نہیں تھی اس چادر سے ان کا سر ڈھانکتے تو ان کے پاؤں ننگے رہ جاتے اور پاؤں ڈھانکتے تو سر برہنہ رہ جاتا۔آخر رسول اکرمؐ کے حکم کے مطابق ہم نے ان کا سر چادر سے ڈھانک دیا اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پاؤں پر اذخر گھاس کی ایک قسم ڈال دی۔ آج یہ حال ہے کہ اللہ کا فضل بارش کی طرح ہم پر برس رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے مصائب کا بدلہ ہمیں کہیں دنیا ہی میں تو نہیں دے دیا۔

حضرت خبابؓ سے تینتیس احادیث مروی ہیں انہوں نے ۷۲ سال کی عمر میں وفات پائی۔ عمر کے آخری حصے میں کوفہ میں شدید بیمار ہوگئے۔ پیٹ کی تکلیف کے باعث ان کا پیٹ سات جگہ سے داغا گیا اس کی تکلیف بہت شدید تھی فرماتے کہ اگر حضور اکرمؐ نے موت کی تمنا کرنے سے منع نہ کیا ہوتا تو میں موت کی دعا کرتا۔

بیماری کی نازک حالت میں کچھ لوگ عیادت کے لیے آئے اور باتوں باتوں میں کہا کہ اے ابو عبداللہ خوش ہو جایئے کہ دنیا چھوڑنے کے بعد حوض کوثر پر اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملاقات کریں گے۔ یہ سن کر ان پر گریہ طاری ہو گیا فرمانے لگے میں موت سے نہیں گھبراتا لیکن تم نے جن ساتھیوں کا ذکر کیا ہے انہوں نے دنیا میں کوئی اجر نہیں پایا آخرت میں انہوں نے یقیناً اپنا اجر پالیا ہوگا لیکن ہم ان کے بعد رہے اور دنیا کی نعمتوں کا اس قدر حصہ پایا کہ ڈر ہے کہ کہیں وہ ہمارے اعمال کے ثواب ہی میں تو جمع نہ کیا جائے۔

وفات سے کچھ دیر قبل جب ان کے سامنے کفن لایا گیا تو حسرت سے فرمایا یہ تو پورا کفن ہے افسوس حمزہؓ کو ایک چھوٹی سی چادر میں کفنایا گیا جو ان کے سارے بدن کو بھی نہ ڈھانک سکتی تھی۔ پیر ڈھانکتے تو سر کھل جاتا اور سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں کھل جاتے تھے۔ آخر ہم نے ان کے پاؤں کو اذخر سے ڈھانک کر کفن پورا کیا۔

پھر انہوں نے وصیت کی کہ اہل کوفہ کی روایت کے مطابق مجھے شہر کے اندر نہیں بلکہ باہر کھلے میدان میں دفن کرنا اور یوں انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی وصیت کے مطابق انہیں شہر کے باہر دفن کیا گیا بعد میں کوفہ کے لوگ آس پاس اپنے مردے دفنانے لگے۔

حضرت علیؓ جنگ صفین سے واپسی پر ۳۷ ہجری میں کوفہ کی طرف واپس آئے تو شہر میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے شہر کے باہر سات قبریں دیکھیں۔ آپؓ نے حیرت سے کہا جب ہم یہاں سے گئے تھے تو یہاں پر کوئی قبر نہیں تھی اب یہ کس کی قبریں ہیں۔

لوگوں نے جواب دیا کہ یہ پہلی قبر حضرت خبابؓ کی ہے اور باقی وہ لوگ ہیں جن کو ان کی اتباع میں ان کے رشتے داروں نے یہاں دفن کیا ہے۔

یہ سن کر حضرت علیؓ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور وہ دیر تک حضرت خبابؓ کے لیے اور دیگر اہل قبور کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہے اور فرمایا ''خباب پر خدا کی رحمت نازل ہو اور وہ اپنی خوشی سے اسلام لائے، اپنی خوشی سے ہجرت کی، ساری زندگی جہاد کیا اور خدا کی راہ میں مشکلات اور مصائب سہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے نیکوکار بندوں کے عمل ضائع نہیں کرتا۔''

حضرت خبابؓ وہ اولوالعزم صحابی تھے کہ جنہوں نے غریب الوطن مسکین اور بے کس غلام ہونے کے باوجود اسلام لانے میں دیر نہ کی اور ''سادس الاسلام'' کا لقب پایا۔

حضرت خبابؓ نے حق کی راہ میں ایسے ایسے مصائب اور اذیتوں کا سامنا کیا جس کا حال سن کر بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ بے قرار ہو جاتے تھے۔ انہوں نے عزیمت کی راہ اختیار کی اور کبھی بھی اس میں کمزوری نہ دکھائی۔

خدا ان سے خوش ہوا اور وہ خدا سے خوش ہوں۔

وہ پہر دوستاں

دوشیزہ کی سینئر قلمکار شائستہ عزیز کے قلم سے......

تخلیق کار تخلیق سے کتنے دن دور رہ سکتا ہے؟ الفاظ، الہام یا وحی کی صورت میں تخلیق کار پر وارد ہوتے ہیں۔

ایسے ہی اَن کہے اَن چھوئے لمحوں میں ہماری

فرح دیبا، سائرہ غلام نبی، دلشاد نسیم، حمیرا راحت، سیما رضا (پہلی صف) ناہید فاطمہ
صبیحہ شاہ، سیما مناف، شائستہ عزیز (دوسری صف) غزالہ رشید (تنہا پیچھے)

پیاری صبیحہ شاہ نے اچانک یا بہت سوچ بچار کے بعد دوشیزہ کے چند پرانے اور نئے لکھاریوں کا ایک گروپ ''ہم دوشیزائیں'' کے نام سے تخلیق کر ڈالا۔

جس کی صبح سنبل کے پیارے تصویر والے گڈ مارننگ کے پیغام سے ہوتی ہے تو کبھی جمعہ والے دن سیما مناف یا عقیلہ حق جمعہ مبارک کہہ کر قلب و روح کو گرماتی ہیں اس میں حقائق بھی ہوتے ہیں تو لطائف بھی، تشبیہہ بھی، استعارے بھی، ستارے بھی اور حکایتیں، شکایتیں بھی۔

ان ہی دنوں کے بیچ پکنک کا پروگرام بنا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

منزہ سی سائیڈ جانا چاہ رہی تھیں تو عقیلہ واٹر پارک کا پروگرام بنا رہی تھیں ایسے میں سیما مناف دور کی کوڑی لائیں ان کا کہنا تھا کہ پکنک تو لمبا پروگرام ہے ہائی ٹی رکھ لیتے ہیں ، اچھا ہے سب جمع ہو جائیں گے۔ خوش قسمتی اور نیک نیتی دیکھیں کہ ایسے میں عندیہ یہ ملا کہ معروف لکھاری اور میری نظر میں بہت اچھی شاعرہ بھی دلشاد نسیم لاہور سے قریبی شادی میں شرکت کے لیے گیارہ اگست کو کراچی آ رہی ہیں اور ان کے پاس صرف بارہ اگست ہفتہ کا دن ہے۔ صبیحہ نے جھٹ پٹ پروگرام ترتیب دے لیا

گلشن اقبال کے عین قلب میں واقع لا ثانیہ ریسٹورنٹ کا انتخاب ان کا اپنا تھا سب کی دسترس میں بھی تھی وہ جگہ۔

ہفتہ کی دوپہر ایک بجے میں ریسٹورنٹ پہنچی تو لگا میں سب سے پہلے آ گئی ہوں مگر مجھ سے بھی پہلے ناہید عزمی (ناہید فاطمہ حسنین) پہنچی ہوئی تھیں۔ انہوں نے فوراً ہاتھ ہلایا ہم دونوں کے بعد شگفتہ شفیق آئیں ہنستی مسکراتی ۔ شگفتہ نے بیٹھتے ہی ناہید کے سوٹ کی تعریف کی۔ ناہید انکساری سے مسکرائیں۔

خود شگفتہ بھی سفید نیٹ کے ملٹی شیڈڈ کڑھائی والے سوٹ میں بہت تر و تازہ دکھائی دے رہی تھیں ۔ موصوفہ نے ابھی حال ہی میں امریکہ اور کینیڈا کی یاترا کی اور مشاعرے لوٹ کر آئی ہیں۔

اب تین دوست، تین قریبی سکھیاں دلشاد نسیم ، غزالہ رشید اور سیما رضا ردا خراماں خراماں آ رہی تھیں

دلشاد ہمیشہ کی طرح زندہ دلان لاہور کی عملی تفسیر پرجوش، فعال اور متحرک۔

عقیلہ حق، صبیحہ شاہ اور سیما رضا ردا سے کچھ کہتے ہوئے

ایک زمانے میں دلشاد کے لمبے گھنے بال بہت مشہور ہوا کرتے تھے مگر اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ دلشاد نے سرخ و سیاہ امتزاج کا کڑھائی والا خوبصورت سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ ہلکا ہلکا میک اپ اور قرینے سے بنا بالوں کا جوڑا۔

سدا بہار اور اسٹائلش سیما رضا کی چھب نرالی تھی۔

تم جس رنگ کے کپڑے پہنو اس کا روپ امر

مگر آج میں نے ان کے چٹیلوں کی تعریف دل کھول کر کی۔ فوراً بولیں ”ارے یار آپ لے لیں۔ ابھی لاہور گئی تھی تو لائی تھی۔“ سیما سدا کی

ملنسار اور متواضع۔ غزالہ ابھی چپ تھیں مگر مجھے پتہ تھا کہ یہ چپ کتنی دیر کی ہے؟ ان کی نوکِ زبان پر شوخ و شنگ جملے مچلتے رہتے ہیں۔ ہماری آج کی میزبان اور خزانچی بھی صبیحہ شاہ تھوڑی دیر میں آئیں ۔ جتنی سادگی اور سچائی ان کے آہنگ میں ہوتی ہے اتنی ہی لباس میں ہوتی ہے۔ غزالہ کو بھوک لگ رہی تھی انہوں نے شور مچا کر سب کو کھانا کھانے پر مجبور کیا۔ ”مہمان آتے رہیں گے کھانا تو شروع کریں بوفے ہے آخر، ٹائم تو لگے گا۔“ یہ غزالہ کا کہنا تھا۔

کھانے کے دوران ہی سیما مناف، عقیلہ، حمیرا راحت اور فرح دیبا بھی آ گئیں پھر تو محفل کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سیما مناف ینگ اور فریش لگ رہی تھیں ابھی تازہ تازہ امریکہ سے درآمد ہوئی ہیں۔ دونوں بیٹے بسلسلہ تعلیم شکاگو میں مقیم ہیں تو سیما کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ خوبصورت سے کاٹن کے سوٹ میں ملبوس تھیں اور کافی کم کم کھا رہی تھیں باقی سب دوشیزاؤں نے بہت اچھے بوفے سے پورا پورا انصاف کیا۔ اس دوران غزالہ کے برجستہ جملوں اور شوخی نے سب کو اپنے حصار میں لیے رکھا تھا۔ دلشاد کیک لائی تھیں جسے کاٹنے کے بعد سب کو خیال آیا کہ تالیاں بھی بجائی تھیں۔

پیاری عقیلہ کی آج چھب سب سے الگ تھی۔

بیش قیمت زیورات اور مہندی ان کی پہچان ہے۔ یہ مہندی کے بغیر کہیں نہیں جاتیں آج بھی ہاتھ گلرنگ ہوئے تھے۔ پتہ نہیں دل کی فرمائش پر لگاتی ہیں یا شوہر کی خواہش پر۔ کچھ بھی ہو پکی دہلی سوداگران والی لگتی ہیں۔

شگفتہ شفیق، غزالہ رشید، صبیحہ شاہ

میرے سوٹ کی کسی نے تعریف نہیں کی تو میں نے انہیں بتایا کہ یہ وہی جوڑا ہے جس کے بارے میں میں نے منزہ کو کہا تھا کہ دوشیزہ ایوارڈ کی تقریب کب ہوگی میرے جوڑے کا گوٹا کالا ہونے لگا ہے انہوں نے شنید دی کہ تیاری شروع کر دی گئی ہے۔

اس وقت گروپ میں غزالہ رشید کی اک پوسٹ کی بڑی واہ واہ ہو رہی تھی کہ ”آج میرا وائی فائی نہیں چل رہا تھا میں اپنے گھر والوں سے ملا، اچھے لوگ ہیں۔“

قارئین! حقیقت میں بھی کچھ ایسا ہی ہے، موبائل اور نیٹ نے ہمیں خالص رشتوں اور حقیقتوں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ے ہ،ت ،ا ور لر دیا ہے۔
ات ہیں نیک لوگوں کو آنے والے وقت کی خبر
ہ جایا ار تی ہے تب ہی تو اقبال نے غالباً ایک صدی
قبل لہ۔ دیا تھا

ے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
ا۔ اس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

مگر اس وقت یہی شیطانی مگر بڑے کام کا آلہ سب کا منظور نظر بنا ہوا تھا۔

میک اپ سے دوبارہ تر وتازہ ہو رہے تھے۔ موبائل کے لاڈ اٹھانے کی باری آ گئی تھی۔ زور وشور سے ہر آہنگ اور زاویہ سے تصاویر بنائی جا رہی تھیں ایسے میں منزہ، رضوانہ پرنس' فریدہ مسرور اور سنبل کو بہت یاد کیا گیا جو اپنی نجی مصروفیات کے سبب نہیں آ سکی تھیں۔ اسی دوران سائرہ غلام نبی افتاں وخیزاں چلی آئیں۔ سیما رضا کی شاعرانہ رگ پھڑک اٹھی

''چلیں بھئی سب شعر سنائیں اپنی یا پرائی شاعری، سب چلے گا۔''

قارئین آپ کو علم ہوگا کہ شاعر کھائے بغیر رہ سکتا ہے مگر اپنی شاعری سنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج تو موقع بھی تھا دستور بھی۔

دلشاد نسیم، شگفتہ شفیق، حمیرا راحت اور ناہید عزمی تو با قاعدہ شاعرات ہیں سب نے اپنا اپنا کلام سنایا باقی سب تو غیر شاعرات نے بھی حسب توفیق حصہ ڈالا۔ ایک چھوٹے گلدستہ کو شمع دان بنا لیا گیا تھا۔ وہ سب کے سامنے سرکایا جا رہا تھا۔

اسی اثنا میں ہمارا شور شرابا سن کر پیچھے والی میز سے ایک خوبصورت دوشیزہ اٹھ کر آئیں مانو مجھے لگا گویا منزہ مجسم ہو کر آ گئی ہوں۔ وہی ادائیں وہی بانکپن۔ کہنے لگیں

''میرے جیٹھ ساتھ ہیں ان سے میری شرط لگی ہے وہ کہتے ہیں یہ گروپ ٹیچرز کا ہے۔ میں منع کر رہی ہوں۔'' پتہ چلنے پر بہت خوش ہوئیں میں شرط جیت گئی ہوں میرا نام ذکیہ ہے میں جنوبی افریقہ سے آئی ہوں۔ محبت اور دوستی کی کوئی سرحد، کوئی ملک نہیں ہوتا آپ سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

قارئین مجھے لگتا ہے کہ ہم سب شکل سے خرانٹ لگ رہے ہوں گے کہ اس شخص کو ہم پر گورنمنٹ ٹیچرز کا گمان گذرا یا پھر ہمارے چہروں سے فہم وفراست ٹپکی پڑ رہی ہوگی کہ وہ خاتون شرط جیت گئیں۔

ویسے ہم سب میں سب سے زیادہ سدا سہاگن عقیلہ حق دکھائی دیتی ہیں! وہ جتنی طرح دار اور رعب دار دکھائی دیتی ہیں ملنے پر علم ہوتا ہے کہ گویا نمک اور موم سے بنی ہوئی ہوں۔ آزمائش شرط ہے۔

وقت بہت بیت گیا تھا مگر کسی کا دل نہیں بھرا تھا۔ دلشاد نے ہم سب کا بہت شکریہ ادا کیا اور باقاعدہ خطاب کیا ہم سب ان کے شکر گزار تھے۔ وقت رخصت ایک بار پھر تصویروں کا دور چلا۔

باہر گیلری میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ کر، لٹک کر ہر طرح سے تصاویر بنوائی گئیں۔ کسی کا اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

سہ پہر ڈھل گئی تھی' شام کے سرمئی سائے، گہرے ہونے لگے تھے۔

دلشاد کی خوبصورت آنکھوں میں گویا قندیلیں جلنے لگی تھیں خوشی سے تشکر سے۔

ہائے جان جاتی ہے جب اٹھ کے جاتے ہو تم

سب سے پہلے آنے والے سب سے پہلے رخصت ہوئے۔

وعدوں کا، قسموں کا دور چل رہا تھا۔

سب ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ ایک خوبصورت دوپہر آسمان پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ کر چلی گئی۔

☆☆......☆☆

ایک خوبصورت دن خوبصورت مہمانوں کے ساتھ

شائستہ عزیز

سیما مناف' سیما رضا ردا' دلشاد نسیم

ابھی لاثانیہ کی تقریب کا نشہ اترا ابھی نہ تھا کہ دوسرے ہی دن سیما مناف کا فون آ گیا

''شائستہ' میں جمعہ کو دلشاد کو لنچ پر بلا رہی ہوں۔ تھوڑے سے لوگوں کو بلایا ہے۔ تمہیں معلوم ہے میرا ڈرائنگ روم چھوٹا ہے۔ تم نے ضرور آنا ہے اس دن کوئی پروگرام نہیں رکھنا۔''

مجھے معلوم تھا کہ ایسا ضرور ہوگا دلشاد کراچی آئیں اور سیما دعوت نہ کرے یہ ممکن ہی نہیں۔ سیما کو دعوتیں کرنے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ خدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے کے مصداق جب ہاتھ میں ہنر بھی ہو اور لذت بھی ہو تو پھر تو دعوت بنتی ہی ہے۔

جمعہ والے دن سنبل پیاری کا گڈ مارننگ کا خوبصورت پیغام اور جمعہ مبارک کا خوش کن جملہ پورے دن کی تھکن اتارنے کو کافی تھا مگر تھکن ابھی شروع ہی کہاں ہوئی تھی۔ سیما کے گھر جا کر مجھے تھکن نہیں خوشی اور بے پناہ سکون کا احساس ہوتا ہے۔ سادگی اور خوبصورتی کا مرقع

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس کا گھر مجھے ہمیشہ ہی خوشی دیتا ہے اور آج تو پیاری منزہ کو بھی آنا تھا۔

سیما مناف نے آج اپنے مزاج کے ذرا ہٹ کے آتشی گلابی اور اورنج امتزاج کا جوڑا پہن

دلشاد نسیم' صبیحہ شاہ' غزالہ رشید' منزہ سہام' شائستہ عزیز' سیمار ضا ردا' سیما مناف

ہمیشہ کی طرح میں سب سے پہلے سیما کے گھر پہنچی ہوئی تھی۔ اپارٹمنٹ میں گھستے ہی دلفریب خوشبوؤں نے میرا استقبال کیا۔ ٹیبل تیار تھی بس کھانے لگنے کی دیر تھی۔ میرے فوراً بعد سیمار ضا چلی آئیں۔ براؤن غرارہ سوٹ میں کھلی پڑ رہی تھیں اور غرارہ پہن کر خاصی اترا بھی رہی تھیں اور کیوں نہ اترائیں ہر فیشن کرتی ہیں اور ان پر جچتا بھی ہے۔ ان کے غرارہ کو دیکھ کر منزہ کے اندر ایک ہوک سی اٹھی کہ کاش میں بھی...... مگر پھر ان کو خیال آیا کہ وہ دو دو ماہناموں کی مدیرِ اعلیٰ ہیں، لوگ کیا کہیں گے؟ منزہ، لوگوں کو گولی ماریں اپنے دل کی کریں۔ بڑا سنبھال سنبھال کر لیے پھرتی ہیں۔

ان کے بعد صبیحہ شاہ اور غزالہ رشید ایک ساتھ آئیں یارِ غار ہیں دونوں میں بڑی بنتی ہے زیادہ تر ایک ساتھ پائی جاتی ہیں۔

مہمان بہت مختصر تھے مگر گفتگو اللہ کی پناہ!

رکھا تھا۔ سیما کے ہاتھ پاؤں بہت خوبصورت ہیں۔

سیما میں تمہیں آج بتانے لگی ہوں کہ جب تم میرے برابر میں بیٹھی ہوتی ہو تو میں تمہارے چہرے

دو سہیلیاں دلشاد نسیم اور غزالہ رشید

سے زیادہ تمہارے خوبصورت ہاتھوں کو پیار سے دیکھتی رہتی ہوں جن میں دو خوبصورت نقشین کڑے جگمگا رہے ہوتے ہیں۔

وصی شاہ کی محبوبہ سے معذرت کے ساتھ کہ" کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا کنگن ہوتا' تو بڑے پیار سے گھماتی مجھ کو"

ایسا موضوع تھا جو زیرِ گفتگو نہ آیا ہو۔ دلشاد اور سیما مناف اس وقت پکی پکی سائیں بنی ہوئی تھیں اور ممتا ان کے عکس و آہنگ سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ دلشاد کا چھوٹا بیٹا سڈنی (آسٹریلیا) میں بغرضِ تعلیم مقیم ہے وہ اس کی باتیں کر رہی تھیں۔

میں سڈنی گئی تو ایک دن اس کے ساتھ باہر

غزالہ اور شائستہ سوچوں میں گم

یہ ہاتھ مجھے پیارے کیوں نہ ہوں کہ یہ ہاتھ کیسے کیسے شاہکار تخلیق کر رہے ہیں۔ ان ہاتھوں سے لذت اور ذائقے کی نئی نئی داستانیں رقم ہو رہی ہیں۔

قارئین! مجھے سیما اور اس سے وابستہ ہر شے سے پیار ہے۔ اس کا گھڑاپا، سلیقہ مندی اور ایثار میری روح کے اندر بستے ہیں (بہت تو نہیں ہوگیا سیما؟) سیما بظاہر جتنی باتونی اور چلبلی ہے اندر سے بھی ویسی ہی ہے جبکہ غزالہ بظاہر جتنی جملہ باز اور بذلہ سنج ہیں اندر سے بہت حساس، ذمہ دار اور سنجیدہ دوشیزہ ہیں۔

اس وقت ہم سات' ستر پر بھاری تھے کون سا جانا پڑا۔ راستے میں اس کی گاڑی پولیس نے روک لی اور کہا لائسنس دکھاؤ، اس نے کہا نہیں ہے، کاغذات دکھاؤ، کہا نہیں ہے۔ پھر کیا ہے تمہارے پاس؟ میرے پاس ماں ہے' جواب آیا۔ کہتے کہتے دلشاد کی آنکھوں میں فخر و تفاخر چھلکنے لگا۔

سیما کو بھی ہوک اٹھی۔" میرا چھوٹا طٰہٰ بھی آتے جاتے کہتا ہے، ماں تو کتنی عظیم ہے۔ تو کام کر کر کے تھکتی نہیں' دونوں مائیں اپنے اپنے بیٹوں کا ذکر کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔ اتفاق سے منزہ کے بھی دو بیٹے ہیں۔ بار بار گفتگو میں ان کے بھی حوالے آ رہے تھے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تینوں کے دو دو بیٹے ہیں بیٹی کوئی نہیں ہے مگر سیما نے اپنی گھر کے کاموں میں مددگار (جویریہ، شکیلہ) کو بیٹیاں بنا کر ٹرینڈ کیا ہے انہوں نے آ کر اطلاع دی کھانا لگ گیا ہے۔ سب سے پہلے اسپیشل قسم کا چکن کارن سوپ پیش کیا گیا جو اپنی مثال آپ تھا۔ سیما ایک بہترین کک ہیں اور مہمان نواز بھی۔

سیما کا ڈھیر سارا پیار، کولڈ ڈرنکس، میٹھے میں شاہی ٹکڑے اور پان۔ ہر چیز سیما نے خود گھر پر بنائی تھی۔ سیما ان کاموں میں ماہر ہیں وہ بڑی سے بڑی دعوت آسانی سے کر لیتی ہیں اپنے حلقۂ احباب میں اس کے لیے مشہور ہے۔

کھانے کے بعد ایک بار پھر باتوں کا دور چلا

میزبان سیما مناف درمیان میں سیما رضا ردا، دلشاد نسیم

وہ اپنے ہاتھوں سے کھانا نکال کر دے رہی تھیں۔

سب سے پہلے شامی کباب کی باری آئی جو بہت تیکھے اور کرارے تھے۔ سب نے واہ واہ کر کے کھائے۔ سیما کی اسپیشلٹی پائے اور پلاؤ سب سے پہلے سامنے آئے سب نے پائے نعمت سمجھ کر جی بھر کر کھائے سوائے میرے۔ چکن تکہ، کریلے گوشت، ہمہ اقسام کی سلاد، کھٹے آلو، بینگن کا رائتہ، چٹنیاں،

۔ سیما رضا کہنے لگیں کہ کل انہوں نے ماضی کی بھولی بسری نامور گلوکارہ گلبہار بانو کا انٹرویو کیا ہے اس پر ان کی گائی ہوئی دو مشہور غزلیں سب کو یاد آ گئیں

ایک تو چاہت میں کیا دنیا داری عشق میں کیسی مجبوری

اور دوسری تو پھر یہ طے ہے کہ اب عمر بھر نہیں ملنا۔

غزالہ سے فرمائش کر کے دوسری والی غزل سنی گئی جس پر جویریہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اسے شاید

غزالہ سے یہ توقع نہیں تھی۔ غزالہ خاصی خوش گلو ہیں!

سیما رضا نے اصرار کر کے آج پھر سب کو شعر، حکایت یا کوئی نہ بھولنے والی بات سنانے کی فرمائش کی۔ یہ ان کی عادت ہے ادبی ماحول بنانے کی خود خاصی باادب ہیں ناں۔ صبیحہ نے غالب کا شعر سنایا۔

سیما مناف نے اپنی پرانی شاعری سنائی، منزہ نے

کون جس کا ایسا مقدر ہو
سب رتیں مجھے روئیں گی
کوئی مجھ سے بھی قلندر ہو

(کیا خیال ہے شگفتہ، ناہید اور حمیرا میں شاعری کر سکتی ہوں؟)

ہم سب میں گفتگو ہو رہی ہے اور پھول والی

سیما رضا، منزہ سہام، دلشاد نسیم، شائستہ عزیز، غزالہ رشید، سیما مناف، صبیحہ شاہ

خلاف توقع ایک لطیفہ سنا کر محفل کو گرما دیا۔

دلشاد سے بھی ان کی شاعری سنی گئی

چند حاصل مطالعہ اشعار خوش ذوق قارئین کی ذوق طبع کی نذر

ہجر کا بھی قبیل ہوتا ہے
درد دل کا کفیل ہوتا ہے
یاد آیا نہ کر نمازوں میں
میرا سجدہ طویل ہوتا ہے
ایک خط آپ کی جانب سے
خود ہی لکھتے ہیں خود ہی پڑھتے ہیں

میری باری آئی تو مجھے اپنی اسی کی دہائی میں کہی گئی غزل کے دو شعر صد شکر یاد آ گئے

دل دریا آنکھ سمندر ہو

سرکار (فرزانہ آغا) کا ذکر نہ آئے یہ کیسے ممکن ہے۔

فرزانہ آپ کے بغیر گروپ اور محفل دوستاں ادھوری ہے۔

آپ کے طفیل روزانہ گروپ میں نت نئے گل بوٹے دیکھنے کو مل رہے ہیں جلد لوٹ آئیں میں نے دل ہی دل میں دردانہ نوشین، زمرنعیم، رضوانہ کوثر اور نسیم نیازی کو بھی شدت سے یاد کیا کہ وہ بھی ہمارے دل ونظر میں بستی ہیں دیرینہ ساتھی ہیں

ایک بار پھر میک اپ کو ریفریش کرنے کی باری آ گئی تھی سب نے لپ اسٹک تازہ کی تصویروں کا دور چلا پچھلی تقریب کی تصویریں دیکھی گئیں تو سب سے زیادہ تصاویر شگفتہ کی تھیں جبکہ بقول ان کے ان کا اس دن کیمرہ خراب تھا اگر صحیح ہوتا تو؟؟

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

شگفتہ اور عقیلہ انٹرنیٹ کی ملکائیں اور شہزادیاں ہیں۔ صرف میں اور غزالہ ایسے ہیں جنہیں موبائل سے تصاویر اتارنی نہیں آتیں۔

ہے؟ دل چاہتا تھا کہ سیما کے خوبصورت ہاتھ چوم لیے جائیں جنہوں نے آج کی محبت اور تواضع کی نئی

دلشاد اور صبیحہ کھانے سے انصاف کرتے ہوئے

تصاویر کے بعد چائے کا دور چلا اور دو طرح کی چائے پی گئیں ساتھ ساتھ سیما کے ہاتھ کی بنی مزیدار سونف سپاری سے بھی شغل جاری تھا۔
دلشاد کے خوبصورت ہیر اسٹائل میں لگے دو پھول اب مرجھانے لگے تھے گویا وقت رخصت آن پہنچا تھا سب کی آنکھوں میں ہجر ہچکولے لینے لگا تھا اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔
شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔
ہوا کو کسی نے روکا ہے وقت کو کسی نے زنجیر کیا
کہانی رقم کی تھی۔
دلشاد کی خوبصورت آنکھیں جھلملا رہی تھیں
پلکیں بار تشکر سے جھکی جاتی تھیں
سیما تمہارا بہت شکریہ! کہ تم نے ایک خوبصورت دوپہر ہم سب کے نام کی
تم سدا خوش رہو، تمہارا خوبصورت گھر سدا بنا رہے، تمہارے پیار کرنے والے سلامت رہیں
(آمین)

☆☆......☆☆

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ، خوب صورت
رابطوں کی دلفریب محفل

مدیرا علی

دوشیزہ کی محفل پڑھنے والوں کو میرا اسلام... میں ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جو گاہے بگاہے میری رہنمائی کرتے رہتے ہیں اور اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر محفل میں شرکت کرتے ہیں ہم سب جانتے ہیں کہ پرنٹ میڈیا اس وقت انتہائی نامساعد حالات کا شکار ہے۔ لوگوں کو پڑھنے سے زیادہ دیکھنے پر توجہ دینی شروع کر دی ہے حالانکہ بڑوں سے سنا تھا کہ بعض اوقات آنکھوں دیکھا بھی جھوٹ ہوتا ہے۔ بہر حال قلم قبیلے والوں کو قلم سے دوستی رکھنی ہوگی اور اپنے اطراف لوگوں کو قائل کرنا ہوگا کہ ذہنی وسعت کے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے۔ پڑھا لکھا معاشرہ وہی کہلاتا ہے جہاں کتابیں پڑھی جاتی ہیں... ہمیں اپنی کوشش جاری رکھنی ہوگی۔ زمر اور راحت وفا آپ کے خطوط کیونکہ پچھلے ماہ کے حوالے سے تھے اس لیے محفل میں جگہ نہ پاسکے۔ میں پھر ان تمام خواتین و حضرات سے گزارش کروں گی کہ اپنی تحریر ان پیج یا پی ڈی ایف پر ارسال کریں۔ ٹائپ شدہ خطوط پڑھنا ناممکن ہے اور انہیں تلف کرتے ہوئے مجھے ذاتی طور پر بہت دکھ ہوتا ہے۔ ایک گزارش اور کہ اپنی تحریر بھیجنے کے بعد ایڈیٹر پر بھروسہ کر لیا کریں کہ وہ آپ کو آپ کی تحریر کے حوالے سے ضرور آگاہ کریں گے مگر کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ ایک پرچا تیار ہوتا ہے اور دوسرا تیاری کے مراحل میں لہٰذا اس صورت حال میں تحریر کے بارے میں بتانا ذرا مشکل ہوتا ہے... لہٰذا آپ لوگ تھوڑا تحمل اور اعتماد رکھیے ادارہ اپنی ذمہ داریاں خوب سمجھتا ہے... میں ذاتی طور پر غزالہ رشید کی بھتیجی مسرت گیلانی اور نسرین اختر نیناں کے والد کے انتقال پر دلی تعزیت کرتی ہوں... دونوں کا نقصان ناقابل تلافی ہے مگر اللہ کی مرضی کے سامنے ہم بے بس اور لاچار ہیں ورنہ شاید کبھی بھی کوئی اپنے پیارے کو رخصت نہ کرنا چاہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ غزالہ رشید اور نسرین اختر نیناں کو صبر جمیل عطا فرمائے... اس دعا کے ساتھ چلیے اپنے پہلے خط کی طرف بڑھتے ہیں۔

فرحت صدیقی، فیصل آباد سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ السلام علیکم، خوش رہو اللہ تعالیٰ تمہیں بہت ساری خوشیاں دے۔ آپ نے دونوں خطوط شائع کر کے دل خوش کر دیا۔ رقصِ جنوں پسند کرنے کا بہت شکریہ۔ پڑھنے والوں کی حوصلہ افزائی قلم میں ستارے سمو دیتی ہے جو کہکشاں بن کر زندگی کے آسمان پر جگمگا اٹھتے ہیں۔ ''بیگم'' ہماری ڈائریکٹر ہیں جن سے تعلق 1967 سے ہے۔ آدھی صدی کا پیار کم نہیں ہوتا۔ میری غمگسار، میری دوست، میرے ہر دکھ درد میں شامل۔ انسان وہ کندھا کبھی نہیں بھول سکتا جس پر وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سر رکھ کر اپنے دکھ آنسوؤں سے کہہ دے۔ میری کتاب ''پانی کے پھول'' میں ان سے وابستہ سارے رشتے موجود ہیں۔ میں اپنی دونوں کتابیں ''پانی کا پھول'' اور ''یاد کے آنسو'' بھجوا رہی ہوں۔ صبیحہ شاہ، پیاری سنبل، خولہ عرفان، شائستہ عزیز صاحبہ اور عقیلہ حق آپ سب کی شکر گزار ہوں کہ آپ کو میری تحریر اچھی لگی۔

اب بات ہو جائے ذرا ستمبر کی ''دوشیزہ'' کی جو آنکھوں میں خمار اور غرور سموئے نجانے کہاں دیکھ رہی ہے؟ رنگا رنگ اشتہاروں سے آگے بڑھ کر دیکھا دوشیزہ رائٹرز کی لسٹ پر نظر دوڑائی۔ سارے نام اپنے اپنے لگے۔ دل خوش ہو گیا۔ ''تنہائی کا زہر'' اور ''ابھی امکان باقی ہے'' دونوں سلسلے بہت خوبصورت اور دل کو چھو لینے والے ہیں...... تاریخی کہانی شمارے کا جھومر ہوتی ہے۔ پڑھ کر دل میں ایمان کی لہریں موجزن ہو جاتی ہیں۔ حضرت عمار یاسرؓ کی والدہ حضرت سمعیہؓ کی شہادت کا پڑھ کر دل بے چین ہوا۔ ایمان کی ابتدا کے یہ لوگ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں کہ کتنی بے بسی اور مشکلوں کے باوجود اپنے پاؤں پر کھڑے رہے۔

ڈاکٹر روتھ انسانیت کا وہ اونچا مینار ہے جس کی روشنی مایوسی کے اندھیروں میں حیات بن کر چمکتی ہے۔ معاشرے کا حُسن ان لوگوں کی قربانی اور وجود سے تھا۔ جس نے دکھی دل کو دکھ سے اور جسم کو بیماری سے شفا دی وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے مگر علاج اور مریضوں گے لیے جان وقف کر دینا! یہ اللہ کے محبوب بندے ہیں۔ ''دوشیزہ کی محفل'' کا اختتام آغاز اور اختتام اپنے خط سے دیکھا۔ خوش رہو منزہ۔ خوش رہو، خوش کر دیا آپ نے۔ ''تنہائی کا زہر'' کی دوسری قسط کا انتظار ہے۔ ''گرداب'' بہت بڑا المیہ ہے۔ آج کے اکثر نوجوان شارٹ کٹ ڈھونڈتے ڈھونڈتے جان سے گزر جاتے ہیں۔ کاش وہ سمجھ سکتے ''محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔'' اپنا وطن ماں کی گود کی طرح ہوتا ہے۔ عورت قربانی کا دوسرا نام ہے۔ عورت کا ''مان'' اس کو زندہ رکھتا ہے۔ ساری زندگی کی ریاضت ایک لمحے کی بے وقعتی سے کہی ہوئی بات توڑ ڈالتی ہے۔ آدم کے بیٹے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ عقیلہ حق کی ''محبت فاتح عالم'' کمال کی شرارتی کہانی ہے۔ محبت ہی تو زندگی ہے ورنہ یہ صحرا کی مانند ہوتی ہے۔ رانیہ کی ماں دنیا کی ہر ماں کی طرح ہے جو اولاد اور پھر اس کی اولاد کے لیے چٹان بن جاتی ہے۔ جب تک سانس ہو آس رہتی ہے۔ اللہ کرے رانیہ ہوش میں آ جائے تا کہ ماں کے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچے۔ آمین۔ حمیرا فضا کا ''آئینے میں ایک اور پچھتاوا'' اچھی کہانی تھی۔ باقی سب کہانیاں بھی بہت اچھی ہیں۔ اب اجازت چاہوں گی انشاء اللہ اگلے ماہ ملاقات ہوگی خطوط کے ذریعے۔ آپ کی مخلص۔

○ درست کہا آپ نے انسان وہ کاندھا کبھی نہیں بھول سکتا جس پر سر رکھ کے رویا ہو، کتابوں کا تحفہ سب سے خوبصورت تحفہ ہوتا ہے اس کے بعد پھول، تو اس قدر خوبصورت تحفہ بھیجنے کا شکریہ... سب پڑھنے والوں نے آپ کی تحریر کو بہت پسند کیا ہے۔ لہٰذا آپ کا قلم نہیں رکنا چاہیے... ''دوشیزہ'' کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ!

▤ سنبل، کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ السلام علیکم! اللہ کا کرم ہے ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت بمع اسٹاف اور اہل خانہ نیک مطلوب ہے۔ اب آتے ہیں 'دوشیزہ' کی طرف۔ اداریہ بہت Heart touching تھا۔ غلام جو بنے سردار بہت نایاب سلسلہ ہے۔ بہت اچھی اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر رتھ فاؤ پر بہت اچھا لکھا منزہ آپ نے۔ میرے پاس بھی میری ایڈلیڈ لیپروسی سینٹر کا سٹیفکیٹ ہے ایک بار کالج آئے تھے سینٹر والے Awareness کے لیے... یقیناً رتھ فاؤ ایک اچھی انسان تھیں۔ محفل میں اس بار کافی روٹھے ہوئے لوگ شامل تھے، بھئی محفل سے ہم ہیں، ہم سے محفل نہیں۔ فرحت صبیحہ شاہ، غزالہ رشید، روحیلہ، شائستہ عزیز وغیرہ۔ خولہ اور عقیلہ کے خط حسب معمول شاندار تھے۔ زمر کا شعر اچھا تھا۔ ''تنہائی کا زہر'' اور ''مرے چارہ گر'' پر تبصرہ ادھار رہا... ''ابھی امکان باقی ہے'' مدھر سروں میں بہہ رہا ہے۔ فرحی اکثریت ملک سے باہر جا کر پڑھتی ہے اور انہیں ان مصائب کا اندازہ ہوا ہے آپ نے تو بہت دل دہلا دینے کا نقشہ کھینچا ہے' کاش آپ نے ''یارم'' پڑھا ہوتا' سمیرا احمید کا اس نے لڑکی ہو کر باہر رہ کر Survive بھی کیا، تعلیم بھی حاصل کی اور گھر والوں کی مدد بھی کی ... ''مان'' کچھ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں سب کچھ مٹی میں ملا دینے والے۔ عقیلہ مزہ نہیں آیا۔ آپ اس سے بہت اچھا لکھتی ہو۔ کرن کا افسانہ اچھا تھا... حمیرا کا افسانہ حقیقت سے بہت قریب تھا۔ جو وعدہ رب نے سورۃ نور میں کیا نیکوکاروں کے لیے نیکوکار اور بدکاروں کے لیے بدکار۔ خولہ کا ناولٹ بہت خوبصورت ناولٹ تھا۔ ہماری عورتوں کی اکثریت کا المیہ ہے گھر اور گھر والوں کے لیے نہیں سنورنا، باہر والوں کے لیے سنورنا ہے۔ گھر والے کا زیادہ حق ہے، آپ کو اچھے حلیے میں دیکھنے کا... عائشہ نور کا افسانہ اچھا تھا۔ ایک خط بھی اچھا افسانہ تھا۔ عمران نے بھی بہت اچھا لکھا۔ حفصہ نے جگنو کو دائمی زندگی دے دی۔ حاجرہ کا افسانہ بہت اچھا اور ہلکا پھلکا افسانہ تھا۔ نگہت غفار کا ناولٹ اچھا تھا۔ حبیبہ کا ناول اختتام پذیر ہوا۔ اروی کی نیک دلی نے حیان کو جینا اور اعتبار کرنا سکھا دیا Weldone حبیبہ۔ ''دوشیزہ گلستان'' اس بار بہت اچھا مہکا۔ کچن کارنر میں ڈشز مزے کی تھیں۔ اب آپ سنائیں کیا ہو رہا ہے۔ شدید گرمی کے بعد آج کل موسم پھر خوشگوار ہے۔ ''دوشیزہ'' 19 تاریخ کو پوسٹ مین کی مہربانی سے کسی اور کے گھر سے برآمد ہوا۔ ماشاء اللہ اس بار افسانوں کا معیار خاصا بہتر تھا... اللہ کرے ''دوشیزہ'' یونہی دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین ثمہ آمین۔ اب اجازت دیں اپنا خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا فی امان اللہ

○ پیاری سنبل! ایک ایک سطر پڑھ کر تبصرہ کرنے والوں کو میرا اسلام۔ سنبل کوشش کر رہی ہوں کہ دوشیزہ کے افسانوں کا وہی پرانا والا معیار واپس لے آؤں تم لوگوں کا ساتھ رہا تو انشاء اللہ جلد ایسا ہی ہوگا۔ اداریہ اور ڈاکٹر رتھ فاؤ پر بکھرے الفاظ تمہیں اچھے لگے شکریہ باقی تمہاری تعریف اور رائے مصنفین تک پہنچا دی ہے وہ فوراً تمہارا شکریہ ادا کریں گے۔

▤ سیمار ضا ردا' کراچی سے لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ! کیسی ہیں۔ حسبِ وعدہ افسانہ پوسٹ کر دیا ہے امید ہے پسند آئے گا... غلط میسیجز کچھ مناسب بات نہیں مگر آپ کے میسج نے جو کسی اور کے لیے تھا اور مجھے مل گیا... بات کرنے کا خوبصورت بہانہ بنا... میں لائیو شو کر رہی تھی ایسے میں آپ کا میسج ملا۔ شو ختم ہوتے ہی کال ملائی جو صحیح نمبر پر لگی اور دوسری جانب سے آپ کی آواز ابھری... سلامتی اور وضاحت کے بعد وہی خوب صورت گفتگو ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ بھی کوئی لائیو شو ہی چل رہا ہو... ویسے منزہ یہ آپ کی دوشیزائیں کافی عرصے پہلے دوشیزاؤں کی فہرست سے باہر ہو چکی ہیں... باقی آپ کی مرضی... ہم تو ایسے بھی خوش اور ویسے بھی ... دوشیزہ اپنی پوری آب و تاب سے میرے سامنے موجود ہے... تمام لکھاری بہترین لکھ رہے ہیں اور فہرست میں ہر ماہ نئے لکھنے والوں کا اضافہ خوش آئند ہے... آدھی ملاقات تو ہو گئی اب پوری ملاقات کا کوئی بہانہ بنائیے... انشاء اللہ پھر ملیں گے اگر خدا لایا...

○ سیما جان... تمہارا خط تمہاری طرح شوخ و طرحدار ہے... بات کرنے کا فن تو کوئی تم سے سیکھے... زندہ باد ریڈیو پاکستان کیسے کیسے موتی اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے... میرا موبائل کا معاملہ بس کچھ ایسا ہے وہ کہتے ہیں نا کہیں پہ نگاہیں کہیں پہ نشانہ۔ بس اب اور کیا کہوں... اور بھئی ہم سب کتنے بڑے کیوں نہ ہو جائیں دوشیزہ ہی کہلائیں گے اسی لیے تو کہتی ہوں دوشیزہ میں لکھتی رہا کرو ادھر دوشیزہ سے دور ہوئیں ادھر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دوشیزگی سے...... کیسا؟... محفل میں ضرور شرکت کیا کرو۔

▤ خولہ عرفان، کراچی سے لکھتی ہیں۔ عزیز و محترم منزہ سہام صاحبہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ! السلام علیکم! ہر ماہ کی طرح تبصرہ کا تحفہ لیے حاضر محفل ہوں۔ ماہ رواں کا دوشیزہ مقررہ وقت پر ہاتھوں میں آکر ہمیشہ کی طرح ذہن و دل کو تروتازہ کر گیا۔ آپ کا اداریہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار، اپنے ہر ہر لفظ سے ایک سچے پاکستانی ہونے کی عکاسی کرتا لہو گرما گیا۔ ان ہم وطنوں کو میرا اسلام جو اپنی جاں سے گذر کر محبتوں کو امر کر جاتے ہیں۔ ام ایمان کے حضرت عمار یاسرؓ سے متعلق مضمون کے سامنے لفظ خاموش ہیں۔ ان ہستیوں کا ذکر پڑھ کر یقین جانیں ایمان جاگ جاتا ہے۔ اللہ ہمارے اندر بھی وہ دینی حمیت و فہم اور فراست پیدا فرمائے۔ (آمین)

محفل کی رونق صبیحہ شاہ اور غزالہ رشید صاحبہ کی آمد نے چار چاند لگا دیئے۔ ہمیں ان جیسے تجربہ کار مصنفین کے تبصروں کی ضرورت ہے۔ عقیلہ، سنبل، زمر، روحیلہ اور حبیبہ عمر کو دیکھ کر مزہ آ گیا۔ یہ محفل بھرپور ادبی محفل لگ رہی تھی۔ مصنفین کے جامع و بے لاگ تبصرے ہی نئے آنے والوں کو حوصلہ بخشتے ہیں۔

ویسے منزہ تعریف کا شکریہ لیکن پورا رسالہ چھان مارا لیکن اپنی شاعری سے متعلق باکس رسالہ بوس ہو گیا شاید... کوئی بات نہیں۔ پھر سہی۔ آج نہیں کل سہی۔ خیر اب تحریروں پر تبصرہ ہو جائے۔ اب کے افسانوں کو پڑھ کر جو پہلا احساس جاگا وہ یہ تھا شاید اس دفعہ عیدالاضحیٰ پر سب کے خوب ہی خوب قربانیاں کی ہیں اور ساری تھکن رسالے پہ اتاری ہے۔ کچھ الفاظ آگے پیچھے ہو کر جملے کی بے ساختگی کو متاثر کر رہے تھے تو کچھ افسانوں کے صفحات آگے پیچھے ہو گئے تھے اور جب خولہ عرفان کی ڈائری پڑھی تو اپنی شاعری نثری انداز میں دیکھ کر آنکھیں آٹھ آٹھ آنسو کی جگہ سولہ سولہ آنسو بہانے کے لیے بیقرار ہو گئیں اشعار کچھ یوں تھے:

خود فراموشی کو میری قوم کی میرے خدا
خود آگاہی سے بدل دے تو بھلا کیا بات ہے
روشنی غماز کب ہے کہ طلوع سحر ہے
قوم کو یارب بتادے دن نہیں یہ رات ہے
لکھنے سے تاریخ جد کی قد بڑا ہوتا نہیں
خاک میں ملتا ہے انسان تو پنپتی ذات ہے
جو عمل کے ہم دیوں کی لو اوپر کریں
منزلوں پر پھر اندھیروں کو سمجھ لو مات ہے

امید ہے اب درست طریقے سے شائع ہو جائیں گی۔ ناول ''زہر تنہائی''، تحسین انجم انصاری کا مرے چارہ گر... اور زمر کا ابھی امکاں... میں تینوں مصنفین اپنی تحریروں کے ساتھ خوب انصاف کر رہے ہیں اور ہر جذبے کی خوبصورت لفظوں سے عکاسی کرتے ہیں تیر نیم کش خوشگوار اختتام کے ساتھ کچھ جلدی میں ختم ہوتا محسوس ہوا۔ حبیبہ عمر کو مبارکباد پہنچا دیجیے گا۔ بہت خوب حبیبہ! نگہت غفار کا ناولٹ پلکوں... اچھا تھا لیکن اپنی مذہبی اقدار کی بھرپور عکاسی کرنی چاہیے۔ ہیروئن طلاق کے بعد بغیر عدت گزارے اپنی شادی شدہ دوست کے گھر چلی جاتی ہے۔ یہ ہر مصنف کی ذمے داری ہے کہ ہم اپنے مذہبی و معاشرتی خدوخال کی بھرپور عکاسی کریں باقی نگہت غفار بحیثیت مصنف ہمیشہ کی طرح اپنے زور قلم کا جادو جگاتی ہیں سو ناولٹ اپنی جگہ بہت عمدہ تھا۔

افسانوں میں عقیلہ حق کا 'محبت فاتح عالم' حاجرہ ریحان کا ایک قدم دونوں بہترین تھے عمران مظہر کا بوزون مختلف موضوع کے ساتھ بہت جاندار تھا۔ افسانی رنگ لیے ہمارے معاشرے کے مذاق کا نشانہ بننے والی اس تیسری شخصیت کی مختلف انداز میں عکاسی کر کے سوچ کا ایک نیا در وا کر دیا۔ بہت اچھے عمران۔ حمیرا فضا کا افسانہ آئینہ میں ایک... بہت پیاری تحریر تھی اور اختتام بھی بہت خوبصورت انداز میں کیا۔ بہت اچھے حمیرا۔ نیئر شفقت کا ایک خط عائشہ نور کا مجبوری کے دھاگے فرحی نعیمہ کا گرداب اور مریم شہزاد کا مان اپنے اصلاحی رنگ سموئے تحریروں کے ساتھ اچھی رہیں لیکن افسانوی رنگ ذرا دھیما نظر آیا مگر کچن کارنر اپنی ریسپیز کے ساتھ سرفہرست رہا۔

یہ تو ہوا تبصرہ مکمل۔ منزہ دعا ہے کہ کل تک پوسٹ بھی ہو جائے۔ اگر تحریر و تبصرے میں کوئی تقصیر ہوئی ہو تو پیشگی معافی نامہ قبول کر لیجیے۔ اب کا تبصرہ کچھ تنقیدی رنگ لیے ہے لیکن آپ جیسے پیارے مدیروں کا تو حوصلہ ہی بڑھے گا نا...

بہت ساری دعاؤں اور محبتوں کے ساتھ دوشیزہ اور مدیر اعلیٰ دوشیزہ سے اجازت چاہوں گی۔ اللہ دونوں اور دونوں سے مربوط لوگوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور روز افزوں ترقی عطا فرمائے آمین۔

○ پیاری خولہ وعدہ نبھانے کا شکریہ... اداریہ بہت دل سے لکھا تھا آپ کو اچھا لگا یعنی محنت وصول ہوئی۔ خولہ وہ کہتے ہیں نا کہ میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے پر اللہ کو پہچانا تو جناب Box تیار تھا نہ جانے کیسے رہ گیا اور میں مطمئن بھی تھی کہ میں نے مظہر صاحب کو جو میری محنت کو بٹر پیپر پر سجاتے ہیں دے دیا ہے...... مجھے یقین ہے کہ دوشیزہ گلستان پڑھ کر جو آنسو بہے ان کے بعد آنکھوں کو بہت آرام ہوگا... خط ہمیشہ کی طرح جامع اور تبصرہ جاندار تھا... یقیناً مصنفین آپ کا خود شکریہ ادا کرنا چاہیں گے... خوش رہیے۔

▤ نسرین اختر نینا، لاہور سے لکھتی ہیں۔ ڈیئر منزہ السلام علیکم! یقیناً آپ سب بخیریت ہوں گے۔ منزہ ایک انتہائی دلخراش خبر یہ ہے کہ ہمارے والد محترم چوہدری بشیر احمد صاحب مختصر علالت کے بعد انتقال فرما گئے امی کے بعد وہی ہمارا اس دنیا میں سب سے بڑا سہارا تھے وہ ہمیں چھوڑ گئے پلیز منزہ ان کی مغفرت کے لیے دعا کیجیے۔

ابو کے انتقال (یہ لفظ لکھتے ہوئے دل کانپ رہا ہے) کے بعد میری کتاب ''سپنے سہانے'' چھپ کر آئی ہے۔ انہیں اس کی اشاعت کا کتنا انتظار تھا بار بار پوچھتے تھے کہ ''کب آئے گی تمہاری کتاب؟'' کیا پتا تھا کہ انہیں پڑھنا بھی نصیب نہیں ہوگی۔ دوسرے ناول کی پہلی قسط بھی اپنی بیماری کی وجہ سے نہیں پڑھ سکے۔ آج ہم جو کچھ بھی ہیں ابو کی محنت کوشش اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہی ہیں۔ ایسے عظیم والدین ملنا خوش قسمتی ہے مگر ان کا چلے جانا زندگی میں ایک ایسا خلا چھوڑ جاتا ہے جو کبھی پر نہیں ہو سکتا اچھا اب اجازت۔ والسلام!

○ پیاری نسرین! اللہ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ والدین بہت بڑی دولت ہیں انسان کتنا محفوظ محسوس کرتا ہے چاہنے والے والدین بوڑھے ہوں اور بچے جوان تب بھی لگتا ہے جیسے تناور درخت، مضبوط چھت سر پر ایستادہ ہے... ماں باپ کا اولاد سے رشتہ دنیا کا سب سے حسین اور خالص رشتہ ہے... ہم سب آپ کے اس دکھ میں آپ کے ساتھ ہیں۔ خط موصول ہونے کے بعد کئی بار آپ سے رابطے کی کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی... امید کرتی ہوں جلد آپ سے فون پر بات ہو سکے گی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مسز نگہت غفار کراچی سے لکھتی ہیں۔ پیاری منزہ جی، السلام علیکم! جیتی رہو۔ سلامت رہو، شاد آباد رہو (آمین ثمہ آمین) پیاری منزہ آج ہی ''دوشیزہ'' موصول ہوا۔ ٹائٹل اچھا لگا اور بہت زیادہ اچھا جو لگا وہ اپنے افسانے کی اشاعت یقین کرو بیٹا دل کی گہرائیوں سے تمہارے لیے دعائیں نکلیں اللہ سے امید ہے کہ انشا اللہ ضرور قبول ہوں گی۔ ''ہاں میں پاکستانی ہوں'' ایک پر اثر تحریر تھی۔ ''محبت فاتح عالم'' عقیلہ حق کی تحریر بہت اچھی لگی بہت ہی خوبصورت اینڈ کہانی کی جان تھا۔ ''گرداب'' فرحی نعیم حقیقت سے قریب کہانی اچھی لگی۔ ''مان'' مریم شہزاد نے ٹھیک ہی لکھا ہے رشتوں میں اس قسم کی چھوٹی موٹی باتیں طول پکڑ لیتی ہیں۔ حمیرا فضا نے بھی آئینے میں ایک اور پچھتاوا اچھا لکھا۔ خولہ عرفان کی ''محبت جاگ جائے گی'' ایک سبق تھا۔ ''مجبوری کے دھاگے'' بھی اچھی تحریر تھی۔ ''دوشیزہ گلستان'' میں کس بات پر شکر کروں، بے مثال، سکھ، ٹھوکر، سائل، زندگی کیا ہے؟ عجیب لوگ، غریب خانہ، عشق، جلترنگ، چپ ٹوٹکے، مائیگرین کا علاج، یہ تحریریں اچھی تھیں۔ ارے بھئی منزہ ''تیر نیم کش'' اور ''نئے لہجے نئی آوازیں'' ایسا ہی کچھ عنوان تھا دونوں کیوں بند کر دیے؟ منزہ بیٹا دوبارہ شروع کر دیں نا میں ایک نظم بھیج رہی ہوں۔ افسانہ بھی بھیج رہی ہوں امید ہے کہ ہمیشہ کی طرح جلد شائع ہو جائے گا۔ اجازت چاہنے سے پہلے دلی دعا ہے کہ رب کائنات اپنی مہربانیاں اور عنایتیں آپ پر برسائے۔ ہمارے ملک پاکستان کی حفاظت کرے۔ ہمیں آفات اور بلاؤں سے محفوظ رکھے (آمین ثمہ آمین)

پیاری منزہ آپ پر، آپ کی فیملی پر، دوشیزہ اور اس کی فیملی پر اللہ تعالیٰ کا کرم اور رحمتوں کا حصار رہے۔ اللہ نگہبان و مددگار حامی و ناصر۔

○ بہت اچھی سی نگہت آنٹی۔ دوشیزہ پسند کرنے کا بہت شکریہ یقین کیجیے جب میرے رائٹرز اور ریڈرز مفصل تبصرہ کرتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے... چلیے آپ کے کہنے پر نئے لہجے نئی آوازیں پھر سے شروع کر رہے ہیں ایک نئے عنوان کے ساتھ... خوش!

فصیحہ آصف خان، ملتان سے لکھتی ہیں ڈیئر منزہ صاحبہ، سلامتی، خیر، السلام علیکم! مزاج اچھے ہوں گے اور ہر طرح سے خیریت ہوگی۔ ہمارے مزاج بھی اب موسم کے مرہون منت ہیں۔ سخت گرمیوں کا موسم جھیل کر اب بہتری کی طرف گامزن ہیں اور قلم بھی چلنے کی قدرت پکڑ رہا ہے۔ ورنہ پچھلے تین ماہ تو بہت کڑے گزرے ہم پر جی ستمبر کا پاکیزہ سرورق پسند آیا۔ سرورق واقعی ایسا ہونا چاہیے جو مشرقیت کا علمبردار ہو گھر والوں کو بھی دکھاتے ہوئے فخر محسوس ہو نہ کہ شرمندگی۔ اشتہارات کے صفحے الٹنے کے بعد ''ہاں میں پاکستانی ہوں'' پر قدم رک گئے۔ بات صرف عقل و شعور کی ہے، مگر نہیں حکمرانوں (سابق) کے نزدیک تو پیسہ ہی اہم ہے۔ ایسے پسماندہ خیالات والے حکمران ملک کو کبھی ترقی یافتہ نہیں بنا سکتے۔ ہاں اپنی جیبوں اور تجوریوں کو ضرور ترقی یافتہ بنا چکے ہیں۔ یہ کیسی جمہوریت ہے کہ کوئی جھگی نشین تو کوئی محلوں کا مکیں...... تاریخ کے جھروکوں سے جھانکتی بصیرت افروز تحریر حضرت عمار بن یاسرؓ کے بارے میں، تفصیلی تحریر ذہن کے دریچے کھول گئی۔ اور یہ سب پڑھنا ہم پر واجب ہے کہ ان کے نقش قدم پر چل سکیں۔ ڈاکٹر رُتھ فاؤ پر مضمون اگر ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو کیا بات تھی پتا نہیں ہمیں مرنے کے بعد ان کی خوبیاں یاد آتی ہیں۔ بہر حال وہ لائق تحسین ہیں۔ اب ہم آئے دوشیزہ کی محفل میں جہاں خوش رو چہرے مسکراہٹ لیے عقل و دانش کے خزانے لٹا رہے تھے۔ محبت کے ڈونگرے برسا رہے تھے۔ جن میں فرحت صدیقی صبیحہ شاہ، غزالہ رشید، روحیلہ خان، سنبل سب بہترین لکھاری ایک جگہ یکجا ہوئے تو محفل کا حُسن دوبالا ہو گیا۔ ہمیشہ کی طرح باریک بینی سے پڑھ کر تبصرہ کرن والی مائی ڈیئر خولہ عرفان پوری تمکنت سے براجمان تھیں۔ لاجواب تبصرہ کیا۔ زمر نعیم بھی پیچھے نہ رہیں شعر بھی خوب کہا۔ صبا نور... فائزہ مشتاق اور عقیلہ حق صاحبہ نے واقعی حق ادا کیا۔

افسانوں کی دنیا بھی خوبصورتی سے آباد تھی۔ فرحی نعیم کا ''گرداب'' رلا گیا۔ اچھے مستقبل کی آس میں زندگی ہی ہار گئی۔ جس طرح سکون اپنے گھر میں ملتا ہے اسی طرح جو آرام اپنے ملک میں ہے وہ دیس پرائے میں کہاں۔ ''مان'' ٹوٹا تو دل ٹوٹنا لازم تھا۔ ندرت کا یہ تجربہ بھی ناکام گیا۔ ''مرد رے مرد تیری کون سی کل سیدھی'' عقیلہ حق کی محبتوں سے گندھی تحریر ''محبت فاتح عالم'' دوستاروں کے زمین پر ملن کی لازوال داستان ٹھہری۔ سچی محبت کرنے والے آخر کار مل ہی جایا کرتے ہیں۔ ''زیست کی کٹھنائیاں'' دعاؤں سے ٹل جاتی ہیں۔ خولہ عرفان کا ''محبت جاگ جائے تو'' کو اس میں محبتوں کے سارے رنگ شامل تھے۔ خولہ نے ایک گھریلو عورت کی کتھا خوب بیان کی۔ یہاں پر میں یہ ضرور کہوں گی کہ عورت کو بھی اپنی مرضی سے جینے کا اختیار دینا چاہیے۔ مرد کو اس کے محسوسات اور حالات کی نزاکت کو جانتے ہوئے سمجھوتہ کرنا چاہیے۔ اب ہر وقت عورت (وہ بھی ادھیڑ عمری میں) دلہن بن کے تو ہر وقت سجی سنوری نہیں رہ سکتی۔ مگر منیر صاحب جیسے رومانٹک شوہر کو کون عقل دے۔ خیر کہانی مزے کی لگی۔ ''مجبوری کے دھاگے''۔ ''ایک خط'' ''چوزن ون'' اچھے اور مختصر افسانے رہے۔ ''ابھی امکان باقی ہے'' ٹھہرا ٹھہرا سا لگ رہا ہے۔ کہانی میں تیزی نہیں آرہی۔ زمرڈ ڈیئر ذرا ہاتھ تیز چلاؤ اور ہاں انعم کے لیے سبق آموز سزا تیار کرو۔ حاجرہ ریحان کا ایک قدم خوب رہا۔ جی اس ماہ کی سب سے کامیاب تحریر پلکوں پہ سجے جگنو۔ اگر ہے تو یہی ہے۔ باجی نگہت غفار کی تحریر پر حقیقت کا گمان ہو رہا ہے۔ اعتبار کریں تو کس پر۔ صد شکر کہ صنوبر کو منزل ملی ورنہ بھیڑیوں کے دیس میں بکری کہاں تک خود کو بچائے۔

باقی قسط وار کہانیاں پڑھ نہیں سکی۔ ایک ساتھ ہی پڑھوں گی تمام اقساط وقت ملنے پر (دعا کریں وقت دستیاب ہو جائے)

باقی تمام سلاسل اپنی جگہ لاجواب رہے۔ ایک عرض کرنی ہے کہ جس طرح مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کا احوال بتایا جاتا ہے اسی طرح ڈرامہ رائٹرز' پروڈیوسر، ٹی وی چینل کے اینکرز وغیرہ کا بھی احوال پڑھوائیے۔ نیوز ریڈرز کا بھی جنہیں ہم دیکھتے یا سنتے ہیں۔ سوان کے بارے میں جاننے کا جی کرتا ہے۔ اور جلد ہی لکھاری بہن بھائیوں کے تعارف مع تصویر کا سلسلہ بھی شروع کریں۔ انعامی سلسلہ اس کے علاوہ ہو۔ امید ہے توجہ دی جائے گی۔ تبصرہ کسی حد تک مکمل ہوا۔ اجازت مطلوب ہے والسلام و خدا حافظ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

○ ٹھیک کہا فصیحہ موسم کا بہت اثر ہوتا ہے مزاجوں پر کم از کم میرے تو بہت... آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر آپ کسی بھی شخصیت کا انٹرویو دوشیزہ کے صفحات پر دیکھنا چاہتی ہیں مجھے ارسال کریں میں ضرور شائع کروں گی اپنے شہر، قصبے یا گاؤں کی کوئی بھی پسندیدہ شخصیت دوشیزہ کے صفحات پر شائع کروانا اب آپ تمام پڑھنے والوں کے ہاتھ میں ہے... میں تمام پڑھنے والوں کو اس سلسلے میں شرکت کی دعوت دیتی ہوں...

مہ وش طالب، لاہور سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! منزہ کیا حال ہیں، امید کرتی ہوں خیریت سے ہوں گی اللہ ادارہ دوشیزہ کی دوشیزگیاں سدا قائم رکھے۔ آمین مجھے بھی افسوس ہے کہ کافی عرصے سے رابطہ نہیں ہو پایا خیر مجھے یقین ہے دیر آید درست آید۔

کہانیاں تو میرے پاس لکھی ہوئی ہیں مگر یونی کوڈ میں جبکہ پرل پبلی کیشنز کے ای میل ایڈمن ان پیج

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مانگتے ہیں لہٰذا بار بار بھیجتے بھیجتے رک جاتی ہوں۔ اب آپ ہی کوئی راہ سجھایئے۔ ڈاک کے ذریعے بھیجنا خطرے سے خالی نہیں۔ بہر حال میں دوبارہ کوشش کروں گی۔ منزہ آپی ایک اہم مسئلے کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گی ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ خود بھی اس کا سدباب کرنا چاہ رہی ہوں گی اور میں جانتی ہوں کمپوزنگ کا مسئلہ حل کرنا اتنا آسان نہیں مگر یقین جانیے اس کی وجہ سے آپ کی دن رات کی محنت سے سجایا گیا چاند سا دوشیزہ کہیں کہیں سے گرہن زدہ سا لگتا ہے۔ انتہائی معذرت کے ساتھ مگر آپ کی اور آپ کی ٹیم کی محنت رنگا رنگ دلچسپیوں، سلسلوں سے سجی پھر بھی جھلکتی نظر آ جاتی ہے۔ تبصرہ انشاء اللہ اگلی بار۔

○ بہت ہی سویٹ مہ وش تم نے جس طرح خط بھیجا ہے اسی طرح افسانے بھی بھیج دو۔ ورنہ مسودے کی فوٹو کاپی کروا کے مجھے مسودہ TCS بھی کرسکتی ہو یہ محفوظ طریقہ ہے۔ تم نے صحیح خامی کی طرف نشاندہی کی ہے۔ اصل میں کمپوزر صاحب نئے آئے ہیں انشاء اللہ اس پرچے میں تمہیں محسوس ہوگا کہ غلطیاں کم ہیں۔ بس اب فٹافٹ اپنی تحریر مجھے ارسال کردو۔

▤ فرحی نعیم، کراچی سے لکھتی ہیں۔ محترمہ مدیرہ صاحبہ السلام علیکم! امید ہے۔ صحت اور ایمان کی سلامتی کے ساتھ بخیریت ہوں گی آپ کی محبت اور چاہت مجھے پرچے کی صورت میں ہر ماہ مل رہی ہے۔ میری کہانی شائع کرکے آپ جس طرح میری حوصلہ افزائی کررہی ہیں اس کے لیے میں بہت مشکور ہوں۔ اس خط کے ساتھ بھی ایک افسانہ ''چھوٹی سی بات'' ارسال کررہی ہوں۔ آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا۔ دوشیزہ کی کہانیاں اپنے پلاٹ کے ساتھ بہت اچھی ہوتی ہیں۔ آپ کے لیے دعا گو

○ اچھی سی فرحی... دوشیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ... تمہارا افسانہ میرے پاس ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد شائع ہوگا۔

▤ طیبہ عنصر، پنڈی سے لکھتی ہیں۔ السلام علیکم! پیاری منزہ جی طبیعت بخیر دوشیزہ کی رنگا رنگ محفل میں حاضر خدمت ہوں بلاشبہ دوشیزہ کسی دوشیزہ کے جیسا ہی تر و تازہ اور حسین ہوتا ہے۔ ایک بار رسالہ کھول لیا پھر بے شک کھانا ٹھنڈا ہو یا چائے، یا کولڈ ڈرنک گرم ہو ہماری توجہ رسالے سے کہاں ہٹنے والی ہے، میاں جی کی گھوریاں بھی کام نہیں کرنے والی تو اب دوشیزہ کیسے ادھورا چھوڑ کر اٹھ جائیں تو دوشیزہ کی سیر کا احوال بھی بتاتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہم پاکستانی ہیں لکھنے پر بہت داد شاید کہ کسی ایک کے دل میں بھی یہ باتیں اتر رہی ہوں تو ووٹ کا استعمال باشعور قوم کی طرح سے کریں تو ہم پر بدعنوان لوگ مسلط نہیں ہوں۔

حضرت عمار بن یاسرؓ کے متعلق پڑھتے ہوئے روحانی مسرتوں سے آگاہی ہوئی کیا عزم تھا ان ہستیوں کا کہ بڑی تکالیف بھی ان کو راہ حق سے نہیں ہٹا سکیں اور ایک ہم ہیں جو جانے کن راستوں کے مسافر بنتے چلے جارہے ہیں۔

ڈاکٹر روتھ فاؤ کے لیے خراج تحسین دیکھ کر آنکھیں اب تک نم ہیں میں نے بہت پہلے سے ان کی خدمات کے بارے میں پڑھا تھا اور دل عقیدت سے بھر گیا۔

دوشیزہ کی محفل کا اپنا ایک مزہ ہے میں ان تمام قارئین کا شکریہ ادا کروں گی جن سب نے میری تحریر ''ٹھنڈا چولہا'' پڑھی بھی اور سراہا بھی۔ سب کا اجتماعی شکریہ ادا کرتی ہوں، ادارے اور پیاری منزہ جی آپ کا کہ آپ نے پیارے ڈائجسٹ میں جگہ دی۔

نسرین اختر کا مسلسل ناول بہت اچھے انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے زاریہ پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی دیکھتے ہیں مصنفہ آگے کس طرح زاریہ کے دکھوں کے ازالے کا اہتمام کرتی ہیں۔

''گرداب'' واقعی ایک دلگداز تحریر ہمارے معاشرے میں یہ سب تو ہو رہا ہے بیرون ملک کے خواب دیکھتے لوگ سمجھتے ہیں ان کی مشکلات کا یہ واحد حل ہے اور کچھ غلط بھی نہیں کہ ملکی حالات ہی ایسے ہیں بہت اچھی تحریر کے لیے مبارکباد۔

مریم شہزاد کے افسانہ ''مان'' نے بھی مایوس نہیں کیا۔ معاشرے کی تنگ نظری پہ قلمبند سادہ تحریر بہت خوب اب بات کرتے ہیں اس تحریر کی جو دوشیزہ کے ماتھے کا جھومر بن گئی۔ ماشاء اللہ عقیلہ حق جی ہمیشہ خاص لکھنے والی پیاری مصنفہ کیا خوب لکھا کہ تحریر کے مناظر یوں نظر کے سامنے گھومتے رہے گویا کوئی ڈرامہ دیکھ رہے ہوں۔ عقیلہ جی اب لکھتی رہیے گا ہمیں آپ کی تحریر پڑھنے کا موقع مل سکے تو شاید ہم بھی کسی موقعہ پر چوکا لگا سکیں۔

ایک حساس موضوع پر لکھی ہوئی حمیرا کرن نعمان کی مختصر لیکن سبق آموز تحریر بہت متاثر کن تھی مبارکباد۔ فضا جی کی تحریر اس وقت کی ضرورت ہے کہ معاشرہ اسی روش کا شکار ہے اور ایسی کہانیاں آس پاس سانس لیتی نظر آتی ہیں ویلڈن حمیرا جی۔ خولہ عرفان کی بہت پختہ تحریر۔ موضوع اگرچہ پرانا ہے لیکن الگ انداز میں لکھی گئی تحریر بدصورت حقائق سے پردہ اٹھا رہی ہے اور یہ پردہ بار بار اٹھتا رہنا چاہیے۔ مرد ذات کو آل راؤنڈر بیوی چاہیے ہوتی ہے لیکن وہ عورت کو انسان کب سمجھے گا یہ سمجھ نہیں آرہی ہے۔ بچے جوان ہو جائیں تو بھی ان کے چونچلے ختم نہیں ہوتے۔ پیاری تحسین انصاری بہت اچھا لکھ رہی ہیں ماشاء اللہ۔

مجبوری کے دھاگے، ایک خط، چوزن ون، بھی بہترین انگوٹھی میں نگینے جیسے فٹ۔ زمر نعیم جی نے بہت ہی بہترین ناول لکھا اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا مسز نگہت جی نے بہت چابکدستی سے ایک عمدہ ناولٹ لکھا پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ جیبہ عمر جی بہت مبارک ہو بہت ہی شاندار طریقے سے تحریر کا آخری حصہ لکھا آخری قسط میں عموماً کہانیاں مایوس کرتی ہیں لیکن آپ نے بہت بہترین لکھا۔

دوشیزہ گلستان ہو یا چٹ پٹی خبریں یا کچن کارنر اجی ہم نے تو ہر جگہ حاضری لگائی۔ سب پڑھا کہ چھوڑا جا ہی نہیں سکتا تھا۔ کارنرز بھی بہت خوب رہے۔ اچھی شاعر بھی میسر آئی یہ واقعی بہت شاندار اور جاندار ہے۔ ایک بہت ہی طویل تبصرے کے بعد امید واثق ہے آپ اس کو ڈائجسٹ میں شاید شامل نہیں کر پائیں گی لیکن پیاری منزہ امید پر دنیا قائم ہے، سلامت رہیں۔ اللہ حافظ

○ طیبہ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اتنے زبردست تبصرے کے بغیر میں محفل جانے دوں گی۔ یہ تو لکھاریوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ تبصرہ شاندار اور بروقت ہے۔ امید کرتی ہوں کہ آئندہ بھی محفل میں اپنی شرکت کو یقینی بنائیں گی... دوشیزہ کی پسندیدگی کا دل سے شکریہ

▤ رضوانہ کوثر، لاہور سے لکھتی ہیں پیاری منزہ، اللہ آپ سب کو اور دوشیزہ سے وابستہ ہر فرد کو ایمان، صحت اور سکون سے رکھے۔ آمین۔ ناصر بھائی کی واپسی! خوش آمدید۔ کافی وقفے کے بعد اب خط لکھ رہی ہوں وہ بھی کسی تفصیلی تبصرے کے بغیر۔ وجہ طبیعت کی خرابی، زیادہ تر ریسٹ کرتی ہوں۔ دونوں شمارے باقاعدگی سے مل رہے ہیں اس کے لیے آپ اور ادارے کی مشکور ہوں۔ طبیعت کی خرابی پڑھنے میں تو رکاوٹ نہیں ہوتی مگر لکھنے میں ضرور ہو جاتی ہے دونوں رسالے بہت خوبصورتی سے سفر طے کررہے ہیں۔ اللہ انہیں اور ساتھیوں کو اسی طرح ہمیشہ رواں دواں رکھے۔ نئے اور پرانے ساتھیوں کے سنگ سنگ زادراہ کا سلسلہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بہترین، معلومات اور ایمان افروز ہے۔غزالہ عزیز اس کے لیے آپ قابل تحسین ہو۔ بہ وساطت دوشیزہ اشتہارات والی کمپنیوں کے نام پیغام کہ خدا کے لیے اشیاء کے معیار بھی بلند کرو۔منزہ کے اداریے باکمال۔ محفل میں جڑے نگینوں کی آب وتاب دل کوروشن کرتی ہے۔افسانے معیاری اور سلسلے وار ناول بھی اچھے خاصے جارہے ہیں۔اگلی اقساط کا انتظار رہتا ہے۔فائزہ مشتاق، صانور محفل میں خوش آمدید۔ڈاکٹر رتھ فاؤ کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا اور اچھا لگا۔دوشیزہ گلستان کی سب کلیاں اور پھول خوشبو دار تھے۔چٹ پٹی خبریں بھی گرما گرم اور حقیقت سے بھرپور۔باقی سب سلسلے بھی جاندار ہیں۔شائستہ عزیز محفل کے لیے وقت نکالا تو تحریر کے لیے بھی نکالو۔فرح اسلم قریشی آپ کہاں ہو۔غزالہ رشید سے التماس ہے کہ اپنی تحریروں سے رونق بخشیں۔نسیم نیازی اور فصیحہ آصف کہاں غائب ہیں آپ (دوشیزہ سے مجھ سے نہیں) آپ سب کی محبتیں اور احساس تو میرا اثاثہ ہے۔دانیال بیٹا آپ کو 16 اکتوبر میری دلی دعاؤں کے ساتھ ساتھ سالگرہ مبارک ہو۔زین کے لیے بھی دعائیں۔اب اجازت اس شعر کے ساتھ:

بہتر ہے نہ ڈالو ستاروں پہ کمندیں
انساں کی خبر لو وہ دم توڑ رہا ہے

○ دل خوش کر دیا رضوانہ آپ نے۔تو اتنے لمبے وقفے کی آپ کو بالکل اجازت نہیں ہے۔جلدی جلدی محفل میں شرکت کیا کریں... اللہ آپ کو صحت وتندرستی دے۔اسی طرح ہم سب کو ایک دوسرے کے بارے میں پتہ چلتا ہے ورنہ اس افراتفری کے دور میں شاید کوئی کسی کو نہ پوچھے... اتوار والے دن محفل کے خطوط پڑھ رہی تھی تو دانیال کو بلا کر آپ کی مبارکباد والی لائن دکھائی وہ بہت حیران ہوا اور خوش بھی۔اس لیے میرے ساتھ لاہور آنے کی ہامی بھر لی ہے ورنہ وہ اس کی وکالت یا پھر فٹ بال... میں تو بچھڑے پنچھیوں کو آوازیں دیتی ہی رہتی ہوں۔آپ بھی آواز دے کر دیکھیے۔تین چار دن کے لیے لاہور آنے کا ارادہ ہے انشاءاللہ آپ سے ضرور ملاقات ہوگی۔

فریدہ فری، لاہور سے لکھتی ہیں سوئیٹ منزہ جی، السلام علیکم!ستمبر کا دوشیزہ ملا تبصرہ پتہ نہیں تاخیر سے بھیج رہی ہوں کیونکہ بیحد بیمار تھی اب ذرا ٹھیک ہوں۔موسم بدل رہا ہے اور ہم بھی بدل رہے ہیں۔نگہت غفار کا ناولٹ تو سب سے پہلے پڑھا۔واہ کیا ناولٹ لے کر آئی ہیں۔پلکوں پہ سجے جگنو' پڑھ کر تو مزہ آ گیا۔ افسانے ''محبت فاتح عالم'' عقیلہ حق کا تو نام ہی کافی ہے۔حمیرا فضا کا آئینے میں پچھتاوا' مجبوری کے دھاگے، ایک خط، چوزن ون، اور ایک قدم ایک سے بڑھ کر ایک دوشیزہ کے افسانے اور ناولٹ تو بیحد اچھے اور معیاری ہوتے ہیں۔خولہ عرفان کیا ناولٹ لے کر آئیں خولہ جی دل خوش کر دیا سب کو میری طرف سے دعا اور سلام۔اور آپ کو صرف یہی کہ:

جب تم یاد آتی ہو بہت ہی یاد آتی ہو

اگلے ماہ کے لیے خدا حافظ۔

○ اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے... تبصرہ بر وقت تھا اس لیے محفل میں شامل ہے... آپ کی تعریف مصنفین تک پہنچ گئی ہے۔تعریفی کلمات ہی ہوتے ہیں جو نئے لکھنے والوں کو حوصلہ دیتے ہیں۔لاہور کا موسم تو اب خنکی کی طرف جانے والا ہے کم از کم شامیں تو ضرور ٹھنڈی ہو جائیں گی ہم کراچی والے سردیاں انشاءاللہ اس بار جلدی انجوائے کریں گے ایسا دل چاہ رہا ہے۔اپنا بہت خیال رکھیے گا اور خوبصورت مصرع میں یاد کرنے کا شکریہ!

آسیہ مظہر چوہدری، آزاد کشمیر سے لکھتی ہیں پیاری منزہ آپی اور دوشیزہ کی بہنوں کو میری طرف سے السلام علیکم!

مجھے کچھ کہنا ہے

میرا طویل ناول آپ کے ہاتھوں میں ہے جسے آپ دوشیزہ کی زینت بنتا دیکھ سکیں گے۔میں اپنے اسی ناول کے متعلق آپ سے چند باتیں شیئر کرنا چاہوں گی۔ہر لکھاری کی تحریر اس کے لیے اولاد کا درجہ رکھتی ہے جسے وہ بڑی محبت سے پروان چڑھاتا ہے۔میری یہ تحریر بھی ایک ایسی تحریر ہے جسے میں نے آپ کے لیے بڑی محبت سے لکھا ہے۔

کہانی کیا ہے یہ تو آپ پڑھ کر ہی جان سکیں گے لیکن میں ایک بات بتاتی چلوں اس کہانی کا ہر کردار، اس معاشرے کے کرداروں سے جڑا ہوا ہے۔معاشرے کی اکائیاں، محبت، نفرت، جنون، انا پسندی جیسی کئی معاشرتی اکائیاں ان کرداروں کے ساتھ چلتی جائیں گی۔اس کا ہر کردار ان اکائیوں میں ڈھالا گیا ہے۔

کہانی رشتوں کی ہے رشتے سے جڑے احساسات کی ہے اور اس کہانی کا 'مین کردار' محبت ہے۔وہ محبت جو اپنے تک محدود رہے تو ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اس محبت میں اس کے حقدار اور آ جائیں تو انا اور خود غرضی کی بلند دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔کیونکہ ہمارے معاشرے میں محبت میں وسعت پیدا کرنے والے بہت کم لوگ ہیں۔کہانی کیا ہے اب آپ نے بوجھنی ہے، نتیجہ کیا ہے اور اس میں چھپا سبق کیا ہے!یہ آپ نے اخذ کرنا ہے۔بوجھنا بتانا میں سب آپ پر چھوڑتی ہوں کیونکہ میں آپ سب کو اپنے سے بہتر قاری پاتی ہوں۔

چلیے آئیں شہر وفا میں قدم رکھتے ہیں... اور اس کے آئینوں میں اپنا عکس تلاش کرتے ہیں:

اس شہر وفا کے آئینوں میں
اپنا عکس ڈھونڈا تو تمہیں پایا

○ سوئیٹ آسیہ تمہاری تحریر دوشیزہ میں شامل ہے۔حسب وعدہ اب تعریف اور تنقید دونوں کے لیے تیار رہنا... سینئر مصنفین کی رائے بہت قیمتی ہوتی ہے... سونے سے بھی زیادہ کیونکہ اس رائے کی مدد سے نئے لکھاری صفحہ پر ہیرے موتی بکھیرنے کے قابل ہو جاتے ہیں.. تمہارا مکمل ناول دو حصوں میں شائع ہوگا اور اگلے ناول کی بھی مکمل اقساط مجھے ارسال کر دو میں پڑھ کر بتا دوں گی۔

فرح اسلم قریشی۔کراچی سے لکھتی ہیں۔ڈیئر منزہ، السلام علیکم!مثل چراغ لوگوں کا مقدر چاہے کتنا ہی تاریک کیوں نہ ہو مگر یہ کتنی اعزاز کی بات ہے کہ وہ دوسروں کی زندگیوں میں روشنی بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔لوگوں کی راہ سے ایک ایک کانٹا چن لینے کے باوجود اپنے گھونسلے کے لیے تنکے جمع نہیں کرتے ہمارے آباء نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے اور چلے گئے' وجودوں کی ہجرتیں ہوئیں۔غموں نے ہجرت نہ کی، سسکتی ہوئی کتنی زندگیاں اس ارضِ پاک سے کوئی خراج وصول کیے بغیر روانہ ہو گئیں ... ان کی کہانیاں پرانی اور تذکرے بوسیدہ سمجھے جانے لگے مگر ان کی عظمتوں کے مینار آج بھی سر بہ فلک نظر آتے ہیں۔ ''ہاں میں پاکستانی ہوں۔'' نے ایسی کتنی ہی عظیم ہستیوں کی یاد تازہ کرادی اس کے لیے ''جزاک اللہ۔''

اس ماہ کا رسالہ......افسانہ نمبر زیادہ لگا۔پورے نو افسانے۔بہت سے نام نئے تھے، یا شاید میری ہی کوتاہ نظری ہے، خیر جن جن کی تحریر اچھی لگی ان کے ناموں پر بھی غور کیا اور پچھلی تحریریں یاد کرنے کی کوشش بھی کی جب کچھ یاد نہ آیا تو انہیں نئی آمد سمجھ لیا گیا (معذرت)۔

سب سے پہلے بات ہوگی ''حمیرا فضا'' کے افسانے آئینے میں ایک......'' جو کہ ایک بہترین افسانہ لگا، وجہ پختہ انداز بیاں' روانی اور تسلسل.... کہانی میں کہیں جھول نہ تھا اور اختتام بھی زبردست ویلڈن حمیرا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

عمران اظہر، پورن وون کے ساتھ پسندیدگی کی فہرست میں شامل رہے۔ تیسری صنف کو صرف تفریح طبع کا ذریعہ سمجھنے والوں کے لیے اس کہانی میں ایک مثبت سبق پوشیدہ تھا۔ بری چیز کو برا تو سب کہتے ہیں مگر ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔'' پر عمل کرنے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔ اپنی عقیلہ حق حسب معمول آئیں اور چھا گئیں گو کہ موضوع اتنا پرانا تھا کہ عقیلہ سے شکایت پر حق بجانب ہوں مگر دوران مطالعہ سلیقہ تحریر نے باندھے رکھا۔ اس بات کے لیے عقیلہ تعریف کی مستحق ہیں۔ زیست کی کٹھنائیاں کرن لقمان نے اچھی لکھی امید ہے وہ مزید بہتری لائیں گی مجبوری کے دھاگے عائشہ نور نے افسانے میں مجبوری کو واضح نہیں کیا۔ صرف ماں کی خوشی، بہن کی مسکراہٹ کے لیے کوئی اپنی زندگی کو اس طرح داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ جبکہ انجام بھی بالکل واضح ہو کہ ایک شخص شادی کے بعد دوسری شادی کر کے چھوڑ سکتا ہے۔ ایک خط نیر شفقت ایک معتبر نام جن کے کریڈٹ پر بہت سی یادگار تحریریں ہیں ایک اچھا افسانہ بصورتِ خط لے کر آئیں لیکن افسانے میں سوائے خوبصورت جملوں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ باقی افسانہ نگاروں سے معذرت کہ وقت کی کمی کے باعث رسالہ پورا نہ پڑھ سکی۔ ناولٹ میں بھی صرف خولہ عرفان کا ناولٹ پڑھ سکی جو اس لحاظ سے اچھا لگا کہ خولہ کی قلم پر گرفت مضبوط ہے تاہم موضوع اتنا پرانا کہ اب اس پر لکھی گئی نئی کہانی بھی نئی نہیں لگتی۔ باقی سلسلوں کی ورق گردانی نہ ہو سکی جس کے لیے معذرت... اگر کسی تبصرے میں کوئی بات بری لگی ہو تو بیحد معذرت کی طلبگار ہوں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم تنقید سے تحقیق اور پھر تکنیک کی طرف جاتے ہیں۔ اجازت فقط والسلام!

○ پیاری سی فرح! خط اور افسانہ بھیجنے کا شکریہ! میرا نہیں خیال کہ لکھاری تنقید برداشت نہیں کرتے مثبت تنقید کی بدولت انسان اپنی تحریر کو مزید پختہ کرتا ہے ہاں بے جا تنقید ضرور دکھ دیتی ہے۔ مگر الحمد للہ میرے تمام مصنفین انتہائی پڑھے لکھے دور اندیش ہیں وہ کبھی بھی کسی کی دل آزاری کا سبب نہیں بنیں گے یہ میرا یقین ہے... افسانہ مل گیا جلد شامل اشاعت ہوگا۔ ادارہ پسند کرنے کا شکریہ!

▤ **محمد بلال فیاض ملتان** سے لکھتے ہیں۔ ڈیئر منزہ آپی السلام علیکم! سب سے پہلے آپ کی اور آپ کی ٹیم کی سلامتی کے لیے دعائیں امید کرتا ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ میرے ناولٹ زینی اور زینب کی اشاعت کا بے حد شکریہ۔ آپ کا اور قارئین دوشیزہ کا بھی بہت مشکور ہوں کہ انہوں نے ناولٹ کو پسندیدگی سے نوازا اور ناولٹ ایوارڈ کے لیے منتخب ہوا۔

آپی تین ماہ کے وقفے کے بعد مجھے ماہ ستمبر کا دوشیزہ ملا مگر مجھے آپ سے گلا نہیں شکوہ یہ ہے کہ مجھے اپنی دو تحریروں (افسانہ توازن اور ناولٹ زینی اور زینب) کا اعزازیہ تا حال موصول نہیں ہوا۔ مجھے انتظار ہے امید کرتا ہوں کہ آپ میری شکایت دور فرما کر شکریہ کا موقع دیں گی۔

ڈیئر منزہ آپی۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے میرے شکوے کا برا نہیں مانا ہوگا کیونکہ شکوے شکایت اپنوں سے کیے جاتے ہیں۔ اب اجازت دیں آئندہ تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ دعا گو اور دعاؤں کا طالب۔

○ بلال جب دوشیزہ موصول نہ ہو تو فوراً مطلع کیا کرو۔ کیونکہ ہم تو بھیج رہے ہوتے ہیں... اعزازیہ انشاء اللہ آئندہ چند دنوں میں مل جائے گا۔

نوٹ: امّ ایمان قاضی، حنا اصغر اور عائشہ نور کے خطوط تاخیر سے ملنے کے باعث شاملِ محفل نہ ہو سکے۔

دعاؤں کی طالب
منزہ سہام

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میٹ دا ایڈیٹرز

وومن ایڈیٹرز اور پبلشرز کی گورنر سندھ جناب محمد زبیر کے ساتھ CPNE کے تحت سیمینار کے موقع پر ایک گروپ...... منزہ سہام دائیں سے پہلی

رضوانہ پرنس کا نیا شاہکار ناول

اک نئے موڑ پر شائع ہو گیا ہے

محبت کے خوبصورت احساس میں جب شک اور بدگمانی کی آگ بھڑک اٹھے تو سب کچھ جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔
ایسے ہی ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کی یہ کہانی آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی اور اس کا اینڈ آپ کو ششدر کر دے گا۔

قیمت صرف 350 روپے

ناول ملنے کے پتے: (ویلکم بک پورٹ، مین اردو بازار کراچی) (فرید پبلشرز مین اردو بازار کراچی)
(اشرف بک ایجنسی اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی) (خزینہ علم و ادب الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور)
(علم و عرفان پبلشرز الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور) (علی میاں پبلیکیشنز عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نیا سلسلہ وار ناول

تنہائی کا زہر

قسط 3

ایک ایسی مضبوط لڑکی کی داستان جو زندگی سے لڑ کر جیتنا چاہتی تھی۔
الجھنوں کو سلجھنوں میں تبدیل کرتی خوش رنگ تحریر

سلیم کو سر عدنان کے دوست کے اسٹور میں اسسٹنٹ سیلز مین کی جاب مل گئی تھی۔ اس کی جاب صبح نو بجے سے شام کو پانچ بجے تک تھی۔ تنخواہ بھی مناسب تھی، سلیم نے سوچا کہ وہ عرصے تک پیسے جمع کر کے شام کو کسی ٹیکنیکل ادارے میں داخلہ لے لے گا تاکہ اپنا انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کا مقصد حاصل کرلے۔ لیکن اس سے پہلے بہت سے مسائل تھے جو حل طلب تھے، اوّلین ضرورت تو اپنی علیحدہ رہائش کا بندوبست کرنا تھا کیونکہ ارسلان کے آنے کے بعد وہ اس کے گھر میں نہیں رہ سکتے تھے اب اگرچہ سلیم بھی سارا دن مصروف رہتا تھا مگر اس کے باوجود نرجس شام کو گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ نہیں بٹاتی تھی اس کا ایک ہی بہانہ تھا کہ اس کی پڑھائی بہت سخت ہے اس لیے وہ گھر کا کام کاج نہیں کرسکتی پھر کچھ دنوں بعد اس نے شام کو ایک پرائیویٹ ہاسپٹل میں نرس کی حیثیت سے جاب کرلی اور اس طرح رات گئے گھر واپس آتی تھی سلیم نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا پھر ایک دن اس نے اعلان کردیا۔

''سلیم میں پڑھائی ترک کررہی ہوں۔ ایک تو میڈیکل کی تعلیم مہنگی بہت ہے پھر مشکل بھی ہے میرے لیے ملازمت کے ساتھ ساتھ پڑھائی کرنا تقریباً ناممکن ہے یوں بھی میری عمر تیس سال کے لگ بھگ ہورہی ہے سب مجھے سمجھاتے ہیں کہ جب تم ایک تربیت یافتہ نرس بن چکی ہو تو پھر تمہیں کیا ضرورت ہے میڈیکل کی پڑھائی کے چکروں میں پڑنے کی۔ آرام سے ملازمت کرو اور فارغ اوقات میں لائف انجوائے کرو۔''

''او کے ایز یو وِش۔'' سلیم نے لاتعلقی سے کہا اور پھر چائے کے جھوٹے برتن اٹھا کر کچن کی جانب چل دیا۔ کئی ماہ سے نرجس اور اس کے درمیان برائے نام سا ہی تعلق رہ گیا تھا، دونوں مل کر شام کی چائے پیتے پھر نرجس اپنی جاب پر چلی جاتی اور ارسلان گھومنے پھرنے کے لیے نکل جاتا۔ کبھی ڈنر باہر ہی کرلیتا کبھی گھر آکر کچھ بنا کر کھالیتا نرجس کے لیے بھی کچھ بنا کر فریج میں رکھ دیتا۔ وہ خود ہی آکر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مائیکرو ویو اوون میں گرم کر کے کھالیتی ارسلان کھانے کے بعد کچھ دیر ٹی وی دیکھتا اور پھر سونے کے لیے بیڈروم میں چلا جاتا۔

پھر ایک دن یہ برائے نام رشتہ بھی ختم ہوگیا جب نرجس نے اس سے طلاق کا مطالبہ کرنا شروع کردیا۔

''سلیم مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ میں اور تم ساتھ نہیں چل سکتے۔''

سلیم پہلے ہی اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا چنانچہ اسے طلاق دے کر اپنے ساتھ اسٹور میں کام کرنے والے ایک دوست کے فلیٹ میں منتقل ہوگیا اس کے فلیٹ میں دو بیڈ روم تھے۔ اس نے ایک فلپائنی لڑکی سے شادی کر رکھی تھی جو ایک دفتر میں ٹائپسٹ تھی۔ گلوریا ایک ہنس مکھ اور محنتی لڑکی تھی دفتر کی جاب کے ساتھ ساتھ گھر کے کام کاج بھی شوق سے کرتی تھی۔ یہاں تک کہ سلیم کے لیے بھی ناشتہ اور رات کا کھانا بنا دیتی تھی سلیم اس سے بہت متاثر تھا اس سے اکثر مذاق سے کہتا بھابھی میرے لیے بھی اپنی جیسے کوئی لڑکی تلاش کردیں کب تک اکیلا اور بے گھر رہوں گا اس پہ گلوریا جس کا اسلامی نام ماریہ تھا مسکرا کر چپ ہوجاتی مگر اس کا شوہر یعنی سلیم کا دوست ریحان فوراً کہتا ''ہاں ہاں ماریہ ڈارلنگ تم اس کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھو بے چارے کو دو شادیوں کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔''

''نہیں ریحان یار میں اب شادی وادی کے چکر میں نہیں پڑنے والا میری قسمت میں بیوی اور گھر کا سکھ شاید لکھا نہیں ہے'' سلیم ایک سرد آہ بھر کر کہتا۔

''نہیں یار مایوسی کی باتیں نہیں کرتے ساری دنیا کی لڑکیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں تمہارے نصیب اور مرضی کی لڑکی بھی تمہیں مل ہی جائے گی۔''

''ہاں، ہاں سلیم بھائی تم فکر نا ہیں کرنے کا۔ میں ہوں نا میری بہت فرینڈز ہیں میں کسی سے بات کروں گی۔ ڈونٹ وری۔'' ماریہ ٹوٹی پھوٹی اردو اور انگلش میں سلیم سے کہتی۔

ٹھیک ہے بھابھی دیکھ لیں اگر آپ کوئی مناسب خاتون مل جائے مگر کوئی مخلص سلجھی ہوئی لڑکی ہو اب میں نے گھر بسانا ہے۔ تنگ آ گیا ہوں روز روز کی شادیوں اور طلاقوں سے۔''

سلیم ماریہ اور ریحان کے ساتھ اکثر اس موضوع پر بات تو کرلیتا تھا مگر اسے کوئی خاص امید نہیں تھی کہ اب کوئی لڑکی اسے جیون ساتھی بنانا پسند کرے گی۔ پہلی شادی اس کی دو سال تک رہی۔ دوسری تقریباً ایک سال اور اب اگلی پتہ نہیں ہوتی بھی ہے کہ نہیں وہ یہی سوچتا رہتا مگر اس کی حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب ماریہ نے اپنی ایک پاکستانی کولیگ سے اس کی ملاقات کرادی۔

نتاشا کی داستان بھی خاصی دکھی کردینے والی تھی اس کے والدین نے بغیر کسی چھان بین کے اس کا لندن میں مقیم نوجوان فرحان سے ٹیلی فون پر نکاح کروادیا۔ رشتہ کروانے والے شخص نے جو ایک میرج بیورو چلاتا تھا بتایا تھا کہ فرحان لندن میں اپنا کاروبار کرتا ہے اس کا ذاتی اسٹور ہے اس کے والدین حیات نہیں ہیں اور یہ کہ وہ اکلوتا ہے۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے نتاشا کے والدین خوش ہوگئے کہ چلو اکیلا لڑکا ملا ہے ان کی بیٹی خوش رہے گی۔ فون پر نکاح کے چند ماہ بعد فرحان پاکستان گیا اور چند دور کے رشتہ داروں کے ہمراہ نتاشا کو رخصت کر کے لے آیا مگر لندن آ کر نتاشا کو علم ہوا کہ فرحان نہ صرف شادی شدہ ہے بلکہ چار بچوں کا باپ بھی ہے چونکہ اس کی بیوی مستقل بیمار رہتی تھی اس لیے اس کی نگہداشت بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج کے لیے اس نے نتاشا سے شادی کا

ڈرامہ رچایا۔ چند ماہ بعد ہی عدالت کی مدد سے نتاشا نے فرحان سے علیحدگی اختیار کرلی۔ جب ماریہ نے اسے سلیم کے بارے میں بتایا تو انجیلا اور ماریہ کے مشورے سے اس نے اپنے والدین کو باخبر کرنے کا فیصلہ کرلیا اس نے ایک طویل خط اپنے والد کے نام تحریر کیا اور تمام حالات بلاکم و کاست بیان کردیے پھر ایک مختصر سا خط ماریہ کے شوہر ریحان نے اس کے والد کو تحریر کیا جس میں سلیم کے بارے میں تمام تفصیل لکھ کر ان سے سلیم کے لیے نتاشا کا رشتہ طلب کیا جب تک نتاشا کو اپنے والد کا جوابی خط موصول نہیں ہوگیا اس کی جان سولی پر لٹکی رہی طرح طرح کے خدشات اور وہم اس کے ذہن کو اپنے نوکیلے پنجوں میں جکڑے رہیں وہ عالم تصور میں دیکھتی کہ اس کا خط پڑھ کر اس کے والدین دکھ اور صدمے کی کیفیت سے سکتے میں آگئے ہیں۔ کبھی اسے خیال آتا کہ والد انتہائی غضب ناک حالت میں ماں پر برس رہے ہیں اور اسے برا بھلا کہہ رہے ہیں کہ اس کی رشتے کے سلسلے میں جلد بازی کی وجہ سے ان کی بیٹی کو ان حالات کا سامنا کرنا پڑا کبھی اسے محسوس ہوتا کہ وہ فرحان کے سسرال والوں سے جا کر لڑ جھگڑ رہے ہیں کہ انہوں نے اسے دھوکے میں کیوں رکھا اور اپنے داماد کی پہلی شادی کے بارے میں انہیں کیوں باخبر نہیں کیا غرضیکہ الٹے سیدھے خیالات ہر وقت اس کے دل و دماغ کو گھیرے رہتے۔ بالآخر خدا خدا کر کے ایک دن والد کا خط آ ہی گیا انہوں نے اسے دلاسہ دیا تھا اس کی ہمت اور جرات کو سراہا تھا کہ کس طرح اس نے حالات کا مقابلہ کیا اور پھر کس طرح ان دھوکے باز لوگوں سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنا مقام بنایا اس پر انہوں نے جہاں اس کی اعلیٰ تربیت اور پرورش اور تعلیم پر فخر کا اظہار کیا تھا ساتھ ساتھ یہ بھی گلہ کیا تھا کہ اس نے فوراً ہی کیوں نہیں اصل حالات سے آگاہ کردیا۔ ریحان کو انہوں نے الگ سے خط لکھ کر اس کا اور اس کی بیوی کا شکریہ ادا کیا جو انہوں نے پردیس میں ان کی بے یارومددگار بیٹی کو سہارا دیا تھا اور ساتھ ہی ریحان اور ماریہ کو اختیار دے دیا کہ اگر وہ سلیم کو نتاشا کے لیے مناسب سمجھتے ہیں تو اس نیک کام میں دیر نہ کریں اور ان دونوں کا نکاح کروادیں۔

والد کا خط پا کر نتاشا دوبارہ سے جی اٹھی تھی اس نے فوراً فون کر کے ابو اور امی کا شکریہ ادا کیا تھا۔

شکریہ کی کوئی بات نہیں میری جان سے زیادہ عزیز بیٹی تم نے ایک اجنبی ملک میں عزت اور وقار سے اپنا مقام بنا کر ہمارا سر فخر سے بلند کردیا ہے نیک اور سعادت مند اولاد ایسی ہی ہوتی ہے یہ ٹھیک ہے کہ میں تم لوگوں کے لیے دولت کے انبار اکٹھے نہیں کرسکا لیکن مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کیا۔ ابو نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

امی نے بھی ایسی ہی جذبات باتیں کی تھیں باقی بہن بھائی بھی خوش ہوئے اور پھر اتنے دنوں بعد نتاشا کا ذہن پرسکون اور ہلکا پھلکا ہوگیا تھا پھر چند ہی دنوں بعد ایک سادہ سی تقریب میں نتاشا اور سلیم کا نکاح ہوگیا اور وہ ماریہ اور ریحان کے قریب ہی ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوگئے۔ نتاشا کو پا کر سلیم خوش تھا وہ ایک مہذب، ملنسار اور خدمت گزار بیوی ثابت ہوئی تھی بالکل زاریہ کی طرح ٹوٹ کر چاہنے والی اور خیال رکھنے والی تھی اس نے سلیم کے گھر کو صحیح معنوں میں جنت کا نمونہ بنا دیا تھا دونوں پورے ہفتے اپنے اپنے کام کی جگہوں میں مصروف رہتے اور ویک اینڈ پر ماریہ ریحان اور انجیلا اور سر عدنان کی فیملی کے ساتھ سیر و سیاحت کا پروگرام بنا لیتے۔ کبھی کسی ایک گھر میں جمع ہو کر ون ڈش پارٹی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کر لیتے اس طرح پردیس میں رہ کر بھی اپنے ملک جیسا ماحول بنالیا کرتے۔ انجیلا کی بھی اپنے ساتھ کام کرنے والے ایک فلپائنی لڑکے سے شادی ہوچکی تھی اس طرح ان کا گروپ اور زیادہ بڑا ہوگیا تھا اور وہ لوگ مل جل کر بہت اچھا وقت گزار رہے تھے شادی کے ایک سال بعد سلیم اور نتاشا کو اللہ تعالیٰ نے ایک بہت ہی خوبصورت بیٹے سے نوازا جس کا نام انہوں نے وامق سلیم رکھا۔ دو سال بعد ایک اور بیٹا واثق پیدا ہوا اور پھر تین سال بعد ایک لڑکی پیدا ہوئی اور سلیم کی خواہش پر اس نے اور نتاشا نے اس کا نام زاریہ رکھا پھر کچھ عرصے بعد دونوں پاکستان آئے تو نتاشا کے والدین اپنی بیٹی کو خوش دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سمائے اس کے پھول سے پیارے پیارے بچوں کو پیار کرتے نہ تھکتے تھے اللہ نے ان کی جان سے زیادہ پیاری بیٹی کو اتنے دکھوں کے بعد خوشیوں کی لازوال دولت سے نوازا تھا اگرچہ سلیم نتاشا کے ساتھ بہت مطمئن اور خوش زندگی بھر کر رہا تھا مگر جب اپنی بیٹی زاریہ کو دیکھتا تو اسے وہ بوٹے قد کی کم گو مگر بے حد چاہنے والی سانولی سلونی سی زاریہ یاد آ جاتی تو اس کے اندر کچھ چھن سے ٹوٹ جاتا اور وہ پہروں بے چین سا رہتا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ زاریہ کی زندگی تباہ کرنے والا وہی تھا اگرچہ اسے اپنے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ اس نے جو برتاؤ زاریہ کے ساتھ کیا تھا وہی برتاؤ نرجس نے اس کے ساتھ کیا۔ اس نے بھی اسے اپنے مطلب کے لیے استعمال کیا تھا جیسے سلیم نے زاریہ کو۔ زاریہ کے ساتھ تو پھر بھی طوعاً و کرہاً سلیم نے دو سال بتا دیے تھے مگر نرجس نے بمشکل ایک برس ہی اس کے ساتھ بسر کیا تھا اور اب کسی عمر رسیدہ انگریز ڈاکٹر سے شادی کر کے عیش کر رہی تھی۔ اس کی زندگی کا نصب العین پیسہ تھا جو اسے مل گیا تھا۔

☆......☆

سلیم جب بھی بچوں کے ہمراہ پاکستان آتا تو اسے یہاں کا ماحول دیکھ کر شدید الجھن ہوتی وہ اپنے بچوں کو پاکستان کی تہذیب اور روایات سے متعارف کروانے کی غرض سے ہر چار پانچ سال بعد پاکستان کا چکر لگاتا تھا مگر مایوس ہو کر کچھ ہی دنوں بعد واپس لوٹ جاتا۔ ہر بار جب بھی وہ پاکستان آتا اس کا بہت دل چاہتا کہ وہ زاریہ سے ملے اور اس سے معافی مانگے مگر اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اس کی بہن عابدہ چوہدری نے اسے بتایا تھا کہ زاریہ نے دوبارہ شادی نہیں کی اور اپنے بھائی کی بیٹی کو پال رہی تھی۔ اس پر سلیم کو اور بھی دکھ ہوا تھا مگر اپنے کیے پر سوائے کف افسوس ملنے کے وہ اور کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا وہ تیسری شادی کر کے اپنی بیوی اور تین بچوں جن میں دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی کے ساتھ پرسکون اور پرآسائش زندگی بسر کر رہا تھا اگرچہ اپنی خواہش کے مطابق وہ انجینئر نہیں بن سکا تھا مگر لندن میں برسوں کی محنت کے بعد اس نے اپنا ایک اسٹور بنالیا تھا جس میں وہ اور نتاشا اکٹھے کام کرتے تھے اپنا ذاتی مکان بھی خرید لیا تھا غرضیکہ ہر طرح سے خوشحال زندگی تھی ان لوگوں کی۔

☆......☆

فیروزہ جلیل کا بھائی ارشاد علی نیویارک میں جس ہوٹل میں کام کرتا تھا اس میں ایک تیس بتیس سالہ بنگلہ دیشی خاتون شبنم بھی ڈش واشنگ کا کام کرتی تھی۔ بوٹے سے قد کی سانولی سلونی شبنم دس سال پہلے بائیس سال کی عمر میں اپنے خاندان کی غربت دور کرنے کے لیے پہلے ایک ایجنسی کے ذریعے پاکستان پہنچی اور ایجنٹ نے اسے ڈیفنس میں ایک کوٹھی میں کام دلوادیا پھر پانچ سال بعد وہ خاندان پاکستان میں اپنا کاروبار ختم کر کے امریکہ منتقل ہوگیا تو شبنم بھی ان کے ساتھ امریکہ آ گئی۔ کچھ عرصے اس خاندان کے گھر میں کام کرتی رہی پھر آہستہ آہستہ امریکہ کے ماحول اور قوانین سے آگاہ ہوئی تو اس خاندان کے پاس کم تنخواہ اور زیادہ کام کو ترک کر کے ادھر ادھر کام کرنے لگی۔ وہاں اس کے ہم وطن ایک خاندان نے اپنے پاس اسے پناہ دے دی پھر اسے ایک ہوٹل میں مستقل جاب مل گئی۔ امریکہ کا گرین کارڈ حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے ہی ملک کے رہنے والے ایک ٹیکسی ڈرائیور شکور احمد سے شادی کر لی شکور احمد کے اپنے ملک میں بیوی بچے تھے کچھ عرصے بعد وہ بنگلہ دیش واپس چلا گیا اور شبنم کو طلاق نامہ تھما گیا۔ اس دوران ان کے دو بچے بھی پیدا ہو چکے تھے مگر اب اسے کوئی پرواہ نہیں تھی شکور سے طلاق کی وجہ سے نہ صرف اسے اس کا فلیٹ مل گیا تھا بلکہ اس کی دو ٹیکسیاں بھی شکور نے اس کے دونوں بچوں چار سالہ رشیدہ اور دو سالہ منیب الرحمٰن کے نام کر دی تھیں۔ شکور نے بیس سالوں میں امریکہ کے قیام کے دوران اتنا پیسہ کما لیا تھا کہ اس کے لیے ایک فلیٹ اور دو ٹیکسیوں کی قربانی معمولی بات تھی ارشاد علی کو یہ چپ چاپ اپنے کام سے کام رکھنے والی خاتون بہت اچھی لگی۔ پھر اس کے حالات جان کر اسے اور بھی ہمدردی محسوس ہوئی پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ امریکی شہری تھی اور مستقل ملازمت کے علاوہ فلیٹ کی مالک بھی۔ ارشاد علی کے لیے اس میں بہت کشش تھی دوسری طرف شبنم کو بھی اپنے بچوں کے لیے سرپرست کی ضرورت تھی پھر ٹیکسیوں کے لیے کوئی مناسب ڈرائیور بھی نہیں مل رہے تھے اگرچہ اب شبنم نے اپنے پورے خاندان کو یہاں بلالیا تھا مگر اس کے دونوں چھوٹے بھائی پڑھ رہے تھے تین بہنیں تھیں ان کے شوہر ایک اسٹور چلاتے تھے بہنوں کی شادیاں بھی شبنم نے یہیں کروائی تھیں اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا جبکہ باپ بوڑھا اور بیمار تھا اس لیے وہی یہاں نہیں آیا تھا وہ وہاں بڑے بیٹے کے ساتھ رہ رہا تھا۔ جس کی ہول سیل کی دکان تھی شبنم بھی انہیں رقم بھیجتی رہتی تھی شبنم کو ارشاد علی ہر لحاظ سے مناسب لگا۔ پھر اس نے اپنی بہنوں اور بھائیوں کے مشورے سے ارشاد علی سے شادی کر لی اور یوں ارشاد علی ہوٹل سے شبنم کے فلیٹ میں آ گئے۔ کئی سالوں بعد اسے گھر کی چھت اور بیوی کے ہاتھ کا کھانا میسر آیا ورنہ تو پچھلے تین سالوں سے بے چارہ بڑی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہا تھا اس نے شبنم کے بچوں کو باپ کی شفقت اور محبت دی تو وہ اور بھی اس کی ممنون ہوگئی ارشاد علی نے ہوٹل کی ملازمت ترک کر کے ایک ٹیکسی خود چلانی شروع کر دی اور دوسری فروخت کر کے اور کچھ شبنم اور کچھ اپنے پاس موجود جمع جتھا اکٹھا کر کے پارٹنر شپ پر ایک چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا جس میں پاکستانی، انڈین اور بنگلہ دیشی کھانے پکائے جاتے کچھ ہی عرصے میں ہوٹل پاکستانیوں انڈینز اور بنگلہ دیشیوں میں بہت پاپولر ہوگیا ارشاد علی نے دوسری ٹیکسی بھی فروخت کر دی اور پوری توجہ ہوٹل کو دینے لگا شبنم نے بھی ہوٹل کی ملازمت چھوڑ کر اپنے ہوٹل میں کام شروع کر دیا سات آٹھ سال کی بھرپور محنت کی بدولت ہوٹل خوب چل نکلا اور ارشاد علی اور شبنم پیسے میں کھیلنے لگے شبنم کے دونوں بچے اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے تھے اس دوران ارشاد علی نے پاکستان میں موجود اپنے بیوی بچوں کو بھی فراموش نہیں کیا تھا وہ باقاعدہ نگہت کو وافر رقم بھیجتا تھا جسے وہ اللوں تللوں میں اڑا دیتی تھی ارشاد علی جانتا تھا کہ وہ نہ اپنے بچوں کی صحیح نگہداشت و تربیت کر سکتی ہے نہ ہی انہیں ڈھنگ کی تعلیم دلانے کی صلاحیت رکھتی ہے اسے اس بات

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کا شعور تھا نہ ہی پرواہ ۔ وہ صرف اپنی ذات کے حصار میں مقید تھی اس لیے ارشاد علی نے اپنی بہن فیروزہ جلیل کی منت سماجت کی کہ اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری قبول کرے نگہت اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی نہ رہے دونوں ایک مکان لے کر بے شک الگ الگ پورشن میں رہیں۔ نگہت چاہے تو اپنے والدین کو بھی ساتھ رکھ لے پہلے تو نگہت نے صاف انکار کر دیا مگر جب ارشاد علی نے دھمکی دی کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے پاس امریکہ بلوا لے گا اور نگہت کو طلاق دے دے گا تو طوعاً و کرہاً وہ مان گئی اس دوران فیروزہ جلیل بھی ملازمت سے ریٹائر ہو چکی تھیں کچھ رقم انہیں ریٹائرمنٹ پر ملی پھر کچھ رقم پنشن سے ملی تھی ۔ ارشاد علی نے بھی پیسے بھیجے جس سے اسلام آباد میں ایک درمیانے علاقے میں پانچ مرلے کا ایک ڈبل اسٹوری مکان خرید لیا۔ نیچے نگہت اپنے بچوں اور والدین کے ساتھ رہنے لگی جبکہ اوپر کے حصے میں فیروزہ جلیل مقیم ہو گئیں فیروزہ جلیل نے ہی بھاگ دوڑ کر کے اپنے اثر رسوخ کو استعمال کر کے چاروں بچوں کو ایک کلاس پیچھے کروا کر ماڈل اسکولوں میں داخلہ دلوا دیا ۔ بچے بنیادی طور پر ذہین تھے اچھے اسکولوں میں داخلہ ملا اور ساتھ ہی فیروزہ جلیل کی توجہ اور دیکھ بھال ملی تو پڑھائی میں بہتر ہو گئے۔ پھر جب دس سال بعد ارشاد علی دو ماہ کے لیے شبنم اور اپنے دونوں بچوں کے ہمراہ پاکستان آیا تو وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ اس کا بڑا بیٹا سکندر میڈیکل کالج میں پہنچ چکا تھا اور اس سے چھوٹا عاطف بی سی ایس کر رہا تھا جبکہ دونوں لڑکیاں بڑی عروہ بی اے چھوٹی ثمرہ ایف اے میں تھی ارشاد علی نے اسلام آباد کے پوش سیکٹر میں ایک کنال کا مکان خرید لیا اس کے تین پورشن تھے ۔ بیسمنٹ کرائے پر چڑھا دیا گراؤنڈ فلور میں نگہت اور اس کے والدین مقیم تھے جبکہ اوپر کے پورشن میں فیروزہ جلیل اور چاروں بچے۔ بچے اب ماں کی بجائے فیروزہ جلیل کے پاس ہی رہتے اب نگہت کا بھی پہلے جیسا گھمنڈ اور طنطنہ ختم ہو چکا تھا اور فیروز جلیل کے ساتھ تعلقات اچھے کر لیے تھے جانتی تھی کہ اس کے بچوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت فیروزہ جلیل کی محنت کا ہی نتیجہ ہے اس لیے اب اس کی بے حد عزت کرنے لگی تھی ارشاد علی کی دوسری شادی کی خبر ملنے پر شروع میں واویلا کیا تھا مگر جب ارشاد علی نے فون کر کے اسے سمجھایا کہ یہ ساری خوشحالی شبنم کی بدولت ہی ہے تو پھر وہ خاموش ہو گئی تھی ویسے بھی شبنم کون سا اس کے ساتھ رہتی تھی۔

فیروزہ جلیل گھر کے کام کاج اور بچوں کی تعلیم پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ زیادہ تر وقت عبادت ہی میں گزارتی تھی ان کی دیکھا دیکھی بچے بھی نماز روزے کے پابند ہو گئے تھے روز قرآن پاک کی باقاعدہ تلاوت کرنے لگے تھے اب فیروزہ جلیل کی ایک ہی تمنا تھی کہ کسی طرح نور سے دوبارہ مل سکیں وہ اسے بھول نہیں پائی تھیں اس کی صورت ہر وقت ان کی نگاہوں میں پھرتی رہتی تھی۔ نور نے بھی اسلام آباد میں ہی ایک میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا تھا جس میں ارشاد علی کا بڑا بیٹا سکندر علی زیر تعلیم تھا سکندر علی نور سے دو سال سینئر تھا فیروزہ جلیل نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ نور اور سکندر کی شادی ہر ممکن طریقے سے کروائیں گی ۔ اگرچہ نور اسلام آباد میں آ چکی تھی مگر وہ ہاسٹل میں رہتی تھی اور فیروزہ جلیل سے ملنے بھی نہیں آتی تھی کیونکہ عابدہ چوہدری نے اسے فیروزہ کی طرف سے بری طرح بدگمان کر دیا تا مگر فیروزہ جلیل کو یقین تھا کہ ایک دن ضرور آئے گا جب نور کے دل میں ان کی سوئی ہوئی محبت جاگ اٹھے گی وہ بے چینی سے اس وقت کی منتظر تھیں۔

☆......☆

زاریہ کا اب اس دنیا میں ماں اور دونوں بھائی ہی جینے کا سہارا تھے اور وہ ان سب سے بیحد محبت کرتی تھی ۔ شادی کا تلخ تجربہ ہونے کے بعد اس نے اب ماں اور بھائی کو معاف کر دیا تھا کہ اس کے نصیب میں ہی ازدواجی زندگی کی خوشیاں نہیں اس لیے اب وہ دوبارہ اسے کس آزمائش میں نہ ڈالیں ۔ پھر جب ذیشان کے ہاں تیسری بیٹی پیدا ہوئی تو اس نے اپنی یہ بچی زاریہ کی گود میں ڈال دی اور وہ پھول سی بچی پا کر پھر سے جی اٹھی اور وہ اسے جینے کا ایک نیا آسرا مل گیا وہ اس احسان پر بھائی بھابی کا شکریہ ادا کرتے نہ تھکتی تھی ۔ اب اس نے عہد کر لیا تھا کہ وہ شہروز اور سحرش کی پرورش اور تربیت کے ساتھ ساتھ دونوں کو اعلیٰ تعلیم دلائے گی چونکہ یہ گھر پرانا اور تنگ تھا ۔ پھر علاقہ بھی بہت پسماندہ تھا اس لیے زاریہ نے ایک قدرے بہتر اور صاف ستھرے علاقے میں گھر کرائے پر لے لیا ۔ کام کاج کے لیے ایک ملازمہ رکھ لی تھی کیونکہ اس کا کالج جانے اور شہروز کے اسکول جانے کے بعد امی گھر میں اکیلی رہ جاتی تھیں ۔ اور وہ اکیلی سحرش کے چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں کر سکتی تھیں ۔ ملازمہ صبح نو بجے آ جاتی اور زاریہ کے دو بجے کالج سے آنے کے بعد جاتی تھی ۔ اس طرح اسے گھر کی طرف سے اتنی فکر نہیں ہوتی تھی کالج جانے آنے کے لیے گھر کے قریب ہی بس یا وین مل جاتی تھی جو سیدھی کالج کے قریب جاتی تھی ۔ شہروز بھی وین پر اسکول چلا جاتا ۔ زاریہ نے سوچا تھا کہ جب پہلی موٹر سائیکل کی قسطیں ادا ہو جائیں گی تو وہ شہروز کو قسطوں پر نئی موٹر سائیکل لے دے گی۔

اب چونکہ زاریہ پر ماں اور دو بچوں کی ذمے داری بھی تھی اس لیے وہ بڑی ہمت اور حوصلے سے گھر اور جاب کی ذمے داریاں نبھا رہی تھی کچھ عرصے بعد ذیشان نے پرانا مکان بیچ دیا ۔ اور اس میں سے زاریہ کا اور ماں کا حصہ دے کر خود ایک اچھے علاقے میں پلاٹ خرید لیا اور آفس سے قرضہ لے کر گھر بنا لیا ۔ زاریہ نے بھی ان پیسوں سے اپنے کرائے کے گھر کے قریب ہی ایک پلاٹ لے لیا اور پھر کئی سال کی جمع پونجی سے گھر کی تعمیر کا آغاز کر دیا ۔ کالج سے بھی اسے گھر بنانے کے لیے لون مل گیا تھا جس سے اس نے خوبصورت سا ڈبل اسٹوری گھر بنا لیا ۔ اوپر والا پورشن کرائے پر اٹھا دیا اس طرح قرضے کی قسطیں کٹوانے کے لیے جو پیسے تنخواہ سے کٹتے تھے ان کی کمی پوری ہو گئی اب زندگی میں خاصا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

زاریہ نے تو جیسے اپنی ذات کو فراموش کر دیا تھا اس نے جو ذمے داریاں اٹھائی تھیں انہیں بحسن و خوبی نبھا رہی تھی ۔ سحرش کو وہ اپنی حقیقی بیٹی کی طرح ہی چاہتی تھی۔

شہروز نے ایم بی اے کے بعد ایک پرائیویٹ بینک میں جاب شروع کر دی ۔ اب سحرش بھی مڈل کلاس پاس کر چکی تھی ۔ جیسے ہی شہروز نے ایم بی اے کیا تب ہی سے امی کی خواہش کی تھی کہ اس کی شادی کر دی جائے ۔ اس طرح ایک تو وہ گھر میں اکیلی نہ رہتیں اس کی بیوی ان کے پاس رہتی اور اس طرح زاریہ اور سحرش اطمینان سے اپنی جاب اور پڑھائی جاری رکھ سکتیں ۔ دوسرے وہ چاہتی تھیں کہ اپنی زندگی میں ہی شہروز کے بیوی بچے دیکھ لیں ۔ ماں کی خواہش کے احترام میں زاریہ نے شہروز کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دیں شہروز کے والدین نے اگرچہ اسے مکمل طور سے زاریہ کے والدین کے حوالے کر دیا تھا اور اس سے زیادہ تعلق اور واسطہ نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

رکھا تھا کبھی کبھار اس سے ملنے آجاتے یا پھر شہروز زاریہ کی اجازت سے والدین اور بھائیوں بہنوں سے ملنے چلا جاتا مگر اس کا دل وہاں نہیں لگتا تھا کیونکہ جو توجہ اور اہمیت اسے یہاں ملتی تھی والدین کے گھر میں نہیں ملتی تھی۔ ایک تو وہ کم عمری میں ان سے الگ ہوگیا تھا پھر پانچ چھ بہن بھائی اور بھی تھے اور والد کی معمولی آمدنی میں بمشکل ان کا گزارا ہوتا تھا ان کے برعکس شہروز یہاں اچھی اور خوشحال زندگی بسر کررہا تھا اسے کسی چیز کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ اپنا گھر زاریہ کے گھر کو ہی سمجھتا تھا کہ یہاں اسے اتنی اپنائیت اور خلوص اور اہمیت ملتی تھی پھر جیسی تعلیم اسے زاریہ نے دلوائی تھی ویسی اس کے والدین اسے دلانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے اس کے سارے بھائی میٹرک یا ایف اے کرکے چھوٹی موٹی نوکریاں کررہے تھے یا پھر باہر جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے بہنوں کی بھی میٹرک کے فوراً بعد شادیاں ہوگئی تھیں بسنت روڈ پر چھوٹا سا تین مرلے کا ڈربہ نما گھر تھا جہاں وہ یہ اتنے زیادہ افراد بمشکل رہ رہے تھے ابا کی چھوٹی سی کریانے کی دکان تھی جس سے اتنی ہی آمدنی ہوتی تھی کہ بمشکل گھر کے اخراجات پورے ہوسکیں۔ اس طرح اپنے گھر والوں کے مقابلے میں شہروز خاصی شاہانہ زندگی بسر کررہا تھا۔ اس کے بہن بھائی اسے رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ کاش زاریہ باجی کی نگاہ انتخاب ان میں سے کسی پر بھی پڑجاتی یا پھر وہ سب کو اپنے گھر لے جاتیں تاکہ اس غربت اور افلاس زدہ زندگی سے چھٹکارا مل جاتا۔ اب جبکہ شہروز کمانے لگا تھا اور وہ اکثر اپنے والدین سے بھی ملنے چلا جاتا تھا اور ان کی کچھ نہ کچھ مدد بھی کردیتا تھا کیونکہ زاریہ نے یا عامرہ بیگم نے کبھی بھی اس سے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیا کماتا ہے؟ اور کہاں خرچ کرتا ہے؟ اپنی خوشی سے وہ خود ہی ہر ماہ کچھ رقم عامرہ بیگم کو دے دیتا تھا اور وہ اس لیے لے لیتی تھیں کہ اس کی شادی کے لیے جمع کرسکیں ورنہ تو گھر کے اخراجات زاریہ کی تنخواہ سے بخوبی پورے ہورہے تھے کھانے پینے اور دیگر اخراجات کے علاوہ صرف سحرش کی پڑھائی کا ہی خرچ تھا جو اتنا زیادہ نہیں تھا کہ بوجھ محسوس ہو۔

اب جبکہ زاریہ نے شہروز کی شادی کا فیصلہ کرلیا تھا تو پھر عامرہ بیگم نے یہ مناسب سمجھا کہ شہروز کے حقیقی والدین سے بھی مشورہ کرلیا جائے چنانچہ وہ ایک دن خود ہی اپنی بہن کے گھر شہروز کے ساتھ چلی گئیں اور جب انہوں نے بتایا کہ وہ شہروز کی شادی کرنا چاہتی ہیں تو شہروز کی والدہ انیقہ خاتون اور اس کے والد علیم احمد نے اس پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور انہوں نے دبے دبے لفظوں میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو ان کے بڑے بھائی کی بیٹی راحیلہ کو دیکھ لیں اس پر عامرہ بیگم نے کہا تھا کہ وہ زاریہ سے مشورہ کرکے ہی بتاسکتی ہیں پھر جب انہوں نے گھر آکر زاریہ سے راحیلہ کے بارے میں شہروز کے والد کی خواہش کا ذکر کیا تو اس نے صاف کہہ دیا۔

’’نہیں امی ہم علیم انکل کے خاندان میں شہروز کا رشتہ نہیں کریں گے شہروز کی تائی اماں بہت تیز طرار عورت ہیں بیٹیاں بھی ماں جیسی ہی ہوں گی۔ وہ آپ نے دیکھا نہیں کہ راحیلہ کی بڑی بہن شرمین بھابی کے چھوٹے بھائی سے بیاہی ہوئی ہے اور شرمین بتاتی ہے کہ اس نے شادی کے چند ماہ بعد ہی لڑ جھگڑ کر شوہر کو الگ گھر لینے پر مجبور کردیا تھا اور اب یہ حال ہے کہ شرمین کا بھائی ریحان ہفتوں میں ماں باپ سے ملنے آتا ہے نہ بھائیوں بہنوں کو پوچھتا ہے جو کماتا ہے بیوی بچوں اور سسرال والوں پر خرچ کردیتا ہے اور بھی عید بقر عید پر بھی بوڑھے ماں باپ کو نہ ملنے آتا ہے نہ ہی کچھ خرچ کے لیے دیتا ہے۔‘‘ زاریہ نے قدرے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

’’وہ تو ٹھیک ہے بیٹی مگر یہ تو دیکھو کہ تمہاری خالہ نے بچپن ہی میں محض تمہاری خواہش پہ کس طرح اپنا جگر کا ٹکڑا میری گود میں ڈال دیا تھا اور اب جبکہ وہ کمارہا ہے تب بھی کبھی انہوں نے اس پر اپنا حق نہیں جتایا۔ شہروز خود اپنی مرضی سے وہاں جائے تو جائے کبھی اسے مجبور نہیں کیا نہ ہی اس سے کسی قسم کا مالی مدد کی خواہش کی انہوں نے حالانکہ ان کے حالات کوئی خاص اچھے نہیں ہیں میں تو شہروز کو کہتی رہتی ہوں کہ اپنی ماں کو کچھ نہ کچھ رقم ہر ماہ ضرور دے دیا کرے تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ ان کا بیٹا اب کمانے لگا ہے۔ ان کے ہم پر اتنے احسانات ہیں کہ اگر ہم ان کی یہ خواہش پوری کردیں تو کچھ تو بدلہ چکانے کا موقع ملے گا۔ رہی بات کہ راحیلہ اپنی بہن کی طرح شہروز کو ہم سے جدا کرنے کی کوشش کرے گی تو میرا خیال ہے کہ شہروز اپنی بیوی کا اس قدر فرماں بردار نہیں ہوسکتا۔ نہ وہ شرمین کا بھائی تو ہے ہی سیدھا سادا اور زن مرید ٹائپ پھر اس نے روز ینہ سے پسند کی شادی کی ہے اس لیے اس کے پیچھے لگ گیا ہے باقی یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم کہیں باہر رشتہ طے کریں تو وہ لڑکی پتہ نہیں کیسے نکلے؟ راحیلہ کم از کم اپنے خاندان کی بچی ہے بی اے کرلیا ہے اس نے عمر بھی زیادہ نہیں سگھڑ اور سلیقہ شعار اور گھریلو کام کاج میں ماہر ہے والد اور بھائی بھی اچھے خاصے عہدوں پر ہی گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے اچھے علاقے میں اپنا گھر ہے خاندان بھی مختصر سا ہے دو بھائی اور دو ہی بہنیں ہیں سارے شادی شدہ اور اپنے اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ اب میرا تو خیال ہے کہ شہروز جیسے سعادت مند اور نیک بچے کے لیے راحیلہ ہی مناسب رہے گا آگے تمہاری مرضی‘‘ عامرہ بیگم نے اذان کی آواز سن کر سر پر دوپٹے کو درست کرتے ہوئے کہا اور پھر کچھ دیر کے لیے دونوں ماں بیٹی اذان کے احترام میں خاموش ہوگئیں۔ اذان کے بعد دعا وغیرہ مانگ کر بالآخر زاریہ نے کہا۔

’’امی اگر آپ نے راحیلہ کے لیے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو آپ کی مرضی آپ شہروز سے بھی پوچھ لیں تاکہ پھر بات آگے بڑھائی جائے یہ کہہ کر زاریہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆......☆

’’پاپا کافی عرصہ ہوگیا ہے ہمیں پاکستان گئے ہوئے۔ اب کب جائیں گے؟‘‘ سلیم کے بڑے بیٹے وامق نے کہا۔ وامق بے حد ذہین سمجھدار اور اسمارٹ لڑکا تھا۔ وہ حال ہی میں اولیول میں آیا تھا۔ سلیم خود تو اپنی انجینئر بننے کی خواہش پوری نہ کرسکا تھا مگر اس کی خواہش تھی کہ بڑے بیٹے کو انجینئرنگ کی تعلیم دلائے۔ وامق سے دو سال چھوٹا واسق ابھی اس سے دو سال چھوٹی کلاس میں تھا۔ وہ کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سب سے چھوٹی زاریہ ابھی ابتدائی کلاسز میں تھی اور وہ مستقبل میں ٹیچر بننا چاہتی تھی چونکہ انگلینڈ میں اساتذہ کو ایک باعزت اور اہم مقام حاصل ہے اس لیے ذہین اور محنتی بچے بڑے شوق سے استاد بنتے ہیں پاکستان کی طرح کہ کوئی بچہ ٹیچنگ کے پروفیشن کو اپنانا نہیں چاہتا اس پروفیشن میں لوگ مجبوراً ہی لوگ آتے ہیں جو اپنی مرضی سے کسی شعبے میں جانے میں کامیاب نہیں ہوتے جس ملک میں بی اے، ایم اے پاس پرائیویٹ اسکول ٹیچر کی تنخواہ گھروں میں کام کرنے والی ان پڑھ ماسیوں جتنی ہو وہاں کون ٹیچر بننا پسند کرے گا۔ ہر کوئی تو گورنمنٹ کے اسکولوں اور کالجوں میں ملازمت نہیں حاصل کرسکتا جہاں تنخواہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

قدرے بہتر اور کام کے اوقات بھی مناسب ہیں، ہمارے معاشرے میں جو توقیر اور مقام ایک ڈاکٹر انجینئر اور سول سروسز اور آرمی افسران کو حاصل ہے اساتذہ کو اس کا عشر عشیر بھی میسر نہیں نہ ان کا سروس اسٹرکچر بہتر ہے نہ ہی انہیں تنخواہ کے علاوہ اور کوئی سہولت ملتی ہے۔ سینئر ترین پروفیسر یا استاد بھی موٹر سائیکل کو اپنی سواری کے لیے استعمال کرتے ہیں یا پھر لوکل ٹرانسپورٹ میں دھکے کھاتے ہوئے اپنے کام کی جگہوں پر آتے ہیں اس قدر کم تنخواہ میں مناسب رہائش کا انتظام بھی نہیں کرسکتے کچھ ہی شہروں یا علاقوں میں گورنمنٹ کی طرف سے اساتذہ کو سرکاری رہائش گاہیں مہیا کی جاتی ہیں زیادہ تر کرائے کے مکانوں یا اپنے ذاتی چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہتے ہیں۔

مغربی اور ترقی یافتہ ممالک میں ایسا نہیں ہوتا وہاں انہیں بہترین تنخواہ کے ساتھ دیگر مراعات بھی حاصل ہوتی ہیں اس لیے جب زاریہ نے ٹیچر بننے کی خواہش ظاہر کی تو سلیم اور نتاشا نے بخوشی اسے اس کی اجازت دے دی۔ سلیم کے دل کے کسی گوشہ میں شاید یہ خواہش بھی تھی کہ اس کی بیٹی زاریہ کی طرح ٹیچنگ کا شعبہ اختیار کرے وہ تھی بھی زاریہ کی طرح ہی کم گو لیے دیے رہنے والی سانولی سلونی سی ۔سلیم کے دونوں بیٹے سلیم ہی کی طرح اونچے لمبے سرخ وسپید تھے۔ نتاشا اکثر ہنس کر کہتی تھی لڑکوں کو کیا ضرورت ہے اس قدر خوبصورت ہونے کی وہ تو جیسے بھی ہوں قابل قبول ہوتے ہیں لڑکیوں کو زیادہ خوبصورت ہونا چاہیے مگر ہماری بیٹی میرے جیسی ہی عام سی شکل وصورت کی ہے اپنے بھائیوں جیسی بالکل بھی نہیں۔“

”ایسا نہ کہو نتاشا میری بیٹی بہت پیاری ہے اس کی سانولی رنگت میں عجیب سی کشش اور ملاحت ہے“ سلیم عالم تصور میں زاریہ کے پرکشش چہرے کو تکتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں کہتا تو زاریہ بھاگ کر سلیم سے لپٹ جاتی اور نتاشا کو چڑاتے ہوئے کہتی۔

”ماما گندی، پاپا اچھے۔“ جواب میں سلیم اور نتاشا بے اختیار قہقہہ لگانے لگتے۔ دونوں بھائی بھی جب زاریہ کو کلو کہہ کر چھیڑتے تو وہ منہ بسورتی ہوئی فوراً سلیم سے شکایت کرنے پہنچ جاتی۔ چھوٹا والا بھائی واسق تو اکثر کہتا اصل میں زارا تمہیں پاپا نے ہماری ایک حبشی ملازمہ سے لیا تھا کیونکہ ہماری کوئی بہن نہیں تھی نا ہم نے سوچا کالی ہے تو کیا ہوا ہے تو بہن نا۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو واسق کے بچے میں ماما پاپا کی بیٹی ہوں۔ تمہیں انہوں نے کسی انگریز سے لیا تھا زاریہ چیخ کر غصے سے کہتی۔ البتہ وامق کے ساتھ اس کی بہت دوستی تھی۔ وہ اس سے پیار بھی بہت کرتا تھا اور اسے چھیڑتا بھی نہیں تھا۔ وہ بھی اس سے بہت مانوس تھی۔ واسق سے تو ہر وقت تو تو میں میں ہی ہوتی رہتی تھی غرضیکہ تینوں بہن بھائی آپس میں لڑتے بھی تھے مگر ایک دوسرے کے بغیر ایک پل بھی گزارا نہیں ہوتا تھا۔ سلیم اور نتاشا نے ان کی بالکل پاکستان کے طور طریقوں کے مطابق پرورش کی تھی۔ انہیں بچپن کے ابتدائی سالوں میں نہ صرف قرآن پاک پڑھوایا تھا بلکہ نماز روزے کی بھی چھوٹی عمر سے ہی عادت ڈال دی تھی۔ پھر انہیں صاف بتادیا تھا کہ وہ یہاں تعلیم اور کاروبار کے سلسلے میں رہ تو ضرور رہے ہیں مگر ان کا کلچر اور مذہب یہاں سے مختلف ہے اور انہیں ہر صورت میں اپنی تہذیب وتمدن اور مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہے۔ شکر ہے کہ تینوں بچوں نے والدین کی تعلیم و تربیت کو گھول کر پی لیا تھا وہ اگرچہ مختلف مذاہب اور

ملکوں کے بچوں کے ساتھ زیر تعلیم تھے مگر انہیں اپنی روایات سے بیحد لگاؤ تھا گھر میں تینوں بچے اردو اور پنجابی بولتے تھے۔ انگلش تو وہاں ہر جگہ تھی ہی اسے سیکھنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی اردو اور پنجابی والدین نے سکھادی تھی۔ قرآن پاک اور اسلامی تعلیمات کے متعلق معلومات انہیں اسلامی سینٹر سے دی گئی تھیں۔ گھر میں انگلش اردو کی کتابیں اور رسالے وغیرہ سلیم نے کافی اکٹھے کیے ہوئے تھے ایک چھوٹا سا کمرہ لائبریری کے طور پر سیٹ کیا گیا تھا جہاں بچے باقاعدگی سے جا کر فارغ وقت میں اپنی پسند کی کتابیں اور رسالے پڑھتے تھے غرضیکہ یورپی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود وہ لوگ مکمل طور پر مشرقی ذہن اور انداز واطوار کے مالک تھے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر پاکستان جانے کی خواہش کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ اس دن بھی جب سب گھر والے رات کے کھانے کے بعد لیونگ روم میں بیٹھے گرین ٹی پی رہے تھے تو وامق نے سلیم سے پاکستان جانے کے بارے میں استفسار کیا ”پاپا ہم پاکستان کب جائیں گے۔“

”سنو بیٹا ابھی تمہاری او لیول کی پڑھائی کا آغاز ہوا ہے۔ چند سالوں میں ماشاءاللہ تم انجینئر بن جاؤ گے پھر ہم پاکستان جائیں گے اور تمہاری دلہن لے کر آئیں گے۔“

”میری دلہن؟“ وامق نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں ہاں بیٹا“ سلیم نے کچھ سوچ کر کہا۔

”مگر پاپا وہ کون ہے کیسی ہے؟ آپ نے تو پہلے بھی ذکر ہی نہیں کیا تھا اس بات کا کہ آپ نے میرے لیے کوئی دلہن بھی منتخب کی ہوئی ہے۔“ وامق نے قدرے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

ارے بھائی وامق بھائی آپ کو اس سے کیا کہ وہ کون ہے کیسی ہے پاپا نے اگر آپ کے لیے اس کا انتخاب کیا ہے تو ظاہر ہے کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا اور پاپا کی سوچ ہمیشہ اچھی ہی ہوتی ہے۔“ زاریہ نے سلیم کے کندھے پر سر ٹکا کر لاڈ سے کہا۔

”دیکھو میری لاڈلی بیٹی مجھے زیادہ اور اچھی طرح سمجھتی ہے۔“ سلیم نے زاریہ کے گھنگھریالے بالوں کو اپنے بھاری ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”میں بھی آپ کو اچھی طرح سمجھتا ہوں پاپا بس وامق بھائی ہی موٹے دماغ کے مالک ہیں۔“ واسق نے بھی لاڈلے انداز میں کہا ”یہ کیا دونوں بہن بھائی آج ہم خیال کیسے ہوگئے۔ ورنہ تو ان کی ایک منٹ کے لیے نہیں بنتی آپس میں وامق نے زاریہ اور واسق کو مصنوعی غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا باتیں ہورہی ہیں باپ اور بچوں میں؟“ نتاشا نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

”ماما آپ کو پتہ ہے پاپا نے وامق بھائی کے لیے دلہن تلاش کرلی ہے وامق بھائی کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہم پاکستان جا کر اسے لے آئیں گے۔“ واسق نے حسب عادت تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

”ارے واہ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کون ہے وہ سلیم؟“

نتاشا نے مسکرا کر استفسار کیا ”فی الحال یہ ٹاپ سیکرٹ ہے بچوں رات بہت ہوگئی ہے اب سو جاؤ صبح تمہیں جلدی اٹھنا ہوتا ہے۔“ یہ کہہ کر سلیم جلدی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد پہلے تو ماں اور تینوں بچے حیرت سے اس دروازے کی جانب دیکھتے رہے جہاں سے سلیم نکل کر گیا تھا پھر سر جھٹک کر ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہوگئے۔ کچھ دیر بعد نتاشا نے بچوں کو سونے کے لیے جانے کا کہا اور خود بھی چائے کے خالی برتن

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔

☆......☆

ایک دن اچانک ہی فیروزہ جلیل کے ذہن میں پتہ نہیں کیا دھن سمائی کہ وہ سکندر کو لے کر گجرات کے لیے روانہ ہو گئیں دراصل نور کی یاد انہیں بے حد بے چین رکھتی تھی۔ پھر جب سے انہیں اپنی ایک دوست کی زبانی پتہ چلا تھا کہ نور اسلام آباد میں میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے تو ان کی اس سے ملنے کی خواہش اور بھی زیادہ شدت اختیار کر گئی پہلے انہوں نے سوچا کہ وہ نور کے ہاسٹل میں جا کر اس سے مل لیں مگر پھر انہیں خیال آیا کہ اگر اس نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا تو کس قدر سبکی ہوگی ظاہر وہ تو وہی کرے گی جس بات کی ماں نے اسے ہدایت دی ہوگی اس لیے انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ گجرات جا کر عابدہ چوہدری سے خود مل کر اس سے کہیں کہ کم از کم وہ کبھی کبھار نور کو ان سے ملنے کی اجازت تو دے دے ٹھیک ہے اگر وہ مناسب نہیں سمجھتی کہ فیروزہ جلیل اس کو اپنے گھر بلائیں تو وہ خود اس سے ہاسٹل میں جا کر مل لیا کریں گی آج کل چونکہ تعلیمی اداروں کی ایک ہفتہ کی چھٹیاں تھیں نور بھی گھر گئی ہوئی تھی۔ اس لیے فیروزہ جلیل نے یہ موقع مناسب سمجھا۔

عابدہ چوہدری اچانک فیروزہ جلیل اور سکندر کو اپنے گھر میں دیکھ کر پہلے تو قدرے حیران ہوئی مگر پھر اپنی حیرت کو چھپا کر بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا سکندر کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی دس سال پہلے والا وہ دبلا پتلا سا لڑکا اب بائیس تیئس سال کا خوبرو نوجوان بن چکا تھا پھر اسے یہ بھی پتہ چل چکا تھا کہ وہ میڈیکل کالج میں تھرڈ ائیر میں زیر تعلیم ہے نور نے ہی اسے اس کے متعلق بتایا تھا۔

آج جب نور نے اتنے سالوں بعد اپنی منہ بولی ماں کو اپنے گھر میں دیکھا تو وہ قدرے حیران ہوئی تھی ورنہ وہ یہی سوچے بیٹھی تھی کہ شاید ہی اب زندگی میں وہ کبھی فیروزہ جلیل سے مل پائے گی ان کی یاد اس کے دل میں ایک کسک کی طرح باقی تھی۔ وہ جتنا عرصہ بھی ان کے پاس رہی تھی انہوں نے سگی ماں سے بڑھ کر پیار اور توجہ دی تھی مگر پھر عابدہ چوہدری نے فیروزہ جلیل کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کر کے اس کا دل ان کی طرف سے کھٹا کر دیا تھا اور وہ بس دل میں اللہ تعالیٰ سے ہر وقت دعا ہی کر سکتی تھی کہ کسی طرح فیروزہ جلیل سے اسے دوبارہ ملا دے اور پھر شاید یہ اس کی دعاؤں کی قبولیت ہی تھی کہ فیروزہ جلیل خود چل کر اس کے گھر آ گئی تھیں نہ صرف وہ خود بلکہ سارے کالج کی جان سکندر بھی جسے بدلے روپ میں دیکھ کر وہ چپکے چپکے چاہنے لگی تھی۔ اگرچہ جانتی تھی کہ وہ اس کی رسائی میں نہیں مگر دل تو کسی کو اپنا مکین بناتے ہوئے یہ سب کچھ نہیں سوچتا نا اسے تو جو بھا جائے وہ دیوانہ وار اسے چاہنے لگتا ہے۔

''میڈم کیسی ہیں آپ؟ بڑے عرصے بعد آپ کا یہاں کا چکر لگا؟'' عابدہ چوہدری نے فیروزہ جلیل کو ڈرائنگ روم میں لے کر جاتے ہوئے پوچھا

''میں تو پھر بھی آ ہی گئی خود ہی ڈھیٹ بن کر مگر تمہیں تو فون کرنے تک کی فرصت نہیں ملتی۔ اور پھر میری بیٹی کو بھی مجھ سے ملوانے نہیں لاتی ہو۔'' فیروزہ جلیل نے نور کو گلے لگاتے ہوئے لگی لپٹی رکھے بغیر گلہ کیا۔

''بس آپ تو جانتی ہیں بچوں کی پڑھائی اور دوسری مصروفیات کی وجہ سے وقت ہی نہیں ملتا۔ پھر میں اکیلی جان ہوں بچوں کے ساتھ ساتھ گھر کی بھی ذمہ داریاں ہیں۔ نور میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے اسے ہاسٹل چھوڑنا اور لانا لے جانا نور سے بڑا ولید لاہور میں پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کر رہا ہے۔ اور بچے بھی کالج پہنچ چکے ہیں سرفراز بھی لاہور بی کام کر رہا ہے جبکہ چھوٹا نوید بی اے میں ہے ان ہی مصروفیات میں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔ عابدہ چوہدری نے تفصیل سے اپنی مصروفیات کی فہرست گنوائی۔

''اچھا یہ تو اچھی بات ہے کہ نور میڈیکل کالج میں پہنچ گئی ہے خیر سے سکندر بیٹا بھی ڈاکٹر بن رہا ہے۔ تیسرے سال میں ہے نور تم کس کالج میں ہو؟'' فیروزہ نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

''سکندر بھائی کے کالج میں۔'' نور نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا...... مگر تم نے دیکھا تھا وہاں مجھے؟ سکندر نے حیران ہو کر پوچھا۔

بہت مرتبہ نور نے اپنی گھنی پلکیں اٹھا کر ایک لمحہ کے لیے سکندر کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھ کر صاف گوئی سے جواب دیا

''تو پھر تم مجھ سے ملی کیوں نہیں؟'' سکندر اب بھی حیران تھا۔

''اب آپ اتنے پاپولر ہیں کالج میں جبکہ میں ایک عام سی لڑکی ہوں آپ بھلا کب مجھ سے ملنا یا بات کرنا پسند کرتے۔'' نور نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

''ہم لوگ کزن ہیں بچپن کا کچھ عرصہ ہم نے اکٹھے ایک ہی گھر میں گزارا ہے میں بھلا کیوں تم سے ملنا یا بات کرنا پسند نہیں کرتا سکندر نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں کہا'' وہ...... وہ...... بچپن میں تو آپ مجھ سے اس قدر لڑتے اور مارنے پیٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے غصے میں آ کر میں سمجھی کہ آپ اب بھی ایسے ہی ہوں گے۔'' نور نے جھینپتے ہوئے اپنی ہنسی کو لبوں میں دبا کر کہا تو جواب میں سکندر کا قہقہہ پورے کمرے میں گونج اٹھا

عابدہ چوہدری اور فیروزہ جلیل معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر دونوں کی باتیں بڑے انہماک سے سن رہی تھیں۔

''ویسے عابدہ یہ تمہاری زیادتی ہے کہ اپنا گھر اسلام آباد میں ہوتے ہوئے بھی تم نے میری بچی کو ہاسٹل میں رکھا ہوا ہے دیکھو تو کتنی کمزور ہو گئی ہے کھانے پینے کی تو وہ بچپن سے ہی چور ہے اور ہاسٹل میں کون اسے زبردستی کھلاتا ہوگا۔'' فیروزہ جلیل نے نور کو اپنے ساتھ بٹھا کر پیار سے کہا تو وہ بھی اپنے بازوؤں کو ان کی گردن میں حمائل کر کے ان سے لپٹ گئی۔

''میڈم جس طرح یہ آپ سے پیار اور لاڈ کرتی ہے اس طرح تو اس نے مجھ سے کبھی بھی نہیں کیا عابدہ چوہدری نے مصنوعی رشک سے کہا'' بھئی میری بیٹی ہے۔ مجھ سے لاڈ نہ کرے تو کیا تم سے کرے گی تمہاری بڑی بیٹی ہے نا عدیلہ یہ تو میری جان ہے تم نے ہم دونوں کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر کے اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' فیروزہ جلیل نے گلوگیر لہجے میں کہا

''سوری میڈم یہ میری غلطی تھی'' واقعی نور آپ کی بیٹی ہے اور آپ ہی کی رہے گی مجھے معاف کر دیں۔'' عابدہ چوہدری نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر کہا

''ایک تو عابدہ تم مجھے میڈم ویڈم نہ کہا کرو کالج کا دور ختم ہو گیا ہے اب تو تم بھی ریٹائر ہو چکی ہے مجھے بھی ریٹائر ہوئے کئی برس ہو گئے تم مجھے باجی یا آپا کہا کرو یہ اچھا نہیں لگتا اور ہاں میں آج ہی نور کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی اب یہ ہاسٹل میں بھی نہیں رہے گی میرے پاس رہے گی کالج آنے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے سکندر اسے لے جایا اور لے آیا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کرے گا'' فیروزہ جلیل نے گویا فیصلہ سنا دیا۔

''ٹھیک ہے آپا آپ کی مرضی' مگر نور سے پوچھ لیں۔'' عابدہ چوہدری نے بات نور پر چھوڑ دی۔

''مم...... مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر سکندر بھائی کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔'' نور نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

''کیسا وعدہ؟'' سکندر نے حیران ہو کر کہا۔

''آپ مجھے اب مارا نہیں کریں گے۔''

نور کی اس بات پر سب ہنس پڑے۔

رات کے کھانے کے بعد فیروزہ جلیل سکندر اور نور کے ہمراہ اسلام آباد واپس آ گئیں۔ انہوں نے نور کو اپنے کمرے میں ہی ٹھہرایا باقی دونوں بیڈ رومز میں سے ایک سکندر اور اس کے بھائی کے استعمال میں تھے اور تیسرا بیڈ روم سکندر کی دونوں بہنوں کے استعمال میں تھا چونکہ فیروزہ جانتی تھیں کہ نور الگ کمرے میں نہیں رہ سکتی۔ اس لیے انہوں نے اس کو اپنے ہی بیڈ روم میں رہنے کو کہا تھا اب وہ بے حد مطمئن تھیں کہ ان کی بیٹی ان کے پاس آ گئی ہے۔

☆......☆

''پھوپھو آپ اور دادو کیا اتنی دیر سے کھسر پھسر کر رہی تھیں زاریہ کمرے میں داخل ہوئی تو سحرش نے جو کمرے میں اپنے انگلش کے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی نوٹس کی فائل کو بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا تو مانو بلی چھپ چھپ کر ہماری باتیں سن رہی تھی بری بات ہے سحرش ایسا نہیں کرتے۔'' زاریہ نے بظاہر غصے سے کہا

''توبہ پھوپھو جانی ایک تو آپ ہر وقت ٹیچر بنی رہتی ہیں یہ کرو، وہ نہ کرو وغیرہ، کبھی ہنسی مذاق بھی کر لیا کریں۔'' سحرش نے زاریہ کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر مزاحیہ لہجے میں کہا۔

''جب قسمت میں ہی ہنسنا نہ لکھا تو کس دل سے ہنسوں۔'' زاریہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''کیوں کیا ہوا آپ کی قسمت کو اتنی تو شاندار لائف ہے آپ کی، اُنیسویں اسکیل میں اتنے بڑے سرکاری کالج میں ایسوسی ایٹ پروفیسر، اپنا گھر، گاڑی، اتنی پیاری ماں ہے عزت اور محبت کرنے والے بھائی اتنی اچھی بھابھی پیاری پیاری چار بھتیجیاں اور خاص کر مجھ جیسی شہزادی کا تو جواب ہی نہیں۔ آپ تو خوش قسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ جیسی اتنی اچھی بیٹی آپ کو بن مانگے ہی دے دی۔ اور کیا چاہیے؟ اس کے باوجود بھی بس اس بات پر دکھی رہتی ہیں کہ ایک ناشکرے اور کم ظرف خود غرض شخص نے آپ کی ناقدری کی، لعنت بھیجیں ایسے شخص پر وہ آپ کے قابل نہیں تھا شکر ہے کہ جلدی آپ کی جان چھوٹ گئی ورنہ اگر دو تین بچے ہو جاتے تو آج آپ کے ساتھ وہ بھی دکھ سہہ رہے ہوتے۔'' سحرش نے بزرگانہ انداز میں ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔

''ارے میرے ننھی منی سحرش اتنی بڑی ہو گئی ہے کتنی بڑی بڑی باتیں کرنے لگ گئی ہے۔ مگر تمہیں کس نے کہہ دیا کہ میں اس گھٹیا شخص کے لیے سوچتی اور دکھی ہوتی ہوں اسے تو میں نے شادی کے پہلے روز ہی ریجیکٹ کر دیا تھا تم صحیح کہتی ہو کہ وہ میرے قابل نہیں تھا مجھے تو بس ابا کی بے وقت موت کا دکھ ستاتا رہتا ہے یا پھر جب کوئی بات میری مرضی اور خواہش کے خلاف ہو جائے تو اس پر دل بھر آتا ہے ورنہ مجھے نہ کوئی احساس محرومی ہے نہ ہی کوئی خلش۔ زندگی میں اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت نوازا ہے۔ میں جتنا بھی اس کا شکر ادا کروں کم ہے۔'' زاریہ نے ایک جذب کے عالم میں کہا۔

''چلیے شکر ہے آپ نے آج اس بات کی وضاحت کر دی کہ آپ کو اس منحوس شخص سے کبھی کوئی لگاؤ محسوس ہوا تھا نہ ہی اس کی یاد ستاتی ہے۔ ورنہ میں جب بھی آپ کو تھوڑا سا بھی پریشان دیکھتی تھی تو میں دل ہی دل میں اسے گالیاں دینا شروع کر دیتی تھی۔ خیر چھوڑیں۔ یہ دل دکھانے والی باتیں بس یہ بتائیں کہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے آپ لوگ کیا باتیں کر رہے تھے۔ جلدی بتائیں یقین کریں تجسس کے مارے میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔'' سحرش نے زاریہ کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر کے لاڈ سے کہا۔

''فضول میں بک بک نہ کرتی رہا کرو جو منہ میں آتا ہے بغیر سوچے سمجھے بول دیتی ہو ہارٹ فیل تمہارے دشمنوں کا ہو اور یہ تم نے بڑوں کی باتوں میں دلچسپی کب سے لینی شروع کر دی؟ اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دیا کرو۔ اگر میٹرک میں اچھے نمبر نہ آئے تو کالج میں داخلہ نہیں ملے گا پھر کوئی بھی ایرا غیرا نتھو خیرا سے تمہیں دو بول پڑھوا کر رخصت کر دوں گی سمجھیں۔'' زاریہ نے دھمکی دی

''ٹھیک ہے آپ نہیں بتانا چاہ رہی تو نہ بتائیں مگر ایسی خوفناک دھمکیاں تو نہ دیں۔'' سحرش نے روٹھے روٹھے لہجے میں کہا

''اچھا میری ماں بتاتی ہوں تو مجھے چین لینے کب دے گی۔'' دراصل شہروز کی شادی کے سلسلے میں بات کر رہے تھے آیا سمجھ میں مانو بلی۔'' زاریہ نے سحرش کی نازک سی ناک کو مروڑتے ہوئے کہا۔

'پلیز پھوپھو میری اس ناک پر تو رحم کریں سچ بڑا درد ہوتا ہے ارے ہاں یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کہ شہروز چاچو کی شادی ہو رہی ہے کون ہے وہ خوش نصیب لڑکی جو میری چاچی بننے کا شرف حاصل کرنے جا رہی ہے؟'' سحرش نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''تمہاری چھوٹی ممانی کی بہن۔'' زاریہ نے گویا دھماکہ کیا۔

''کک...... کیا؟ نہیں...... راحیلہ آنٹی کسی بھی لحاظ سے شہروز چاچو کے قابل نہیں ہیں وہ روزینہ مامی جیسی ہی ہوں گی۔ میرے ایک ہی تو چاچو ہیں وہ بھی چھن جائیں گے پلیز پھوپھو ایسا نہ کریں۔'' سحرش نے چیخ کر کہا۔

''میں کیا کروں؟ میں نے تو امی کو بہت سمجھانا چاہا ہے مگر ان کی سوئی راحیلہ پر ہی اٹکی ہوئی ہے شاید شہروز کے والد نے امی کی کچھ زیادہ ہی برین واشنگ کر دی ہے یا پھر وہ ڈرتی ہیں کہ اگر ان کی مرضی کے خلاف شہروز کا رشتہ کیا تو کہیں وہ اسے سکھا پڑھا کر واپس نہ لے جائیں۔'' زاریہ نے پریشان لہجے میں کہا۔

''ہاں یہ تو ہے کیونکہ شہروز چاچو پر اصل حق ان کے والدین کا ہے ہوسکتا ہے راحیلہ آنٹی اپنی بہن جیسی نہ ہوں اور پھر شہروز چاچو بھی تو بہت تیز اور دبنگ ہیں وہ ایسے نہیں لگتے کہ بیوی کے غلام بن جائیں گے اور اپنوں کو چھوڑ دیں گے۔'' سحرش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''بس اللہ ہی بہتر جانے کہ کیا مناسب ہے انسان تو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتا ہے۔ نتیجہ تو اللہ پر منحصر ہے۔ زاریہ نے کہا اور پر بیڈ پر نیم دراز ہو کر کوئی کتاب پڑھنے لگی اور سحرش ٹیسٹ کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

☆......☆

ایک دن نتاشا اپنے اسٹور میں کاؤنٹر پر بیٹھی تھی اسٹور میں کام کرنے والی دو لڑکیاں شیلفوں میں تیزی سے چیزیں Set کر رہی تھیں جبکہ دو لڑکیاں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی گاہکوں کے بل بنا رہی تھیں اب یہ اسٹور کافی بڑا ہو چکا تھا۔ ضرورت کی ہر چیز

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

یہاں میسر تھی۔

صبح کے دس گیارہ بج رہے تھے ابھی اسٹور کی ترتیب وغیرہ درست ہورہی تھی گاہک کم کم ہی تھے نتاشا کچھ دیر تو کاؤنٹر پر بیٹھی کمپیوٹر پر کیش وغیرہ کا حساب لگاتی رہی پھر اٹھ کر اسٹور میں موجود سامان کا جائزہ لینے لگی جن شیلفوں میں چیزیں کم تھیں وہاں پورا کرنے کے لیے ملازم لڑکوں کو ہدایات دیتی رہی اسی لمحے اسٹور کا گلاس ڈور کھلا اور چھ سات افراد بدحال حالت میں اسٹور میں داخل ہوئے جو گرد سے اٹے ہوئے لڑکوں کی داڑھیاں اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے بلکہ آپس میں الجھے ہوئے بالوں میں گرد وغبار درختوں کے سوکھے پتے اور گھاس کے تنکے اٹکے ہوئے تین لڑکیاں بھی تھیں ان کے منی اسکرٹ نہایت بوسیدہ اور میلے تھے بال جھاڑ جھنکار کی طرح الجھے ہوئے اور بے حد گندے لمبے لمبے ناخنوں میں میل بھری ہوئی تھی پاؤں میں ٹوٹے ہوئے دورنگوں کے جوتے پہن رکھے تھے ان سب کے چہروں پر میل کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ ہونٹ اور ہاتھوں کی انگلیں نشے والے سگریٹ پینے کی وجہ سے جھلسے ہوئے تھے اور ان پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں کاندھوں پر بڑے بڑے بوسیدہ تھیلے لٹکے ہوئے تھے۔

نتاشا پہلے تو ان عجیب الخلقت حلیے کے افراد کو دیکھ کر گھبرا گئی مگر پھر اس نے سوچا اس ملک میں ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق رہتا سہتا اور پہنتا اوڑھتا ہے۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ شاید یہ بھی کوئی گاہک ہیں اس لیے وہ لاپرواہی سے کندھے جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہوگئی اس دوران ان بدحال لڑکوں اور لڑکیوں نے ٹرالیاں لینے کے بجائے شیلف سے چیزیں اٹھا اٹھا کر اپنے کاندھوں پر لٹکے ہوئے تھیلوں میں ڈالنی شروع کر دیں یہ دیکھ کر نتاشا ان کی جانب بڑھی اور ایک شخص کو جو بسکٹ کے بڑے بڑے پیکیٹ اٹھا اٹھا کر اپنے تھیلے میں ڈال رہا تھا ساتھ ہی فریزر سے نکالے ہوئے کوک کے ٹن کے سپ بھی لے رہا تھا۔ نتاشا نے اس شخص کو مخاطب کر کے کہا

"Hey mister, what are you doing? plz take the trolly and put these things , you are not suppose to put this stuff directly
in to your bag with out paying."

جس کے جواب میں اس نے اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر کہا۔

"Ha, Ha, Ha
pay for this?"

اس شخص نے اپنے غلیظ ہاتھ سے نتاشا کی تھوڑی کو اوپر اٹھا کر اپنی گدلی گدلی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا اس پہ اس کے باقی ساتھیوں نے زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیے ایک لڑکی نے تو باقاعدہ ڈانس کرنا اور گانا شروع کر دیا جبکہ باقی کورس کے انداز میں اس کا ساتھ دے رہے تھے ساتھ ساتھ تالیاں بھی بجا رہے تھے

"what is this non sense leave the store I` ll call the police."

. نتاشا نے چلا کر کہا اس پر انہوں نے اور زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

"Oh my darling is going to call the police."

ایک اور گندے سے آدمی نے نتاشا کو اپنی بانہوں میں جکڑ کر چٹ چٹ اس کی پیشانی پر اپنے گندے ہونٹوں سے بوسہ دیتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ اس پر سب نے چیخم چنگھاڑ شروع کر دی

"You idiot how dare you touch me. "

نتاشا نے اپنے ساتھ لپٹے ہوئے شخص کو غصے سے جھٹکا دے کر خود سے الگ کرتے ہوئے کہا نتاشا کے دھکا دینے پر وہ شخص لڑکھڑایا اور ایک شیلف سے ٹکرا گیا اور شیلف اس کے اوپر اور دو اور لڑکیوں پر گر گیا انہوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا

"Oh you bitch you have tried to kill my friend i shall not forgive you for this cruelity."

ایک آدمی نے اپنے تھیلے میں سے لمبا سا چاقو نکال کر نتاشا کی جانب بڑھتے ہوئے کہا اور اس سے قبل کہ حیران و پریشان کھڑی نتاشا کچھ سمجھتی اس نے نتاشا پر پے در پے چاقو کے وار کرنے شروع کر دیے چند لمحوں بعد ہی نتاشا خون میں لت پت فرش پہ پڑی اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی۔

اس دوران پولیس بھی پہنچ گئی کیونکہ ایک لڑکی نے ان درندے نما انسانوں کو اسٹور میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی پولیس کو اطلاع کر دی تھی چند منٹ جو پولیس کو پہنچنے میں لگے اس دوران وہ لوگ واردات کر کے بھاگ چکے تھے البتہ جو دو تین افراد شیلف کے نیچے دبے ہوئے تھے وہ بھاگنے میں کامیاب نہ ہو سکے پولیس نے انہیں شیلف کے نیچے سے نکال کر گرفتار کر لیا نتاشا کے لیے ایمبولینس منگوائی اور اسٹور میں موجود لڑکیوں سے ان کے بیانات اور فون نمبر لے کر انہیں جانے دیا اور اسٹور کو سیل کر دیا نتاشا چند گھنٹوں تک ہاسپٹل میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد زندگی کی قید سے آزاد ہوگئی۔ سلیم کی حالت پاگلوں جیسی ہو چکی تھی۔ اس نے اتنے المناک انداز میں اپنی تیسری بیوی کو بھی کھو دیا تھا۔ بچوں کی حالت بھی ابتر تھی۔ اپنی چاہنے والی ماں کی خون میں لت پت لاش کو دیکھ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔ کئی روز تک وہ سب اپنے آپ سے بھی بیگانہ رہے۔

اس المناک سانحے کے دو ہفتوں بعد سلیم سب کچھ وائنڈ اپ کر کے بچوں اور تابوت میں بند نتاشا کو لے کر ہمیشہ کے لیے اس سرزمین کو خیر باد کہہ کر پاکستان لوٹ آیا۔

پاکستان میں نتاشا کے والدین بہنوں، بھائیوں اور دوسرے عزیز واقارب اور رشتے داروں کو نتاشا کی اس دردناک موت کا شدید صدمہ پہنچا تھا۔ نتاشا کے بوڑھے والدین پہ تو سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ ہنستی کھیلتی اپنے گھر میں شاد و آباد بیٹی اس طرح زندگی سے منہ موڑ جائے گی یہ کس نے سوچا تھا مگر انسان کی اپنی منصوبہ بندی اور قدرت کے اپنے کام، قسمت اور مقدر سے کون لڑ سکتا ہے ہوتا وہی ہے جو انسان کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔

کہاں تو سلیم اور نتاشا بڑے سہانے خواب آنکھوں میں سجائے تھے اور جو وہ چاہتے تھے کافی حد تک پا بھی لیا تھا اپنا شاندار کاروبار تھا بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے مگر پلک جھپکتے ہی میں سارے حسین سپنے ٹوٹ گئے اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ واثق انجینئر بن سکا نہ ہی واسق کی چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے کی خواہش پوری ہو سکی۔ اور چھوٹی بہن تو ابھی ابتدائی کلاسز میں ہی تھی۔

☆......☆

فیروزہ جلیل نور کو اپنے گھر تو لے آئی تھیں اور انہوں نے عابدہ چوہدری سے یہ بھی وعدہ کر لیا تھا کہ سکندر اسے اپنے ساتھ کالج لے جایا بھی کرے گا اور واپس بھی لے آیا کرے گا مگر سکندر چند روز ہی یہ ڈیوٹی نبھا سکا پھر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ''پھوپھو آپ جانتی ہیں کہ میں کالج میں کافی سینئر اسٹوڈنٹ ہوں۔ کلاسز کے ساتھ ساتھ میری وارڈز میں بھی ڈیوٹی ہوتی ہے پھر میں کالج ایکٹیویٹیز میں بھی حصہ لیتا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہوں کئی سوسائیٹیز اور کلبز کا ممبر بھی ہوں میرے پاس تو بعض اوقات لنچ تک کرنے کا ٹائم نہیں ہوتا رہی نور تو یہ بے چاری ابھی فرسٹ ائیر میں ہے سوائے کلاسز اٹینڈ کرنے اور پریکٹیکلز کے اسے اور کوئی کام نہیں ہوتا یہ گھنٹوں میرے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے اس کی فرینڈز بھی اپنے گھر چلی جاتی ہیں اس کی نئی نئی پڑھائی ہے اور میڈیکل کی پڑھائی بیحد ٹف ہے شروع میں تو زیادہ مشکل پیش آتی ہے اسے گھر آ کر پڑھنا بھی ہوتا ہے اس لیے پلیز آپ اس کا کالج آنے جانے کے لیے کوئی اور بندوبست کر دیجیے میرے لیے بے حد مشکل ہے اس کو لانے لے جانے کی ذمہ داری نبھانا۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ میں آپ کی حکم عدولی کر رہا ہوں اس کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا بس اسے میری مجبوری سمجھ لیجیے

سکندر کے انتہائی معذرت خواہانہ انداز میں اتنی تفصیل سے بات کرنے پر فیروزہ جلیل خاموش سی ہوگئیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ سکندر بے حد صاف گو اور ذمہ دار شخص ہے اور وہ بغیر کسی لگی لپٹی کے ہر بات کرنے کا عادی ہے خواہ دوسرے کو برا لگے یا اچھا وہ جھوٹے بہانے بنانے یا دوسروں کو گومگوں کی کیفیت میں رکھنے کا عادی نہیں تھا پھر فیروزہ جلیل یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ کالج کا بے حد پاپولر اسٹوڈنٹ ہے اور اس نے ہر جگہ اپنی ٹانگیں پھیلا رکھی ہیں انہوں نے جب رات کو نور سے بات کی تو وہ بھی کہنے لگی ماما سکندر بھائی ٹھیک کہتے ہیں واقعی میری وجہ سے ان کے لیے بہت پرابلمز کھڑے ہوگئے ہیں بہتر تو یہی ہے کہ میں ہاسٹل شفٹ ہوجاؤں اور ویک اینڈ ز پر آپ کے پاس آ جایا کروں یا پھر جو آپ مناسب سمجھیں۔''

''نہیں خیر ہاسٹل میں تو میں تمہیں ہرگز نہیں بھیجوں گی پہلے ہی اتنا سا منہ نکال لیا ہے تم نے ہاسٹل میں رہ کر نا تم ڈھنگ سے کھانا کھاتی ہو نہ ہی اپنا خیال رکھتی ہو۔ میری گاڑی ہے نا بیکار گیراج میں کھڑی رہتی ہے کبھی کبھی شاپنگ کے لیے جانا ہو تبھی استعمال ہوتی ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ ڈرائیور کا انتظام کر دیتی ہوں وہ تمہیں کالج لے جایا کرے گا اتنی دیر تو وہ ادھر ہی رہے گا اور جب تم فارغ ہوجاؤ گی تو تمہیں لے آیا کرے گا۔ ساتھ ہی تمہیں کسی ڈرائیونگ سینٹر سے ڈرائیونگ کی تربیت دلوا دیتے ہیں چند ماہ تک جب تم ڈرائیونگ میں ایکسپرٹ ہوجاؤ گی اور لائسنس بھی بن جائے گا تو پھر تمہیں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا فیروزہ جلیل نے حتمی لہجے میں کہا

''ٹھیک ہے ماما جیسے آپ کی مرضی۔'' نور نے آہستگی سے کہا۔ اس کی ویسے بھی عادت نہیں تھی کسی قسم کی جرح کرنے یا من مانی کرنے کی بے حد کم گو، سیدھی سادی لڑکی تھی۔ سکندر کے ساتھ کالج آتے جاتے چپ چاپ اس کے ساتھ بیٹھی رہتی وہ کوئی سوال کرتا تو مختصر سا جواب دے دیتی اور پھر رخ موڑ کر سڑک پر آ جاتی ٹریفک کو دیکھتی رہتی سکندر کو اس عام سی لڑکی میں کوئی خاص کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس قدر ذہین بھی نہیں لگتی تھی۔ پتہ نہیں میڈیکل کالج میں کیسے پہنچ گئی۔ نہ اس میں برجستگی سے بات کرنے کی صلاحیت ہے نہ دوسری لڑکیوں کی طرح بننے بولنے گھومنے پھرنے اور نت نئے انداز کے فیشن کرنے کا شوق ہے اسے اگرچہ اچھی خاصی خوبصورت ہے اگر خود کو بنا سنوار کر رکھے تو خاصی پرکشش ہوسکتی ہے مگر یہ تو سر پر اسکارف باندھے بڑے سے دوپٹے سے خود کو لپیٹے دادی اماں ہی لگتی ہے سکندر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اسے کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچتا۔ کہاں تو وہ کالج کا پرنس چارمنگ تھا اس کی کلاس فیلوز اور کالج کی دیگر ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت ذہین اور ہر ایکٹویٹی میں بڑھ چڑھ حصہ لینے والی لڑکیاں تتلیوں کی مانند اس کے ارد گرد منڈلاتی تھیں۔ وہ کسی سے ہنس کر بے تکلفی سے بات کر لیتا تو وہ اسے بھی اپنی خوش قسمتی سمجھتی تھی۔ اور کہاں یہ اللہ میاں کی گائے ٹائپ کزن۔ اسے تو اس کے ساتھ آتے جاتے بھی عجیب سا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے دوست اور باقی لڑکیاں کیا سوچیں گی کہ یہ کون ہے جسے وہ ساتھ لاتا اور لے جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے اسے اپنی شہرت بھی خطرے میں محسوس ہو رہی تھی یہی سب کچھ سوچ کر اس نے نور کی ذمہ داری نبھانے سے معذرت کر لی تھی اور وجوہات کے سات ساتھ اسے اپنے امیج کی بھی فکر تھی جو اس نے گزشتہ تین چار سال کی محنت کے بعد کالج میں بنایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ہینڈسم ہے لائق فائق ہے کوئی بھی اچھی سے اچھی لڑکی بڑے فخر سے اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کے لیے آمادہ ہوسکتی ہے خیر ابھی تو اس میں بہت وقت پڑا تھا ایم بی بی ایس کے بعد اس کا ارادہ میڈیکل کی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ جانے کا تھا۔ اس کے والد ارشاد علی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی وہ ایم بی بی ایس کے بعد اپنا ہاؤس جاب مکمل کر لے گا وہ اسے اپنے پاس امریکہ بلا لیں گے۔ اس کے تو یہ ارادے تھے لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ فیروزہ جلیل نور کو کس مقصد کے لیے یہاں لائی ہیں اور عابدہ چوہدری نے کیسے اتنے عرصے بعد نور کو دوبارہ فیروزہ جلیل کے حوالے کر دیا تھا۔

مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے اگر دنیا کے تمام کام انسانوں کی مرضی اور خواہش سے ہونے لگیں تو پھر دنیا کا نظام چل چکا تب تو ہر انسان بس وہی چاہے گا اور کرے گا جو اس کے لیے اچھا اور بہتر ہوگا اور یوں عجیب سی صورتحال ہوجائے گی اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکمل طور پر آزاد نہیں چھوڑا ہے اور نہ ہی اسے کھل کر من مانی کرنے کی اجازت دی ہے اسے بے پناہ صلاحیتوں سے نواز کر اسے اپنی منشا اور تقدیر کا پابند کر دیا ہے اور زندگی کے بے حد اہم فیصلے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔

فیروزہ جلیل تو یہ چاہتی تھیں کہ اپنی منہ بولی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھیں اور اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ سکندر سے اس کی شادی ہوجائے جبکہ سکندر تو اور ہی سوچوں کا مالک تھا اس لیے جب فیروزہ جلیل نے محسوس کر لیا کہ ایسا ممکن نہیں تو پھر انہوں نے نور کی ذمہ داری مکمل طور پر خود ہی سنبھال لی۔ انہوں نے نور کو کالج جانے اور آنے کے لیے ڈرائیور کا بندوبست کر دیا ساتھ ہی ساتھ اسے ڈرائیونگ کی تربیت بھی دلوانی شروع کر دی اور چند ماہ ہی میں وہ ماہرانہ طور پر گاڑی چلانے کے قابل ہوگئی تو پھر اس کا کالج آنے جانے کا مسئلہ بھی حل ہوگیا نور پہلے تو کافی کم گو اور لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی مگر پھر فیروزہ جلیل نے اسے دنیا کی اونچ نیچ سمجھانی شروع کر دی چونکہ بچپن کے ابتدائی چند سالوں کے علاوہ اس نے زیادہ تر وقت گجرات ہی میں گزارا تھا اس لیے وہ کافی سادہ مزاج اور اپنی ذات کے خول میں بند رہنے والی ہوگئی تھی، دوسری طرف سکندر اور اس کے بھائی اور بہنیں انہوں نے بھی باپ کے سائے کے بغیر زندگی بسر کی تھی اور کر رہے تھے مگر انہیں نگہت جیسی تیز و طرار ماں اور فیروزہ جلیل جیسی ذہین اور پڑھی لکھی سلجھی ہوئی سرپرست ملی تھیں جنہوں نے ان کی شخصیتوں کو متوازن تو بنا دیا تھا مگر ان میں زمانے کے ساتھ چلنے نئے ماحول کے مطابق ڈھلنے اور کسی حد تک خودنمائی اور خودغرضی کا جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ اور وہ اپنے من پسند مشاغل کو اپنانے میں بھی آزاد تھے ان کی زندگی محدود نہیں تھی پھر اب تو انہیں پیسے کی بھی کمی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نہیں تھی ارشاد علی کا کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا اس لیے وہ اچھی خاصی رقم ہر مہینے انہیں بھجوا رہا تھا جس سے وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اپنے اپنے پسندیدہ شعبوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے البتہ فیروزہ جلیل کو اس بات کا دکھ ضرور تھا کہ کچھ عرصہ جو وہ مکمل طور پر نگہت کے پاس رہے تھے تو ان کی ماں کی غلط تربیت کی وجہ سے ان کی کچھ عادتیں پختہ ہوگئی تھیں جن میں پیسے کے بیدردی سے خرچ کرنے اپنی خواہشات کی اندھا دھند پیروی کرنے اور خود کو دوسروں سے برتر سمجھنا وغیرہ تھا اور فیروزہ جلیل باوجود انتہائی کوشش کے ان کی اس سلسلے میں اصلاح کرنے میں ناکام رہی تھیں باوجود ہر وقت سمجھانے بجھانے کے وہ لوگ اپنی روش چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے تو پھر زچ ہو کر انہوں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

رہی نور تو وہ معصوم سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ ہر وقت اپنی اصلاح پر آمادہ اور بڑوں کی فرماں برداری کو اپنا ایمان سمجھتی تھی اس لیے جیسے جیسے فیروزہ جلیل اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کے ساتھ ساتھ اسے زمانے کے ساتھ چلنے اور اچھائی برائی سے آگاہ کرتیں وہ ان کی ہر بات کو پلو سے باندھ لیتی وہ پڑھائی میں تو اچھی تھی ہی ساتھ ساتھ اس نے سکندر کی دیکھا دیکھی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی نمایاں طور پر حصہ لینا شروع کر دیا جس سے وہ کالج میں کافی پاپولر ہوگئی مگر اس کے باوجود ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی اس کے اور سکندر کے درمیان کسی قسم کا جذباتی لگاؤ نہ پیدا ہوسکا۔ دونوں ایک دوسرے کو کسی اور نظر سے ہی دیکھتے تھے بلکہ سکندر کو تو وہ اپنی بہنوں جیسی محسوس ہوتی تھی۔ مگر نور اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی اور اس کی چاہت کی آگ میں سلگتی رہتی تھی کیونکہ کسی کو چاہنا یا پسند کرنا انسان کے اپنے بس میں تو ہوتا نہیں یہ تو ایک ایسا جذبہ ہے جو خودرو پودوں کی طرح دل کی زمین پر اگتا ہے اور انجانے ہی میں پروان چڑھ جاتا ہے اور یہ جذبہ ہر شخص کے لیے دل میں پیدا بھی نہیں ہوتا بس جو مقدر میں لکھا ہو اس سے چاہت ہو نہ ہو وہ انسان کو مل کر رہتا ہے۔ کبھی نہیں بھی ملتا جیسے فیروزہ جلیل کے ساتھ ہوا۔ یا پھر کبھی مل کر بچھڑ جاتا ہے جیسے زاریہ کے ساتھ ہو پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک بے نام سا تعلق رکھنے کے باوجود وہ شخص کسی اور دیس کا باسی بن کر نئے رشتے استوار کر لیتا ہے اور اپنے جیون ساتھی کو انتظار کی سولی پر لٹکتا چھوڑ جاتا ہے جیسے ارشاد علی نے نگہت کے ساتھ کیا اور اس کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے ویران کر دیا۔ اسی کا نام زندگی ہے یہاں کوئی بھی خوش نہیں ہے کچھ لوگ سب کچھ پا کر بھی ناخوش رہتے ہیں اور کچھ نا پا کر بھی خوش اور مطمئن اور اپنے مقدر پہ شاکر۔

شہروز راحیلہ سے رشتہ طے ہونے پر بہت خوش تھا۔ ایک دن سحرش شہروز کو چھیڑتی ہوئی بولی ”سنیں شہری چاچو آپ میرے ماموں کی طرح روزینہ مامی کی بہن سے پسند کی شادی کرنے جا رہے ہیں لیکن اگر آپ نے ماموں کی طرح راحیلہ چچی کی تابعداری کی اور ان کے کہنے پر آ کر ہم سب کو چھوڑ دیا تو میں کہہ رہی ہوں کہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ اچھی طرح یہ بات پلے سے باندھ لیں“

”ارے میری پیاری سی گڑیا سی بھتیجی کیا تم اپنے چاچو کو ایسا سمجھتی ہو میں تمہارے ماموں کی طرح بیوی کے رعب میں کبھی نہیں آؤں ا نہ ہی اس کی کوئی الٹی سیدھی بات مانوں گا میں اپنے جان سے زیادہ پیارے گھر والوں کی بجائے بیوی کو چھوڑ دوں گا۔ ویسے میں تمہیں بتا دوں کہ راحیلہ روزینہ جیسی نہیں ہے وہ فطرتاً صلح جو اور کم گو ہے اور گھر کے کام

کاج میں بھی دلچسپی رکھتی ہے اسی لیے تو میں نے اسے پسند کیا ہے ورنہ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگل لوں میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اس نے مجھے علیحدہ گھر لینے کے لیے مجبور کیا یا میرے گھر والوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کیا تو اسی لمحے اس کی ماں کے گھر چھوڑ آؤں گا اس لیے پیاری بھتیجی تم ہر قسم کی فکروں کو ذہن سے جھٹک دو اور شادی کی تیاریوں میں امی اور بہن کا ہاتھ بٹاؤ۔“ شہروز نے سحرش کی پونی کو ہلکے سے کھینچ کر کہا ”اوہ چاچو یہ اب میری پونی کھینچنا چھوڑ دیں اب میں بڑی ہوگئی ہوں۔“ سحرش نے چیخ کر کہا ”اچھا؟ واقعی میں تم بڑی ہوگئی ہو میرے نزدیک تو ابھی بھی وہ منی سی ہر وقت ریں ریں کرنے اور ٹافیاں چاکلیٹ پر جان دینے والی سحرش ہو اور تمہاری کسی بھی حرکت سے پتہ نہیں چلتا کہ تم واقعی بڑی ہوگئی ہو چلو اپنے بڑے ہونے کا ثبوت پیش کرو اچھی سی گڑیا گرما گرم چائے اور ساتھ گرم گرم پکوڑے بنا کر لاؤ باہر بارش ہو رہی ہے تاکہ موسم کو انجوائے کریں شہروز نے سحرش کو چڑاتے ہوئے کہا جانتا تھا کہ اس کی کچن میں جاتے ہوئے جان نکلتی ہے۔“ ”ہوں منہ دھو رکھیے سحرش اتنی اچھی نہیں ہے یہ فرمائشی پروگرام فی الحال اپنی ہونے والی بیگم کے لیے ملتوی کر دیجیے سحرش نے منہ بنا کر کہا۔ اوکے ٹھیک ہے نا مانو میری بات میں بھی ٹافیوں اور چاکلیٹوں کے ڈبے بارش کے بعد جا کر تمہاری بہن اقرا کو دے کر آتا ہوں۔“ شہروز نے اپنے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیوں کا رخ کرتے ہوئے کہا ”نن...... نہیں چاچو پلیز ابھی چائے اور پکوڑے بنا کر لاتی ہوں پلیز، پلیز آپ میری ٹافیاں اور چاکلیٹیں کسی کو نہ دیجیے گا۔“ سحرش نے برش ہاتھ سے رکھا اور کچن کی جانب بھاگتے ہوئے جلدی سے کہا تو شہروز کا قہقہہ سارے گھر میں گونجنے لگا۔

”یہ کس خوشی میں قہقہے لگائے جا رہے ہیں؟“ عامرہ بیگم نے گھبرا کر اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھا ”کچھ نہیں امی وہ بس یونہی۔“ شہروز نے بوکھلا کر کہا تو جواب میں سحرش کی ہنسی کی جلترنگ کچن سے بج اٹھی یہ دونوں چچا بھتیجی آج کچھ زیادہ ہی موڈ میں ہیں۔“ زاریہ نے نماز پڑھ کر جائے نماز لپیٹتے ہوئے کہا ”اللہ میرے بچوں کو اسی طرح خوش و خرم رکھے۔“ عامرہ بیگم نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہوئے کہا۔

”آمین۔“ زاریہ نے بھی کہا اور پھر کچھ دیر بعد اس گھر کے چاروں مکین سحرش کے بنائے ہوئے پکوڑوں اور چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے شہروز کی شادی کی تیاریوں کو ڈسکس کرنے لگے ساتھ ساتھ باہر برسنے والی بارش کی بوندوں کی جلترنگ کو بھی انجوائے کر رہے تھے۔

☆......☆

پاکستان واپس آ کر سلیم نے بچوں کے ہمراہ کچھ عرصے تک اپنے سسرال ہی میں قیام کیا تھا اس کے سسرال کے گھر کے دو پورشن تھے نچلے والے پورشن میں ساس سسر اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی تھی بڑا بیٹا کسی کمپنی میں ہوتا تھا اس کے بیوی بچے بھی اس کے پاس ہی تھے اوپر والا پورشن پہلے کرائے پہ تھا مگر چند ماہ پہلے ہی خالی ہوا تھا سسر کے کہنے پر سلیم نے وہاں رہائش اختیار کر لی تھی وقتی طور پر مگر اس نے باقاعدہ کرایہ دینے کا معاہدہ کیا تھا اس کے اصرار پر اس کے سسر بادل نخواستہ مان گئے تھے ورنہ سلیم نے گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکی دی تھی لاہور آ کر نتاشا کے دسویں کے ختم کے بعد سلیم نے سب سے پہلے بچوں کے داخلے کا انتظام کیا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وامق اور واسق کو ایچی سن کالج اسکول برانچ میں داخلہ مل گیا تھا جبکہ زاریہ کو لاہور گرائمر میں داخل کرادیا تھا بچوں کے داخلوں سے فارغ ہو کر سلیم نے ماڈل ٹاؤن میں دس مرلے کا ایک اچھا ڈبل اسٹوری گھر خرید لیا تھا، گھر کے کام کاج کے لیے فل ٹائم میاں بیوی ملازم رکھ لیے تھے، گھر کے اوپر ایک کمرہ ملازموں کے لیے بنا ہوا تھا وہ انہیں رہائش کے لیے دے دیا پھر سلیم نے گذر اوقات کے لیے ماڈل ٹاؤن کی ایک مارکیٹ میں ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور کھول لیا تھا جس میں تین چار لڑکے ملازم رکھ لیے یوں زندگی دوبارہ رواں دواں ہوگئی۔ جو لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں ان کی یادیں تو کسک بن کر ان کے پیچھے رہ جانے والے لواحقین کو ڈستی رہتی ہیں مگر وقت کا کارواں کسی کے جانے یا آنے سے رکتا نہیں کہ وقت کا کام ہے گزرتے چلے جانا سو وہ گزرتا ہی رہتا ہے۔ بچے ماں کو یاد کر کر کے تنہائیوں میں روتے مگر ایک دوسرے کے سامنے مکمل طور پر پرسکون ظاہر کرتے تھے۔ یہی حال سلیم کا بھی تھا سارا دن تو وہ اسٹور میں مصروف رہتا تھا مگر رات کو جب اپنے کمرے میں اکیلا ہوتا تو نتاشا کی یادیں اس کی نیند اڑا دیتیں۔ جب نتاشا تھی اس کے پاس تو وہ زاریہ کو دل ہی دل میں سوچتا رہتا تھا اس کے ساتھ کی گئی اپنی زیادتیوں پر پشیمان ہوتا تھا مگر اب نتاشا اس کے پاس نہیں رہی تھی تو اس کی یادوں کے زہریلے سانپ اسے ڈسنے لگے تھے، اب زاریہ کا خیال اس قدر نہیں ستاتا تھا کیونکہ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اسے اپنے کیے کی بہت زیادہ سزا مل چکی ہے۔ عابدہ چوہدری سے ملنے اکثر ویک اینڈ پر وہ بچوں کے ساتھ گجرات چلا جاتا تھا کبھی وہ بھی آجاتی تھی اس کے دونوں بیٹے تو لاہور ہی میں زیر تعلیم تھے پہلے وہ ہاسٹل میں رہتے تھے مگر سلیم کے اصرار پر وہ بھی ان کے ہاں ہی منتقل ہوگئے تھے ان کے تعلیمی اور ہاسٹل کے اخراجات تو ویسے بھی سلیم نے ہی اپنے ذمے لیے ہوئے تھے بلکہ نور کی پڑھائی کا خرچہ بھی وہی برداشت کرتا تھا۔ اس بے چاری کے پاس کہاں اتنے وسائل تھے کہ وہ اپنے بچوں کو اس قدر مہنگی تعلیم دلا سکے وہ تو اپنی پنشن اور کچھ شوہر کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے گھر کے اخراجات بہ مشکل پورے کر پاتی تھی۔ یہ تو سلیم اور سعودی عرب میں مقیم بھائی تھا جو اس کی باقاعدہ مدد کرتے تھے اور ان کا یہ احسان ہی تھا ورنہ فی زمانہ ایسے بھائی کہاں ہوتے ہیں اپنی شادیوں کے بعد تو بیٹے ماں باپ کو بھی بھول جاتے ہیں۔ ان کی مدد کرنے کے بجائے الٹا آبائی جائیداد وغیرہ میں سے اپنا حصہ بٹورنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ رہے بھائی بہن تو انہیں تو وہ اپنے ذہن اور زندگی سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتے ہیں مگر چونکہ عابدہ چوہدری نے بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے والدین کے انتقال کے بعد نہ صرف چھوٹے بھائیوں اور بہنوں کی پرورش کی تھی بلکہ اپنی استطاعت کے مطابق انہیں تعلیم بھی دلوائی تھی اور ان کی شادیاں بھی کی تھیں اس لیے سارے بھائی اور بہنیں اس کی بہت عزت کرتے تھے اور اس کے بچوں اور اس کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے اس طریقے سے اس کی مدد کرتے تھے کہ اس کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو اور اس کو شرمندگی کا احساس نہ ہو سکے عابدہ چوہدری اپنے بھائیوں کی احسانمند تھی کہ وہ اس کا اور اپنے بھانجے بھانجیوں کا اس قدر خیال رکھتے ہیں، اپنے دوسرے بیٹے سرفراز کے لیے تو اس نے سلیم کی بیٹی زاریہ کا سوچ رکھا تھا بلکہ ایک آدھ بار سلیم اور نتاشا سے اس سلسلے میں دبے لفظوں میں بات بھی کی تھی اگرچہ ان دونوں نے انکار تو نہیں کیا تھا بس یہ کہا تھا کہ زاریہ آپ ہی بیٹی ہے ابھی دونوں بچے بہت چھوٹے اور زیر تعلیم ہیں تعلیم مکمل کر کے ان کی مرضی کے مطابق کوئی فیصلہ کیا جائے گا کیونکہ آج کل کے پڑھے لکھے بچوں پر اپنی مرضی نہیں ٹھونسی جاسکتی۔ جواب میں اگرچہ عابدہ چوہدری نے کچھ کہا سنا تو نہیں تھا البتہ اس نے سرفراز کے ذہن میں شروع ہی سے یہ بات ڈال دی تھی کہ اس کی شادی زاریہ سے ہوگی۔ اور وہ بھی دل ہی دل میں زاریہ کو پسند کرنے لگا تھا۔ زاریہ میں سب سے زیادہ کشش یہ تھی کہ وہ برطانیہ کی شہری تھی۔ اور اس طرح اس کا برطانیہ جانے اور مستقل رہائش وہاں اختیار کرنے کا سپنا پورا ہوسکتا تھا۔ پھر جب وہ لوگ مستقل طور پر پاکستان لوٹ آئے تو اگرچہ اسے مایوسی تو ضرور ہوئی تھی مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ زاریہ کے پاس پاکستان کے ساتھ ساتھ برٹش پاسپورٹ بھی ہے اور شادی کے بعد وہ اسے اپنے ہمراہ برطانیہ لے جاسکتی ہے۔ اسی لیے وہ ماموں کی ہر بات مانتا تھا، ماموں کے کہنے پر ہی ہاسٹل چھوڑ کر ان کے گھر میں شفٹ ہوگیا تھا۔ اگرچہ اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس کی پڑھائی کے اخراجات اس کے ماموں برداشت کرتے ہیں کیونکہ عابدہ چوہدری اور اس کے بھائیوں کے درمیان معاہدہ تھا کہ بچوں کو کبھی اس بات کا علم نہیں ہونے دیا جائے گا ورنہ وہ ہمیشہ کے لیے احساس کمتری میں مبتلا ہوجائیں گے لیکن اب جبکہ اسے ماموں کے گھر میں رہنا پڑ رہا تھا تو اسے بھی وہ ماموں کا بہت بڑا احسان سمجھتا تھا اور اپنی دانست میں اس نے اس احسان کا بدلہ چکانے کا یہ طریقہ سوچا کہ کالج سے آنے کے بعد شام کو کچھ گھنٹے اسٹور میں بیٹھنے لگا۔ اگرچہ سلیم نے اسے بہت منع کیا مگر اس نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کردیا ''دیکھیے ماموں اس عمر میں آپ سارا دن اور رات کو بھی دیر تک اسٹور میں نہیں بیٹھ سکتے میری پڑھائی کا کوئی مسئلہ نہیں میں کالج کے بعد تین گھنٹے اپنے دوستوں کے ساتھ ہاسٹل میں ہی اسٹڈی کرلیتا ہوں پھر اسٹور پر بھی میں نے تو آفس ہی میں فارغ ہی بیٹھنا ہوتا ہے وہاں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا ہوں اس لیے پلیز آپ شام کو گھر میں آرام کیا کیجیے اس کے شدید اصرار پر سلیم مان گیا تھا اور وہ شام کو چھ بجے گھر آجاتا تھا اسے بے فکری تھی کہ اس کا بھانجا اس کے کاروبار کو اپنا ذاتی کاروبار سمجھ کر چلائے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ سلیم اس کی کارکردگی سے کافی مطمئن ہوگیا کیونکہ گھر میں بھی اس کی موجودگی ضروری تھی بچے اپنے تعلیمی اداروں سے واپس آکر کوچنگ سینٹرز میں چلے جاتے تھے جبکہ گھر مکمل طور پر نوکروں کے رحم و کرم پر تھا وہ جو چاہتے تھے کرتے رہتے تھے جو ان کی مرضی ہوتی وہ پکاتے تھے سارا دن گھر کے سیاہ سفید کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ من مانی کرنے کے عادی ہوگئے تھے اس پر سلیم نے ایک اور فیصلہ کیا کہ عابدہ چوہدری سے کہا کہ عورت کے بغیر اس کا گھر چلانا مشکل ہو رہا ہے پھر بچوں کی ذمے داریاں بھی پوری کرنا ماں کے بغیر کافی دشوار ہے جبکہ اس پر کاروبار کی ذمے داری بھی ہے دوسری طرف وہ بھی گجرات میں دو بچوں کے ہمراہ رہ رہی ہے تو کیوں نہ وہ لاہور شفٹ ہوجائے اور اس کے گھر کے اوپر والے حصے میں رہائش اختیار کرلے سلیم نے یہ بھی پیش کش کی تھی کہ وہ اپنی گجرات والی جائیداد فروخت کرکے اس کے اسٹور میں حصہ ڈال لے تاکہ اس طرح اس کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بن سکے کچھ تامل اور غور و فکر کے بعد عابدہ چوہدری کو بھائی کی تجویز مناسب لگی تھی۔

اپنے گھر کے اوپر والے دو کمروں میں اپنا سامان منتقل کرکے اس نے باقی گھر کو کرائے پر اٹھا دیا اور دونوں بچوں کے ساتھ لاہور آکر رہائش

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پذیر ہوگئی اس طرح دونوں بھائی بہن کے مسائل حل ہوگئے۔ فیروزہ نے نور کی گرومنگ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اسے ڈرائیونگ میں ماہر کروادیا اسپوکن انگلش کے کورسز کروا کر اسے فر فر انگلش بولنے کے قابل بنادیا پھر وہ اسے فیشن کے مطابق برانڈڈ ڈریسز لے کر دیتی تھیں پارلر سے اس کے بال جدید اسٹائل میں ترشوا دیتیں۔ مہینے میں دوبارہ خود اسے پارلر لے کر جاتیں یوں نور کا حلیہ ہی بدل گیا کہاں وہ عام سی شکل وصورت کی جھینپی جھینپی سی پینڈو وضع وقطع کی سیدھی سادی لڑکی اور کہاں نہایت دیدہ زیب ملبوسات زیب تن کرنے والی بنی سنوری انتہائی جاذب نظر نور پھر اب وہ کالج میں بے حد پاپولر ہوچکی تھی پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ جس جس ایونٹ میں سکندر حصہ لیتا، ان میں حصہ لینا نور کے لیے لازمی ٹھہرتا سکندر جب فائنل ائیر میں پہنچا تو نور تھرڈ ائیر میں پہنچ چکی تھی۔ اور وہ اس سے بھی زیادہ کالج میں مقبول تھی جہاں لڑکیاں اور اساتذہ اس کی صلاحیتوں کے معترف تھے تو وہیں ایک سے ایک بڑھ کر ذہین وخوبصورت اور اعلیٰ گھرانوں کے لڑکے اس کے پیچھے پیچھے پھرتے تھے۔ اس کی دوستی کے لیے مرے جاتے تھے مگر وہ کسی کو بھی لفٹ نہیں کراتی تھی بس پہلے سال کی جو چار لڑکیاں اس کی دوست بن گئی تھیں انہی کے ساتھ اس کی دوستی تھی پانچوں کالج میں اکٹھی نظر آتی تھیں۔ ایک دوسرے کے گھروں میں بھی آنا جانا تھا اکثر کمبائنڈ اسٹڈی بھی کرتی تھیں شاپنگ وغیرہ اور ہوٹلنگ کے لیے بھی ان کا گروپ اکٹھا ہی جاتا تھا غرضیکہ اس قدر ذہین خوبصورت لگنے کے باوجود اندر سے وہ وہی سیدھی سادی معصوم سی نور تھی جو فیروزہ جلیل کا اچھائی برائی میں تمیز کرنے اور اپنے ذہن کو ہر قسم کی برائیوں اور بد نامی سے بچا کر رکھنے کا دیا ہوا درس کبھی فراموش نہیں کرتی تھی شاید وہ اپنے ظاہر میں اتنی زیادہ تبدیلی بھی نہ کرتی مگر سکندر نے اسے ٹھکرا کر اس کی انا کو مجروح کر کے اس میں ضد پیدا کردی تھی بہتر سے بہتر بننے کی... جبکہ سکندر کا نام آئے روز کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ لیا جاتا وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنا پھرتا مگر آج تک کسی لڑکی کے لیے اس نے سنجیدگی سے سوچا ہی نہ تھا۔ نہ ہی وہ ابھی عشق ومحبت اور شادی بیاہ کے بکھیڑوں میں پڑنا چاہتا تھا اس کے ارادے تو بہت بلند تھے اور جب تک وہ ایک بڑا اور کامیاب ہارٹ اسپیشلسٹ نہ بن جاتا اس نے کسی اور کی طرف دھیان نہ دینے کا دل میں مصمم ارادہ کر رکھا تھا اگرچہ لڑکیوں کے ساتھ دوستیاں بھی کرتا تھا ان کے ساتھ ڈیٹیں بھی مارتا ہوٹلنگ بھی کرتا تھا مگر سب کو ایک حد تک ہی رکھتا تھا لڑکیاں خود ہی اس سے مایوس ہوکر پیچھے ہٹ جاتیں تو اور بات تھی۔ مگر خود نہ تو کسی لڑکی کو خود سے بہت زیادہ قریب کرتا تھا نہ ہی کسی کی دوستی اور اظہار محبت کو ٹھکراتا تھا مگر کوئی بلند بانگ دعوے نہیں کرتا تھا اور نہ ہی شادی کے وعدے وعید بلکہ لڑکیوں کو بھی ایسے ہی دوست سمجھتا تھا جیسے لڑکوں کو۔

نور کے ساتھ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی پہلے روز کی طرح ایک گھر میں رہنے اور ایک ہی کالج میں زیر تعلیم ہونے کے باوجود وہ اس سے لیے دیے رہتا تھا عام ہلکی پھلکی بات چیت اور ہیلو ہائے کے علاوہ دوسری بات نہیں کرتا تھا نہ کبھی اس کے سراپے کو ستائشی انداز سے دیکھتا نہ کبھی اس کی کامیابیوں کو سراہتا۔ نور کی سہیلیاں حیران ہوتیں کہ یہ شخص کس مٹی سے بنا ہوا ہے جس پر کسی کی خوبصورتی اور شخصیت کا جادو نہیں چلتا تھا اور خود ہر وقت دوسروں سے داد سمیٹتا رہتا تھا اصل میں ماں اور فیروزہ جلیل کے بہت زیادہ لاڈ پیار اور پھر اپنی شاندار سحر انگیز شخصیت کی وجہ سے وہ خود پسند ہوچکا تھا۔ نرگسیت کا شکار تھا وہ اپنی ذات کے علاوہ کسی کو کچھ گردانتا ہی نہیں تھا اس کا چھوٹا بھائی اور دونوں بہنیں نور سے بہت زیادہ اٹیچڈ ہوچکے تھے۔ آپس میں ہنسی مذاق کرتے۔ اکٹھے کھانا کھاتے۔ سیر سپاٹے کے لیے ادھر ادھر چلے جاتے مگر سکندر کبھی بھی ان لوگوں کی کمپنی میں نہیں بیٹھتا تھا اسے تو کئی کئی روز گزر جاتے گھر والوں سے بات چیت کیے بھی پھر آخری دو سالوں میں چونکہ پڑھائی کا زیادہ بوجھ ہوتا ہے اس لیے وہ صبح کا گھر سے نکلا رات گئے ہی گھر آتا تھا۔ پھر جب وارڈز کی ڈیوٹی ہوتی تو رات کو بھی گھر نہ آتا۔ امتحانات کے قریب تو وہ دوستوں کے ساتھ گروپ اسٹڈی کرنے کے لیے ہاسٹل میں شفٹ ہوجاتا تھا۔

دوسری طرف نور تھی کہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔ عابدہ چوہدری نے اسے یہاں بھیجنے سے پہلے ہی اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ اسے ہر صورت میں سکندر کو اپنی محبت میں گرفتار کر کے اس سے شادی کر کے اس خاندان میں صحیح طور پر اپنی جگہ بنانی ہے۔ شروع شروع میں تو وہ ماں کی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھتی تھی ویسے بھی اسے اپنی نئی نئی پڑھائی اور اپنی شخصیت کو نکھارنے سنوارنے ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ مگر پھر رفتہ رفتہ سکندر کی سحر انگیز شخصیت نے اسے اپنا گرویدہ کرلیا وہ اتنی محنت اس لیے کررہی تھی کہ سکندر کے معیار پر پوری اتر سکے رات رات بھر جاگ کر پڑھتی اور دوسری سرگرمیوں میں محض سکندر کی توجہ کا مرکز بننے کے لیے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتی مگر اس پتھر کے صنم پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا گھر میں بھی وہ کوشش کرتی کہ چھٹی والے دن سکندر کی پسندیدہ ڈشز بنائے عموماً اتوار کو رات کا کھانا سب گھر والے مل کر کھاتے تھے اور فیروزہ جلیل جب سکندر کو بتاتیں کہ نور نے آج خصوصی طور پر کھانا تیار کیا ہے تو وہ ایک سرسری سی نظر نور پر ڈال کر رسمی شکریہ ادا کرتا اور خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف ہوجاتا۔ اس کی اس بے اعتنائی پر نور دل مسوس کر رہ جاتی اور دل ہی دل میں عہد کرتی کہ آئندہ وہ اس بے حس شخص کی خاطر گھنٹوں کے حساب سے خود کو کچن میں ہلکان نہیں کرے گی۔ مگر اگلے اتوار کو وہ پھر سب کچھ بھول بھال کر سکندر کی دونوں بہنوں کے ساتھ مل کر کوکنگ پروگراموں سے سیکھی ہوئی نئی نئی ڈشز بنا رہی ہوتی۔

نور کو یقین تھا کہ اس کی خاموش اور پرخلوص چاہت ایک روز ضرور رنگ لائے گی اور سکندر بھی اسے یونہی ٹوٹ کر چاہنے لگے گا۔ کیونکہ اس کی لگن سچی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ یک طرفہ محبت کا انجام بہت عبرت ناک ہوتا ہے مگر کسی کو چاہنا، پسند کرنا اپنے بس ہی میں کہاں ہوتا ہے نہ ہی محبت منصوبہ بندی کر کے کی جاتی ہے یہ تو وہ پودا ہے جو دلوں کی زمین پر خود بخود اگ آتا ہے اور تب خبر ہوتی ہے جب یہ آکٹوپس کے پنجوں کی مانند روح وقلب کو جکڑ چکا ہوتا ہے۔ یہی حال نور کا تھا۔

☆......☆

منگنی کے چند ماہ بعد نہایت دھوم دھام سے شہروز اور راحیلہ کی شادی ہوگئی چونکہ پہلے ذیشان اور زاریہ کی شادیاں ان کے والد کی بیماری کی وجہ سے نہایت سادگی سے ہوئی تھیں تب گھر کے مالی حالات بھی زیادہ مستحکم نہیں تھے اس لیے کسی قسم کی دھوم دھام کی گنجائش ہی نہ تھی چنانچہ اب شہروز کی شادی پہ زاریہ اور عامرہ بیگم نے اپنے دل کے تمام ارمان پورے کیے راحیلہ کے لیے بے حد خوبصورت اور قیمتی ملبوسات، زیورات کے سیٹ اور بیش قیمت عروسی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ملبوسات تیار کرائے گئے ولیمے کا فنکشن ایک مشہور شادی ہال میں منعقد کیا گیا مہندی اور مائیوں کی رسمیں بھی بڑے زور شور سے ادا کی گئیں۔ غرضیکہ پورے خاندان میں یہ شادی مثالی اور بھرپور تھی۔

راحیلہ کے والدین نے بھی بیٹی کی شادی کا انتظام ایک بڑے ہوٹل میں کیا تھا دیگر رسموں میں دل کھول کر پیسہ خرچ کیا بیٹی کو جہیز میں ضرورت کی ہر چیز دی تھی اس کے علاوہ دولہا کو قیمتی گھڑی موبائل تھری پیس سوٹ اور دو قیمتی سوٹ، شوز، ٹائی، ڈائمنڈ رنگ وغیرہ دیے تھے باقی سسرال والوں کو بھی خوبصورت فینسی سوٹ اور ماں بہن کو سونے کی بالیاں دی گئیں تھیں۔ سبھی ملنے جلنے والے اور عزیز و اقارب حیران رہ گئے کہ ان لوگوں کے پاس کہاں سے اتنا پیسہ آ گیا بات تھی بھی ٹھیک تھی کیونکہ زاریہ کی ملازمت اور شہروز کی بینک کی نوکری ہی تو تھی کوئی اور جائیداد اور کاروبار تو تھا نہیں مگر اصل بات تو زاریہ اور شہروز ہی جانتے تھے کہ کس طرح انہوں نے اس مقصد کے لیے کئی سال تک پیسے جمع کیے تھے۔ شہروز اور زاریہ نے بینک سے اور کالج سے قرضہ بھی لیا تھا

شہروز کا کمرہ اوپر تھا اس لیے راحیلہ کا جہیز کا سارا سامان زاریہ نے اوپر والے پورشن میں ہی رکھوا دیا تھا اس کا ٹی وی اوپر والے ٹی وی روم میں رکھ دیا گیا صوفہ سیٹ اور ڈائننگ ٹیبل اور برتنوں کی الماری وغیرہ بھی اوپر ہی سیٹ ہو گئی تھی ایک شہروز کے کمرے میں ڈبل بیڈ ڈریسنگ ٹیبل اور ٹو سیٹر صوفہ رکھ دیا گیا۔ نئے پردے بھی اوپر والے پورشن میں لگوا دیے گئے بیڈ روم میں اے سی بھی لگوا دیا اور تینوں کمروں میں وال ٹو وال کارپٹنگ بھی کروا دی گئی فریج مائیکرو ویو اوون، اور دوسرا الیکٹرک کا سامان کچن میں سیٹ ہو گیا چنانچہ راحیلہ کو پہلے دن ہی سجا سجایا ایک الگ گھر مل گیا زاریہ اور عامرہ بیگم نے بھی یہی کہا کہ کل جو لڑ جھگڑ کر علیحدہ ہوتا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ شروع ہی سے شہروز اور راحیلہ اپنے الگ پورشن میں رہیں انہوں نے تو یہاں تک پیش کش بھی کی کہ اگر راحیلہ اور شہروز چاہیں تو اپنا کھانا پینا بھی الگ کر سکتے ہیں مگر شہروز نے اس بات کو پسند نہیں کیا بلکہ اس نے راحیلہ کو سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ زیادہ تر وقت نیچے امی کے پاس ہی گزارا کرے کیونکہ شہروز زاریہ اور سحرش یوں بھی آٹھ بجے گھر سے نکل جاتے تھے شہروز زاریہ اور سحرش کو کالج چھوڑ کر خود بینک چلا جاتا تھا اور اسکی واپسی سات آٹھ بجے ہی ہوتی تھی اس وقت تک راحیلہ نیچے ہی رہتی تھی اگرچہ شادی کے بعد زاریہ اور عامرہ بیگم نے شہروز سے بہت کہا کہ وہ راحیلہ کو گھمانے پھرانے کے لیے کچھ دنوں کے لیے جہاں مرضی ہو چلا جائے مگر شہروز نے انکار کر دیا تھا دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ زاریہ کو اپنی محرومی کا احساس ہو حالانکہ وہ اس نیچر کی انسان نہیں تھی اپنی شادی کے حادثے کو اس نے ایک بھولی بسری داستان سمجھ کر بھلا دیا تھا اور اسے تو اب یاد ہی نہ رہا تھا کہ اس کی کبھی شادی بھی ہوئی تھی۔ تب سے اب تک اس کا چار مختلف کالجوں میں ٹرانسفر ہو چکا تھا اور اس کے نئے کالج والی اسٹاف ممبرز کو تو علم ہیں نہیں تھا کہ میڈم زاریہ کی شادی بھی ہوئی تھی۔ یا نہیں کیونکہ وہ خود کو مس لکھتی اور کہلواتی تھی اب اس کی عمر تقریباً پچاس سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ اور وہ خاصی سینئر اسٹاف ممبر تھی اپنے ڈیپارٹمنٹ کی ہیڈ تھی اس لیے اب وہ بہت کم دوسرے اسٹاف کے ساتھ فری ہوتی تھی اسٹوڈنٹس کے ساتھ بھی ٹو دی پوائنٹ رہتی تھی انہیں پڑھایا پریکٹیکل کرایا اور بس البتہ اس کی غیر موجودگی میں کچھ بد فطرت قسم کی خواتین الٹی سیدھی باتیں کرتی تھیں کیونکہ چند ایک کو اس بات کا علم تھا کہ ماضی میں

اس کی مختصر عرصے کے لیے شادی ہوئی تھی مگر زاریہ اس شادی کا ذکر نہیں کرتی تھی کبھی کسی نے پوچھ لیا تو مختصر یہی کہتی تھی کہ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ آج کل وہ جس کالج میں پڑھا رہی تھی اس میں چند سینئر اسٹاف ممبرز اس کے سابقہ کالج کے تھے اور وہ لوگ اس کی شادی اور طلاق کے بارے میں بخوبی جانتی تھیں انہوں نے ہی دوسری ٹیچرز کو بھی اس کے متعلق بتایا تا چنانچہ اس طرح یہ بات اس کالج میں بھی پھیل گئی تھی حالانکہ زارایہ نے دانستہ اس بات کو نہیں چھپایا تھا اس نے تو اسے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ اپنی دکھ بھری داستان ہر ایک سے بیان کر کے لوگوں کی جھوٹی سچی ہمدردیاں سمیٹے ویسے بھی وہ تو بس یہی کہتی تھی کہ وہ غیر شادی شدہ ہے اور ظاہر ہے موجود وقت میں تو ایسے ہی تھی۔ اب کیا وہ یہ کہتی کہ وہ مطلقہ ہے پھر لوگ پوچھتے اوہو چہ چہ کیسے طلاق ہوئی؟ کیوں ہوئی وغیرہ وغیرہ اور زاریہ جیسی کم گو اور لیے دیے رہنے والی خاتون کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ہر ایک کو ان سوالات کے جواب دے کر اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹے، اپنے سابقہ شوہر کی دھوکے بازی کی کہانی رو رو کر سنائے۔

زاریہ اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ کچھ چھوٹے ذہن کی خواتین اس کے بارے میں کس انداز میں اظہار رائے کرتی ہیں کیونکہ کوئی نہ کوئی اس تک ہر بات پہنچا ہی دیتا تھا مگر وہ ایسی باتیں سنی ان سنی کر دیتی تھی اس نے کبھی بھی لوگوں کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں کی۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہر شخص اپنی فطرت اور ذہنی سطح کے مطابق بات کرتا ہے۔ نہ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی تھی نہ برائی سن کر طیش میں آتی تھی۔

☆......☆

غزل

درد سے خود کو سوا رکھا ہے
زخم سینے میں چھپا رکھا ہے

اس کی آنکھوں سے نہ بکھرے کاجل
اشک آنکھوں میں بچا رکھا ہے

تیری یادوں سے ہمیشہ میں نے
اپنا گھر بار سجا رکھا ہے

رات کے جاگے ہوئے لوگوں نے
عشق کا روگ لگا رکھا ہے

آج بھی دل کے شبستاں میں ہنوز
صرف تجھ کو ہی بسا رکھا ہے

کیوں ملاقات نہیں کرتے ہو
اس کو کس دن پہ اٹھا رکھا ہے

اے خوشی دیکھ مرے دامن میں
سارا کچھ تیرے سوا رکھا ہے

ٹوٹ کے میں نے جسے چاہا سہیل
اک اسی نے ہی بھلا رکھا ہے

☆

شاعر: سہیل عصری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

افسانہ

غزالہ رشید

دلِ بسمل

امّاں سرداراں بھی سمجھ گئی تھی کہ جو دل مکئی کا ساگ اور تنور سے اترتی روٹی دیکھ کر بے قابو ہو جاتا ہے اس کی باتوں میں کیا آنا... محبت تو بس اپنے رب سے کرنی چاہیے کیونکہ یہ محبت بندے کو ذلیل نہیں کرتی...

اسے تو سوال کی عادت تھی، کبھی اسائنمنٹس بناتے بناتے، ساری کتابیں بند کر کے، وہ اباجی کی لائبریری میں ان کے سر پر جا کے سوار ہو جاتی، اس نے بھلا یہ کب سوچا کہ وہ اس وقت اپنے کسی ایسے

ام میں مصروف ہوں، کہ ان کا قلم رک جائے، ذہن ن مع خیالات منتشر ہو جائیں، اسے کسی بات کی ان دنوں پروا ہی کب تھی، سوالوں کے جوابات کے لیے، اسے اباجی یاد آتے، وجہ یہ تھی ناں اس کی...... نہ جھنجلاتے، نہ کوئی کتاب کھولتے، قلم رکھتے، چشمہ اتارتے، آنکھوں سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے اور جب وہ کمرے سے نکلتی تو مطمئن ہو جاتی یہ ہنر اسے بھی سیکھنا تھا، مطمئن کرنے والا، سوالوں کے جواب تو اسے بھی آتے تھے، لیکن مطمئن کرنا، ہائے...... یہ ہنر وہ کس ادارے سے جا کر سیکھتی...... وہ پھر ماضی کے چراغ سے حال کے دھیمے دھیمے انداز میں روشن کرنے لگی۔ سوالات دل و دماغ میں ہر وقت شور مچائے رکھتے تھے۔

''اباجی، ہندو متھالوجی (قصے) Mythology یا یونانی دیو مالائی قصے Mythology ہیں تو یہ جو آپ اسلامی قصے سناتے ہیں، ان سے ہم کیا سیکھتے ہیں؟''

اباجی مسکرائے، اطمینان کے ساتھ بولتے رہے ''ہمارے اولیاء کرام کے ایسے بہت سے قصے ہیں جن کو ہم کشف و کرامات کہتے ہیں، وہ اپنی جگہ پہ بیٹھے بیٹھے کسی اور مقام کی خبر دے دیتے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، کیونکہ رب کی قدرت کسی سے چھپی نہیں رہتی۔ اگرچہ کسی نے خود تو ہو سکتا ہے اس پر کام نہ کیا ہو لیکن محقق یا سائنس دان کے سامنے ایسے واقعات یا قصے ایسے پے در پے آئے کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر یہ ہے کیا؟ رب تو اپنی باتوں کو خود ہی ثابت Prove کروا لیتا ہے۔ اسے تم اپنی سمجھ سے مزید سیکھنے کا کام کر سکتی ہو کہ اس قصے سے جو تم نے سیکھا، اسے اپنے دوستوں، پیاروں تک ضرور پہنچاؤ، پریوں کے قصے نہیں انبیا کے قصے سنائے، علم لدنی کی خوشبو وہ ہر سو خود پھیلاتا ہے، بات تو سمجھنے کی ہے ناں۔'' ابا جی نے چشمہ دوبارہ آنکھوں پر لگا لیا۔ وہ زندگی کے چشمے سے اب ان ہی واقعات کی روشنی میں کبھی خوشی اور کبھی اداس ہونے لگی تھی۔

☆......☆

امّاں سرداراں، آپ نے فیصلہ کر لیا ہے، واپس گاؤں جانے کا؟'' وہ بے حد افسردہ ہو رہی تھی۔ وہ پچھلے دس پندرہ سال سے اس کے گھر میں کام کرتی تھی اس وقت وہ بات بھی کرنا پسند نہ کرتی۔ عبادت کی طرح کام کیا کرتی' وہ حیران ہوتی کیونکہ یہ تعلق سالوں پہ محیط تھا اور ان کے بچوں نے دیارِ غیر میں گھر بنا لیے تھے، اس لیے اسے بھی اکثر ملک سے باہر جانا پڑتا۔ وہ اپنے کالج کی سالانہ چھٹیوں میں جب اسے گھر کی چابی دینا چاہتی تو وہ ہاتھ جوڑ کر منع کرتی۔

''نہیں باجی، یہ بوجھ نہ ڈال، میں اپنی قسم کھا سکتی ہوں، لیکن میرے ملنے والے آئیں تو خود پنکھے میں بیٹھ کر ان کو پانی پلا کے کیسے رخصت کر دوں، مجھے تو گاؤں جانے کی اجازت دے، آ جائے تو واپس آ جاؤں گی۔ خبر کر دینا۔ نمبر تو ہے نا میرا'' وہ یہ کہہ کے اٹھ کر چل دیتی۔

شروع شروع میں تو روزینہ علوی کو بہت غصہ آتا لیکن پھر اباجی کی کہی وہ بات یاد آ جاتی زندگی بھر باتیں ہی تو ہمارا پیچھا کرتی ہیں۔ آسیب بن جاتی ہیں۔ دوسرے کو غلام نہ سمجھو۔ نہ جانے وقت کب تمہیں کسی اور کی غلامی میں دے دے۔''

وہ اس سال بھی خاموش ہو گئی...... بھلا کیا جانتی تھی کہ اس کی امّاں سرداراں سے بھی آخری ملاقات ہو گی۔ ملاقات کے آخری لمحوں میں اس کی وہی ایک بات تھی۔

''باجی محنت کی کمائی سے اپنے گاؤں میں مسجد بنانی ہے۔ آپ کوئی اور بات کریں نہ کریں...... بس میرے صندوقچے کی حفاظت کریں اس میں ساری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کمائی، اللہ کے گھر کے لیے ہے آپ پر یقین ہے۔ آپ امانت میں خیانت کرنے والے نہیں ہو بس یہ سنبھال کے رکھ لیں۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

وہ بھلا کیسے انکار کرتی۔ خاموشی سے اس کی لکڑی کی صندوقچی کو امانت سمجھ کے محفوظ کر لیا۔

اباجی کے بعد تو لگتا تھا کہ صرف رشتوں کو ہی امانت کی طرح سنبھال رہی تھی، خواہ وہ کیسا ہی سلوک کیوں نہ روا رکھیں۔ البتہ رقم جمع کرنا اسے کبھی نہ آیا۔ پتا نہیں کیوں...... یہ ہنر وہ سیکھ نہ پائی۔ وہ اس کے کینیڈا جانے سے دو دن پہلے رخصت ہو گئی۔ اس کا یقین......اور اپنی مصروفیات میں، وہ شاید کچھ بھول رہی تھی......کیا......؟؟

☆......☆

اماں سرداراں کے کیے گئے فیصلے سے بھلا کس کی جرات تھی کہ وہ انکار کے لفظ کو زبان پر لانے کی ہمت کر سکے' اس کے فیصلے ایسے ہی اٹل ہوتے تھے۔ پتا نہیں اس کا دل پتھر تھا یا زبان کڑوی، لیکن دل محبت سے لبریز۔ تب ہی تو خاندان بھر، اس کو مناتا، کبھی ناراض نہ ہونے دیتا۔ اس نے کچھ سال پہلے جو مسجد کے لیے زمین خرید لی تھی اب تو وہ اور بھی باعزت اور بااختیار تھی۔

☆......☆

''اف بااختیار ہونا بھی کتنا ضروری ہے۔'' رات سے حمیدہ کئی بار سوچ چکی تھی، لیکن اس کی پھوپو سرداراں نے اس بار گاؤں آتے ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا تھا، جیسے وہ گاؤں جب آتیں تو اپنی سبزی کی دکان کو پھر سے سنبھال لیتی، جس طرح سبزے کے ٹھیلے پہ سبزیوں کے دام، اپنی مرضی سے طے کرتی، کسی کی نہ سنتی تھی اور اگر شاید سنتی بھی تو اس کی خبر حمیدہ کو نہ تھی۔ ساون بھی شاید اس کے ساتھ ساتھ اس کے درد کو محسوس کر رہا تھا، جب ہی تو برسے ہی جا رہا تھا۔ وہ جو اِن موسموں میں کھل کر سرسوں کے پھول کی طرح ہو جاتی، اس بار تو اس کا مسکرانے کو بھی جی نہ چاہتا تھا...... بھلا کیسے مسکراتی......

اک تو سجن میرے پاس نہیں
دوجے ملن کی کوئی آس نہیں ہے
اس پہ یہ ساون آئے شور مچائے
لمبی جدائی۔ ہائے لمبی جدائی

☆......☆

وہ کوئی ایسی عاشق مزاج تو نہ تھی کہ گاؤں کے پتنگ اڑاتے' لٹو سے کرتب دکھاتے یا شادیوں پر بھنگڑا کرتے ہر لڑکے کو دیکھ کر دل ہار بیٹھتی' بات تو بچپن کے صرف اس کھیل کی تھی جب گھر گھر کھیلتے ہوئے وہ دلہن بنتی، تو وہ ہمیشہ پھوپھو سرداراں کے ہی تو دوپٹے کی بڑی سی پگڑی باندھے اس کے سامنے آ جاتا تھا۔

جب گیلی گیلی مٹی پہ اس کی جوتی خراب ہو جاتی، تو وہی تو تھا، جو پھر سے بھاگ کر اس کی نئی جوتی دھو کر لا کے دیتا۔ اور تو اور بھٹی کے دانے گرم گرم خوشبو والے ہمیشہ ٹھنڈے کر کے' اس کے منہ میں ڈالتا۔ اس کی ننھی ہتھیلی پہ کبھی گرم دانے نہ دھرتا کہ اس کی ہتھیلی نہ جل جائے۔

بات تو محبت کی تھی۔ پیار کی۔ انسیت کی۔
کبھی چار لفظی' کبھی پانچ لفظی کہانی لیکن عمروں کا روگ دے جاتی ہے...... تعلق چاہے کتنا بھی گہرا ہو، شروع سادہ ہی لفظوں سے ہوتا ہے...... کسی بھی معاشرے میں دیکھ لیں

I love you

تم سے محبت ہے

پیار ہے تم سے

حمیدہ کا دل بھی کب پردیسی ہوا، اسے پتا ہی نہ چلا لیکن اب کیا کرے، کیسے انکار کرے...... کیسے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لی اور کی ہو جائے...... اماں بھی تو سب جانتی ہے اور پھوپھو سرداراں بھی!!! وہ روتی اور شکوے کرتی رہتی، کبھی ماں سے، کبھی رب سائیں سے......

☆......☆

''اماں! تو بھی ناں، پھوپھو سرداراں سے ڈرتی ہے۔'' وہ اماں کے سر میں تیل کی مالش بھی کرتی رہی۔

''زیادہ فضول باتیں نہ کر، کیوں سارے خاندان میں ذلیل کرانے پر تلی ہے۔ کوئی کام شام بھی کر لے۔ شادی کرنے دا شوق ہی ہوندا اے، پھر لا کے واپس گھر بٹھا دے گا، دکھ بیماری میں۔''

اماں نے بیزاری سے سر جھٹکا، چل رہن دے، مجھے تیل نہیں لگوانا۔'' اس کا انداز دل دکھا دینے والا تھا۔

☆......☆

پندرہ سال بڑا تھا فضل دین، لیکن سارا گھر خوشی خوشی اس کے آگے پیچھے پھرتا رہا، اماں سرداراں نے بھی حق ادا کیا، پورے خاندان کے لیے کھانا بنوایا، تو بھلا کون تھا جو خوش نہ ہوتا۔ سب ہی کو فضل دین شہزادہ لگنے لگا۔ سوائے اس کے۔ وہ روتی پیلے دوپٹے میں بھی اور گوٹے والے سرخ دوپٹے میں بھی......

رات بھی وہ دیر تک چادر میں منہ چھپائے روتی رہی وہ بھی دھم سے خیالوں میں آ کے بیٹھ گیا۔ وہ ہچکیاں لیتی رہی ''ہائے سوہنڑے بشیر کاش تو مجھ سے بیس سال بڑا ہوتا۔ میرا ہم عمر کیوں تھا...... کیوں تھا، میرے ہی جیسا...... بھولا...... سیدھا...... کھلنڈرا۔ وہ ساری رات سو نہ سکی...... پھر نیند آ ہی گئی اور بشیر بھی صرف خوابوں ہی میں رہ گیا۔

☆......☆

اماں تو شاید چپ رہتی لیکن پھوپھو سرداراں نے غور سے اسے دیکھا، جانے اماں سے کیا کہہ کے گئی کہ اماں نے جاتے ہی اسے آ لیا۔

''دیکھ حمیداں زیادہ ہیر بننے دی کوشش نہ کر'' اماں کا غصہ عروج پر تھا۔ تیرا باپ کماتا نہ تھا، پھوپھی ہی شہر سے پیسہ بھیجتی تھی، اتنا اچھا کمانے والا ملا ہے، جب گھومنے پھرنے جائے گی تو بشیر کیا، ہمیں بھی بھول جائے گی۔'' اماں نے آٹا گوندھتے ہوئے کہا۔

☆......☆

پھوپھو سرداراں بھلا کیوں کسی کی سنتی، وہ بھی کمزور سا احتجاج۔ اسے بھلا کون سنتا۔ کون اس کا ساتھ دیتا۔ وہ اداس ہی رہنے لگی تھی، مسکراتی بھی تو آنکھیں بھیگ جاتیں۔ اماں نے بھی شادی کی بات خود ہی پھوپھو سرداراں سے کی تھی اور پھر مایوں بیٹھی پیلے جوڑے میں، سر جھکائے حمیدہ سے کہا تو اس کی آواز میں بھی نمی تھی۔

''خاندان کی سردار ہے اب وہ بہت دکھ جھیلے ہیں اس نے بھی۔ جو آج دل سخت کر کے فیصلے کرتی ہے۔ دیکھ لینا، جب تیرا ہوتا سوتا بھی، اور کچھ نہیں تو کم از کم وہاں جا کے نماز قرآن تو پڑھ لے گا، مجھے اس عمر میں ذلیل نہ کروانا''۔ لو بھلا ذلیل ہو گئی، اماں میری خاموش محبت سے۔'' وہ ہاتھ پہ ماسی صغراں سے مہندی لگواتی رہی، روتی رہی اور پھر اس نے دل ہی دل میں بشیر کو خدا حافظ کہا اور خود سے بھی روتے روتے وعدہ کر لیا'' ہائے اماں تو بھی خوش رہ اور میرا بشیر بھی...... میری وجہ سے بھلا کیوں کوئی ذلیل ہو، دکھی ہو...... سر جھکتا گیا...... دل بھی سنبھلتا گیا۔

☆......☆

ڈھولک کی آواز پھر ڈھول کی آواز اور پھر رخصتی کے گانے، بشیر کے دل کو چیرتے گئے، لیکن وہ بھی کس منہ سے اماں سے کہتا، کیسے رشتے کی بات کرتا، ابھی تو بڑے بھائی کی شادی کا خرچہ، قرضہ سر سے نہ اترا تھا اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پھر بھابی کو ہر وقت ہی اماں کے طعنے سہنے پڑتے، جب وہ میکے جانے کے لیے بھائی سے لڑتی وہ بھلا حمیدہ کو کیسے گھر لاتا جو بات بات پر اپنی بھولی سی صورت لیے غصہ کرتی، سہیلیوں سے شکوے کرتی

''بشیر اماں کہتی ہیں میں شہزادی ہوں، شہزادہ ہوگا، جو ڈولی لے کے آئے گا۔'' اور بشیر، اس کی تو ابھی نوکری بھی نہ لگی تھی۔

اماں سرداراں نے مسجد کا کام کراتے وقت اسے پہلے تو اینٹیں اٹھانے پر رکھا پھر اینٹیں لگانی بھی وہ سیکھ گیا تھا تو انہوں نے اسے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ اب اسے وہ سبزی کی دکان پر بھی بٹھانے لگی تھی۔ مسجد کے لیے پانی کی ٹنکی بنوانے کے لیے وہ بھی پیسے جمع کر رہا تھا، اس کی مٹی کی گلک بھرتی جا رہی تھی، دل بھی اب قابو میں آتا جا رہا تھا۔ اب بھلا کیسے دل کا حال ملازم، مالک سے کہتا، وہ تو بچپن سے کہنا تھا' اور وہ تو اس سے بھی نہ کہہ پایا...... اور وہ اس کی بچپن کی سہیلی دوست' محبت یا عشق...... یا پھر کچھ بھی نہ تھا اور بہت کچھ تھا...... وہ بس سوچتا رہا...... اور بار بار فیروز الدین کی دکان میں لگے ٹیلی ویژن پر یہ گانا سنتا...... اس کی آواز اور شاعری اسے اپنے دل کا درد جو لگتی تھی

تینوں ویکھے بنائیں جی لگدا
محلے وچوں کوچ نہ کریں
(تجھے دیکھے بغیر دل نہیں لگتا
محلے سے کوچ نہ کرنا)

☆......☆

بھلا کون رکتا ہے کسی کے کہنے سے، حمیدہ بھی دینا پور کوچ کر گئی اور وہ اماں سرداراں کے سامنے سر جھکائے سبزی تولتا اور مسجد کی دیوار بنانے میں ٹھیکیدار نیر زئی کی مدد خلوص دل سے کرتا رہا، اس جیسے اور نوجوان بھی اس نیک عمل میں شامل ہوتے گئے...... اور اماں سرداراں نے واپس شہر جانے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا...... اس کا خواب جو پورا ہونے والا تھا۔ وہ خواب جو اس نے دنیاداری اور دنیا کی بے وفائی کو سہنے کے بعد دیکھا تھا۔

☆......☆

روزینہ علوی کو اس بار اماں سرداراں کی واپسی سے کوئی خاص خوشی نہ ہوئی، وہ اس کی تنخواہ دیتے ہوئے اداس بھی تھی، اسے اباجی کی بات آج کچھ زیادہ ہی شدت سے یاد آئی۔ آج اماں سرداں نے صندوقچی بھی واپس مانگ لی اور پندرہ سال رفاقت کو بھلا کے جدائی کی بھی خبر دی۔ اسے اب عادت تھی فیصلے پہ رہنے کی۔ اسے کوئی واپس نہ بلا سکتا تھا۔ روزینہ نے بھی اجازت دے دی۔ بادل نخواستہ ہی سہی۔

''باجی جس مقصد کے لیے آپ کے پاس رقم جمع کرتی رہی اب تو اس کے پورا ہونے کا وقت ہے آپ ٹوپیاں، تسبیح اور سپارے میرے لیے جمع کرتی تھیں...... اب تو میں صرف وہ ہی لینے آئی ہوں۔ اب میرے گاؤں کے بچے، قرآن بھی پڑھیں گے' انشاء اللہ نماز بھی...... میں نے وہیں سبزی کی دکان بنالی ہے۔ آپ سے ملنے آؤں گی۔''

اس نے محبت سے روزینہ علوی کا ہاتھ تھاما۔ وہ اکیلی ہوگئی لیکن روکنے کے لیے الفاظ ہی کہاں تھے۔ اماں سرداراں اب عمر کے اس حصے میں تھی شاید اس سے زیادہ پریکٹیکل تھی۔

اباجی کہتے تھے کسی دانا نے کیا خوب کہا ہے:

''جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اماں سرداراں نے بھی کچھ ایسا ہی سفر اختیار کیا تھا۔

☆......☆

حمیدہ اس بار گاؤں آئی تو بڑی کھلی کھلی سی تھی فضل دین کی توجہ اور محبت کے سارے رنگ اس کا روپ بن گئے تھے۔ وہ تارے گن رہی تھی، اب موبائل کا زمانہ تھا فضل دین اسے مسیج کرتا تو وہ کبھی موتیا کی طرح مہکتی اور کبھی گلاب بن جاتی۔ سارے رنگ مہک رہے تھے۔

اسے دیکھ کر اماں مسکرائی اور پھر پھوپھو سرداراں نے بھی اس کے ہاتھ میں کچھ پیسے دیئے اور کہا جاتے ہوئے میاں کے لیے کوئی سوغات لے کے جانا اور ساس سسر کے لیے بھی۔''

''انہوں نے مجھے پیسے دیئے ہیں۔'' وہ شرمائی۔

''اس کے پیسوں سے اپنے لیے جوڑا بنانا۔''

پھوپھو سرداراں نے اماں کی طرف دیکھا اور دونوں ہنس پڑے۔

☆......☆

اماں سرداراں بھی کبھی حمیدہ ہی جیسی تھی۔

سراج تیلی اسے دیکھتا تو اس کی روح معطر ہو جاتی، بڑی دعائیں کرتا...... اسے مل جائے میری سرداراں لیکن کیا کرتی بچپن کی منگ کے ساتھ وٹے سٹے میں تو جانا ہی تھا۔ وہ رخصت ہوگئی لیکن لے جانے والا کیا جانتا تھا کہ اس کا ایکسیڈنٹ تین بچوں کی پیدائش کے بعد ہی ہو جائے گا۔ غربت نے تو گھر کا پتا یاد کر لیا تھا۔

وہ کام پر جا رہا تھا۔ صبح کا تو ہی وقت تھا۔ جانور تو آتے جاتے رہتے تھے قربانی والے، لیکن اس گائے نے نہ جانے کیسے رسی تڑائی کہ اس کی موٹر سائیکل، اسے گھسیٹ کر سڑک تک لے آئی اور پھر تیز رفتار ٹرک نے اسے کچل دیا۔ موت نے اسے آلیا۔

پھول سی سرداراں اماں سرداراں ہوگئی۔ میکے میں ابا واپس تو لے آئے تھے لیکن تین بچوں کے ساتھ کیسی سرداری اور کہاں کا رنگ وروپ وہ تو کمہلا کے ہی رہ گئی تھی۔ بھابیاں لاکھ اچھی سہی لیکن روٹی کا تر نوالہ تو اپنے ہی بچے کو دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہ بات تو اسے ایک سال میں ہی سمجھ میں آگئی تھی۔

☆......☆

ان ہی دنوں زمین کے ٹکڑے پر بھی گھر میں بات ہونے لگی تھی جو ابا کی جان لے کر ہی ٹلی۔ اماں نے لاکھ سمجھایا اور پھر ابا کی بات صرف سرداراں کو ہی سمجھ آئی تھی شاید۔ تب ہی تو اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

سراج تیلی نے بھائیوں کے پاس آنا جانا شروع کر دیا تھا تو اس نے بھی سوچنا شروع کیا بچے چھوٹے تھے' اور جب سب سے چھوٹے والے کو نمونیا میں وہ پاگلوں کی طرح علاج کے لیے، لیے پھری اور سراج تیلی نے اس کا ہر قدم پر ساتھ دیا تو دل نے بھی پرانی محبت کو دل میں روشن کر دیا تھا۔

☆......☆

رشتہ سادگی سے طے پا گیا۔ بھائی اور بھابیاں بھی خوش تھے۔ اماں نے بھی ایک جوڑا خود سیا اور گوٹا لگا کے اس کے سامنے بھابی کو دے کے کہا۔

''میری سوہنی کو آج اچھی طرح تیار کرنا۔''

بچے بھی خوش تھے کہ آج اماں کی آنکھوں میں' لہجے میں خوشی تھی۔

جوڑا شاید گلابی تھا، اس نے گلابی رنگ کی لپ اسٹک اپنے ہونٹوں اور گالوں پر سجالی، آنکھوں میں کاجل کی لکیر نے اسے ہمسفر کی مبارکباد دی تو سراج تیلی کے لائے ہوئے گجروں کی مہک اس کی پور پور میں بس گئی۔ سونے کی لال سرخ نگ والی انگوٹھی بھی جیسے اس سے باتیں کرنے لگی تھی، لیکن نکاح کے وقت بھائیوں کی آواز اور سراج تیلی کے کرخت لہجے نے اسے خوابوں سے حقیقت کا سفر کرنے پر مجبور کر دیا۔

وہ اس کے صرف ایک گود کے بچے کے ساتھ اسے رخصت کر کے لے جانا چاہتا تھا۔ وہ بھی ابا کی زمین کے ساتھ۔ اسی کی بیوی سے چار اولادیں تو تھیں نا۔ اب اگر وہ بستر پر پڑی تھی تو یہ بھی ذمے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

داری سرداراں کی تھی۔ اس سے تو وہ بے وقوف بے خبر ہی رہی۔ دل بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔

☆......☆

''اماں سراج نوں کہہ میں اے شادی نئیں کرسکدی۔'' اس نے انگوٹھی اماں کے ہاتھ میں دیتے ہوئے فیصلہ سنا دیا۔

''تجھے کیا ہوا' ابھی ایک بچہ لے جا...... بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

اماں نے آکے اسے کہا۔

سراج تیلی حیران تھا...... یہ کیا؟ وہ تو اسے پسند کرتی تھی ...... یہ تو وہ بھی جانتا تھا۔ چاہت کا غرور، نشہ انسان کو مغرور بنا دیتا ہے۔

''اس سے کہہ دے اماں، ماں سے بچے چھین کر محبت کا دعویٰ نہ ہی کرے تو اچھا ہے۔ محبت سرداراں سے تھی یا زمین سے دل سے پوچھے۔' پھر رشتہ جوڑے'' اس نے گلابی دوپٹہ اتار کر کہا۔

وہ کسی صورت نکاح کے لیے راضی نہ ہوئی، اس نے سفید دوپٹہ سر پہ لے لیا جبکہ سراج تیلی نے سارے فیصلے واپس لے لیے، اس کی گلی کے چکر لگا لگا کر' اس نے بھائیوں کو بھی راضی کر لیا، لیکن شاید نفرت کی طاقت محبت سے زیادہ تھی۔

اس نے ایک رات میں ہی گھر چھوڑا اور گاؤں بھی چھوڑ کر شہر آ گئی۔ وہ گھر گھر کام کرتی رہی، بچوں کے ساتھ، بھتیجے بھتیجیوں کے بھی خرچ اٹھاتی رہی۔ بچوں کو پالتی رہی، ماں کی محنت نے بچوں کو بھی محبت اور عزت کا فرق سکھا دیا تھا۔

ایک روز ماں بھی رخصت ہوگئی لیکن سردراں نے دل میں، اس زمین کو اللہ کا گھر بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا' وہ دن بہ دن مضبوط ہوتا گیا۔ بچوں نے ماں کے ساتھ ساتھ، بھوک بھی سہی، اور بارشوں میں، جاگ جاگ کر راتیں بھی کاٹیں، لیکن اسے لفظ محبت سے نفرت ہوگئی تھی، اس نے بچوں کی شادیاں بھی اپنی پسند سے کیں۔ بس محبت، عشق تو بندے کو رب سائیں سے ہی کرنا چاہیے یہ ہے سچی محبت بندے۔'' وہ اکثر کہا کرتی ہے۔

بشیر کو بھی سوال کرنے کی بڑی عادت تھی۔ وہ پوچھتا۔ ''کیوں اماں سرداراں؟۔''

اس لیے پتر، رب سائیں سے محبت بندے کو ذلیل نہیں کرتی، رسوا نہیں کرتی اور تو اور نہ ہی یہ محبت دھوکہ دیتی ہے، نہ اکیلا چھوڑتی ہے اور نہ ہی بے آسرا کرتی ہے' وہ بولتی ہے تو لہجے میں سچائی ہوتی ہے صرف سچائی۔''

یہ محبت تو بس جوانی میں اچھی لگتی ہے، چہرے پر رنگ جو پھیلا دیتی ہے۔ عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ عورت کے اندر تو بس ممتا ہی زندہ رہتی ہے۔ وہ اکثر خود سے بھی کہتی...... اگر محبتاں سچیاں ہوندیاں سرداراں...... تو سراج تیلی کی خود غرضی پہ وہ پاگل نہ ہو جاتی، دل دھڑکتا ہی رہا...... سانس بھی چلتی رہی، تو پھر اس پاگل دل کی باتوں میں کیا آنا...... یہ تو سردیوں کی شاموں میں مکئی اور ساگ کی خوشبو والی ہانڈی کو دیکھ کر بھی تیز تیز دھڑکنے لگتا ہے۔'' وہ بیٹھے بیٹھے خود ہی ہنستی۔

بشیر سبزی کی ٹوکری رکھتے ہوئے سوال کرتا تو وہ ہنستے ہنستے کہتی: ''جا، جا کے مسجد میں رب سائیں کے سامنے سجدہ کر، دھڑکتے دل کی باتوں میں نہ آ جو گھر میں ساگ بنتے دیکھ کے، تنور سے اترتی مکئی کی روٹی پر بھی اپنی دھڑکن کو بے قابو کر لیتا ہے' میرا یقین نہ آئے تو سجدے میں جا کے رب سے پوچھ کہ جب یہ دل دے کے محرم بے وفائی کرتے ہیں تو اس وقت یہ دل بند کیوں نہیں ہوتا۔ دھڑکتا ہی کیوں رہتا ہے۔ زیادہ ہی تیزی سے دھڑکتا چلا جاتا ہے...... ایک بار، ایک بار بند کیوں نہیں ہوتا...... کیوں؟ کیوں؟؟؟

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ناولٹ

بددعا

ایسا نہیں تھا کہ وہ پہلی دفعہ باہر نکلی تھی اور نہ ہی ایسا تھا کہ وہ کوئی غلط کام کرنے جا رہی تھی مگر پھر بھی انجانے خوف سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ فضا میں پھیلی خنکی کے باوجود بھی اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے قطرے چمک رہے تھے......

ایک نئی لکھاری کی دوشیزہ کے لیے پہلی تحریر

وہ اپنے جہازی سائز ہینڈ بیگ کو مضبوطی سے تھامے، سڑک کنارے بنی بینچ پر بیٹھی تھی۔ وہ ہمیشہ فیشن کے حساب سے لمبی چین والا پرس لیتی تھی مگر فی الحال یہ ہینڈ بیگ کسی فیشن کا تقاضا نہیں تھا بلکہ اس کی ضرورت تھی۔ اردگرد پھیلا سناٹا اور سنسان سڑکیں اس کے خوف میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ پہلی دفعہ باہر نکل رہی تھی اور نہ ہی وہ کوئی غلط کام کرنے جا رہی تھی مگر پھر بھی انجانے خوف سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ فضا میں پھیلی خنکی کے باعث بھی اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے قطرے چمک رہے تھے، جنہیں وہ بار بار ڈوپٹے کے پلو سے صاف کرتی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے ہینڈ بیگ پر گرفت مظبوط کی، دفعتاً ایک گاڑی اس کے سامنے آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو پہچاننے میں اسے لمحہ بھی نہ لگا۔

☆......☆

''بابا! بابا!'' ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی ایک بارہ سالہ لڑکی آ کر ان سے لپٹ گئی۔ وہ روزانہ ان کا یونہی استقبال کرتی تھی۔

''میرا رزلٹ آیا ہے۔ میں فرسٹ آئی ہوں۔'' وہ چہرہ اٹھا کر سرمئی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔ خوشی سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

''واہ میرا بیٹا تو بہت لائق ہے۔'' وہ شاباشی کے انداز میں اس کے کندھے کو تھپکتے ہوئے بولے۔

''کیا تحفہ چاہیے میری بیٹی کو؟''

بچی ان سے الگ ہو کر ان کے سامنے کھڑی تھی۔

''چاکلیٹ! بہت ساری۔'' سرمئی آنکھیں چمکیں

''ٹھیک ہے۔ کھانے کے بعد چلتے ہیں۔''

کچن کی کھڑکی سے نظر آتی خاتون نے دونوں باپ بیٹی کی محبت کو کوفت سے دیکھا پھر چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجالی۔

''آپ کی نئی مما کا رویہ ٹھیک ہے نا آپ کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ساتھ؟'' وہ بچی کے چہرے کو نرمی سے تھامتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''جی بابا! یہ ثناء کی اسٹیپ مدر کی طرح گندی نہیں ہیں۔''

بچی کی بات پر انہوں نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

☆......☆

گرمیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ آگ برساتا سورج ساری توانائی کھینچ رہا تھا۔ ایسے میں ہر ذی روح گرمی کا ستایا ہوا اور بے حال تھا۔ ایسی تپتی ہوئی دوپہر میں ایشال تھکے تھکے قدموں سے گھر میں داخل ہوئی۔ گرمی کی شدت سے اس کی گوری رنگت گلابی ہو رہی تھی۔ گھر آ کر اس نے سکون کا سانس لیا اور ڈوپٹے اور لمبی چین والے پرس کی گرفت سے خود کو آزاد کیا۔

ایشال کو دیکھ کر شعور بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا۔ ''آپا! آپ میرے لیئے چاکلیٹ لائیں؟'' وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

چاکلیٹ کا سن کر ایشال کی سرمئی آنکھوں میں ماضی کا عکس لہرایا۔ وہ سر جھٹک کر شعور کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''نہیں! میں بھول گئی۔ کل لے آؤں گی۔''

''ایک ہی تو بھائی ہے تمہارا اس کے لیئے بھی چیزیں لانا بھول جاتی ہو۔'' سعیدہ کمرے سے باہر آئیں اور طنز سے ایشال سے مخاطب ہوئیں۔

''سوتیلا بھائی۔'' ایشال بس سوچ کر رہ گئی۔

جاؤ جا کر کپڑے بدل لو۔ میں شعور کو لے کر بازار جا رہی ہوں۔ برتن دھو کر گھر کی صفائی کر دینا اور کھانا بھی بنا دینا رات کا۔'' وہ کاموں کی لمبی فہرست بتانے لگیں۔

''پتہ ہے مجھے سب۔ کون سا نئی بات ہے۔ روز ہی کرتی ہوں میں یہ سارے کام۔'' اس نے تلخی سے سوچا مگر بولی تو بس اتنا۔ ''جی!''

گھر کی صفائی سے فارغ ہو کر اس نے کچن کا رخ کیا۔ برتن سمیٹ کر سنک میں جمع کیئے اور دھونے میں مگن ہو گئی۔ کام کے دوران وہ مستقل بھوک سے دہائیاں دیتے اپنے پیٹ کو نظر انداز کرتی رہی۔ پلیٹ پر اسفنج ملتے ملتے اس نے ارد گرد نظر دوڑائی تو کوئی کھانے پینے کی چیز نظر نہ آئی۔ پتہ نہیں اماں کھانا بناتی نہیں تھیں یا اس کے لیئے نہیں رکھتی تھیں، وہ کبھی جان نہ سکی۔ کچن سے فارغ ہو کر اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور کیبنٹ سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک بسکٹ کا پیکٹ برآمد کر لیا۔ تھکن سے بے حال وہ چائے لے کر ٹیبل تک آئی اور کرسی کھینچ کر بیٹھی تو اسکی نظر ٹیبل پر پڑے اپنے موبائل پر پڑی جہاں آزر کے میسج آ رہے تھے۔ اس نے مسکرا کر اپنا موبائل اٹھایا۔ اس کی گھٹن بھری زندگی میں آزر اس کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا تھا۔ اس کا تایا زاد، جس سے اس کا نکاح تین سال پہلے ہو چکا تھا جو آج کل جاب کے سلسلے میں دیارِ غیر میں مقیم تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ میسج کا جواب دیتی، اس کے اسمارٹ فون کی جلتی بجھتی اسکرین پر آزر کالنگ لکھا آنے لگا۔ اس نے ہرے دائرے کو دبا کر کال اٹھالی۔

''ایشال؟'' دوسری طرف آزر بولا۔

''جی؟''

''کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟'' وہ چائے کا سِپ لیتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہوں۔ اماں آئیں گی اگلے ہفتے تمہاری طرف۔'' وہ سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

''اور آپ؟'' اس نے سوچا مگر بولی نہیں۔

''اور میں بھی۔'' تھوڑے توقف کے بعد وہ بولا۔

دل کی بات دل تک پہنچ گئی۔

''آپ واپس آ رہے ہیں؟'' سرمئی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

''ہاں! پرسوں تک۔'' دوسری طرف کسی بھی قسم کے جوش کا مظاہرہ کرنے کی زحمت نہیں کی گئی۔

اسے غصہ آیا، اپنے دو سال بعد آنے کی خبر وہ ایسے سنا رہا تھا جیسے موسم کا حال۔

''اچھا ابھی مجھے کام ہے...... میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔'' عجلت میں کہہ کر وہ فون رکھنے لگا۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔'' بے ساختہ ایشال کے منہ سے نکلا۔

آزر اس کے اس انداز پر چونکا۔

''تم بھی اپنا خیال رکھنا۔'' دھیمے لہجے میں کہہ کر اس نے کال ڈس کنکٹ کر دی۔

اسے لگا کہ دوسری طرف آزر دھیما سا مسکرایا بھی تھا۔ آزر کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ الجھن کا شکار ہو جاتی تھی۔ پتہ نہیں وہ اس سے محبت کرتا تھا یا صرف رشتہ نبھا رہا تھا۔

وہ آج تک سمجھ نہیں سکی۔ دروازے کی گھنٹی کی آواز پر اس نے چونک کر اپنی سوچوں سے باہر جھانکا اور گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ٹیوشن کے بچوں کے آنے کا ٹائم ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا کر گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے کی تھکن کا اب کہیں شائبہ نہیں تھا۔

☆......☆

''صائمہ بھابھی آئیں تھیں کیا کل؟'' حامد صاحب نے کھانے کی ٹیبل پر سعیدہ سے پوچھا۔

''ہاں آزر آیا ہوا ہے آج کل چھٹیوں پر۔ یہی بتانے آئیں تھیں۔'' وہ شعور کو نوالہ کھلاتے ہوئے بولیں۔

ایشال سر جھکائے چپ چاپ کھانا کھانے میں مگن تھی۔ آزر طبیعت کی خرابی کے باعث ملنے نہیں آسکا تھا۔ سو سرمئی آنکھوں میں آج اداسی تھی۔

''ہوں۔ میرے پاس آج بھابھی کا فون آیا تھا۔ وہ شادی کے لیئے اگلے مہینے کی کوئی تاریخ مانگ رہی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ اب کی دفعہ آزر ساتھ لے کر جائے ایشال کو۔'' انہوں نے تفصیل سے ساری بات بتائی۔ وہ اب کھانا ختم کر چکے تھے۔

''تم شعور کو لے جا کر ہاتھ دھلواؤ۔'' وہ شعور کو کرسی سے اتارتے ہوئے ایشال سے مخاطب ہوئیں۔ وہ اسے منظر سے ہٹانا چاہتی تھیں۔

''آج میں آپا سے کہانی سنوں گا۔'' شعور ضد بھرے لہجے میں بالا۔

''ہاں! چلو۔'' ناچار ایشال کو اٹھنا پڑا۔

ایشال اور شعور کے جاتے ہی سعیدہ بولیں۔

''ظاہری بات ہے ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہماری بچی جلد از جلد اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ مگر اتنی جلدی! آپ کو پتہ بھی ہے کہ شادی کے سو جھمیلے ہوتے ہیں۔ ابھی ویسے ہی ہاتھ تنگ ہے۔ آپ کو دکان میں نیا مال ڈلوانا ہے اور شعور کا اس سال اسکول میں داخلہ کرانا بھی ضروری ہے۔'' وہ فکر مندی سے بولیں۔

''ہاں مگر یہ سب بعد میں بھی ہو سکتا ہے، ابھی جو بھی جمع جتھا ہے وہ ملا کر ہو جائے گا۔ ویسے بھابھی یہ شادی سادگی سے کرنے کے حق میں ہیں۔'' وہ رسان سے بولے۔

ایشال شعور کو بہلا کر کھانے کے برتن اٹھانے کے بہانے جلدی واپس آگئیں۔ اسے گفتگو سننی تھی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ ایک ہی تو بیٹی ہے ہماری۔ اس کی شادی بھی سادگی سے کر دیں؟ میں تو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دھوم دھام سے بیاہوں گی اپنی بیٹی کو۔ آپ کہہ دیں بھابھی سے کہ ہمیں وقت چاہیے۔''

''میں بھی اپنی بیٹی کی شادی دھوم دھام سے کرنا چاہتا ہوں مگر ہم فی الحال مزید اس شادی کو ملتوی نہیں کر سکتے۔ پچھلی دفعہ بھی ہم نے منع کر دیا تھا۔'' وہ الجھے الجھے لہجے میں بولے۔

ایشال سست روی سے برتن سنک میں رکھنے لگی، باتوں کی آواز کچن تک واضح آ رہی تھی۔

''آزر کی نوکری تو اب پکی ہوگئی ہے، آتا جاتا رہے گا۔ اور میں یوں ایشال کو اچانک اتنی دور نہیں بھیج سکتی۔'' وہ نم آواز میں بولیں۔ حامد صاحب نرم پڑ گئے۔

''اچھا میں بھابھی کو منع کر دیتا ہوں۔ مگر اگلی دفعہ تاریخ دے دیں گے۔'' وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے۔

ایشال کی آنکھیں بھر آئیں۔

''ہمیشہ کی طرح اماں جیت گئیں۔ اماں میری شادی کرنا چاہتی ہی نہیں ہیں۔ میں نے ٹیوشن اسی لیئے پڑھانا شروع کی تھی کہ تھوڑی سیونگ کر لوں گی۔ مگر اماں بہانے بہانے سے مجھ سے پیسے لے لیتیں ہیں۔ میرے اخراجات کے لیئے بھی بہ مشکل پیسے بچتے ہیں۔'' وہ دیوار سے ٹیک لگائے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ آنکھوں سے نکلتا پانی اسکے گالوں کو بھگو رہا تھا۔

''فیس!'' وہ یکدم چونکی۔ اسے کل کالج میں فارم کی فیس جمع کروانی تھی۔ وہ آنسو پونچھ کر تیزی سے حامد صاحب کے کمرے کی طرف آئی۔

''ابا کالج میں بورڈ کے فارم کی فیس جمع کروانی ہے، پیسے چاہیے۔ کل آخری تاریخ ہے۔'' وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے مضطرب لہجے میں کہہ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے نظر آنے والی تیزی اب مفقود تھی۔

ابا نے مطلوبہ رقم پوچھ کر اسے تھمائی۔

''وہ کل ٹیوشن کی فیس میں نے سنبھال کر رکھی تھی مگر اب وہ نہیں مل رہی، اس لیے آپ سے لینے پڑے۔'' پیسے تھامتے ہوئے اس نے خواہ مخواہ وضاحت دی۔

اسی وقت سعیدہ کمرے میں داخل ہوئیں اور ٹھٹک کر ایشال کے ہاتھوں میں پیسوں کو دیکھا۔

''کوئی بات نہیں۔ میرا بیٹا مجھ سے جب دل چاہے کچھ بھی لے سکتا ہے۔ اور تم پہلے بھی اپنے بابا سے لیتی تھیں پھر اب جھجکنے کی وجہ؟''

آہٹ پر پلٹ کر اس نے ''وجہ'' کو دیکھا۔

''بس عادت نہیں رہی اس لیے۔'' سادگی سے کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

''کیا ہوا؟'' سعیدہ پوچھ بیٹھیں۔

''فارم کے لیئے پیسے چاہیے تھا۔ ٹیوشن کی فیس نہیں مل رہی تھی اسے۔'' ٹی وی آن کرتے ہوئے انہوں نے مختصر بات بتائی۔

''اوہ! یہ تو بڑھتی جارہی ہے۔'' وہ بڑبڑائیں۔

''کیا؟'' انہوں نے ناسمجھی سے سعیدہ کو دیکھا۔

''آ آ...... نہیں۔ کچھ نہیں۔'' وہ گڑبڑائیں۔

''سعیدہ مجھے حق ہے کہ مجھے اپنی بیٹی کے بارے میں ہر بات معلوم ہو۔'' وہ ریموٹ رکھ کر پوری طرح سے ان کی جانب متوجہ ہوئے۔

''وہ دراصل...... مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ آپ کو کیسے بتاؤں۔'' وہ اٹک اٹک کر بول رہیں تھیں۔

''ایشال عجیب سی ہوتی جارہی ہے۔ مطلب وہ باتیں بھول جاتی ہے۔ پہلے کبھی کبھی ہوتا تھا۔ اب روز ہونے لگا ہے۔ پیسے رکھ کر بھول جاتی ہے، کسی کام کا کہوں تو وہ کرنا بھول جاتی ہے۔ میں ویسے ہی سارا دن گھر کے کاموں میں الجھی رہتی ہوں، اسکی فکر الگ مجھے ہلکان کرتی ہے۔'' وہ بیڈ کے سرہانے بیٹھتے ہوئے فکرمند لہجے میں بولیں۔

''یہ ایسا کوئی خاص مسئلہ تو نہیں۔ بھول چوک تو ہر انسان سے ہو جاتی ہے۔ پڑھائی کی ٹینشن ہوگی ایشال کو، امتحان بھی قریب ہیں۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ اگر مزید اس طرح سے چلتا رہا تو میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گی۔ اور میں اس لیئے ابھی رخصتی سے روک رہی تھی۔ بھابھی کیا کہیں گی کہ ہم نے بیمار بیٹی بیاہ دی۔''

''وہم ہے تمہارا سب۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ سخت لہجے میں بولے۔

سعیدہ نے ان کی سختی کا کوئی خاطر خواہ نوٹس نہیں لیا۔ وہ سر جھٹک کر ایشال کی الماری سے نکالے گئے پیسوں کو خرچ کرنے کے بارے میں سوچنے لگیں۔

☆......☆

ایشال کتنی ہی دیر مٹھی میں بند پیسوں کو دیکھتی رہی۔ عرصے بعد ابا نے خود اسے پیسے دیئے تھے۔ وہ جانتی تھی کی ابا اس کے اخراجات کی رقم اماں کے ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں مگر وہ رقم آج تک اس پر خرچ نہیں ہوئی۔ شروع میں وہ اپنے ننھے ذہن کے ساتھ اماں کے برے رویے کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی مگر شعور کی منزلیں طے کرنے کے بعد اسے سمجھنے میں دقت نہ ہوئی تھی۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے بیڈ پر لیٹ گئی اور جلد ہی نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆......☆

واشنگ مشین کی گھنٹی کی آواز پر ایشال تیزی سے کچن سے نکلی۔ آج اسکے کالج کی چھٹی تھی تو اس نے مشین لگالی۔ کپڑوں کا ڈھیر دھوتے دھوتے اسے شام ہوگئی۔ تھکن سے چور بدن کے ساتھ وہ لاؤنج میں آئی، صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے دو گھڑی آنکھیں موند لیں۔ اماں کی نظر پڑی تو تلملاتی ہوئی اس تک آئیں۔

''یہ کون سا وقت ہے سونے کا؟ تمہارے ابا کے آنے کا ٹائم ہونے والا ہے۔ کھانا بھی نہیں بنا اب تک۔'' وہ تیز لہجے میں بولیں۔

''اماں تھک گئیں ہوں۔ ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے۔'' وہ منمنائی۔

''ایسے کونسے پہاڑ توڑ لیئے تم نے؟ چار کپڑے ہی تو دھوئے ہیں۔ کچن کی کیبنٹ بھی صاف نہیں کی تم نے ابھی تک۔ اتنی سست ہو تم۔ ایک کام میں بھی گھنٹوں لگا دیتی ہو۔ اٹھو! کام ختم کرو۔''

ایشال مزید بولنے کی ہمت نہ کر سکی اور چپ چاپ اٹھ گئی۔

دن بھر کی تھکن اور اضافی کام، نتیجتاً رات تک اسے بخار ہوگیا۔ اس نے اگلے دن کالج سے چھٹی کر لی مگر آرام شاید اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ اماں نے اپنی بہن کو کھانے پر بلایا تھا جو صبح سے ہی انکے گھر آگئی تھیں۔ اہتمام کی ساری ذمہ داری اس کے کاندھوں پر آن پڑی تھی۔ اپنی جلتی آنکھوں اور ٹوٹتے بدن کے ساتھ وہ صبح سے کچن میں مصروف تھی۔ انواع واقسام کے کھانے کی تیاری کے دوران اسے سوئیٹ ڈش کا خیال آیا تو وہ اماں سے پوچھنے آئی۔

''اماں! میٹھے میں کیا بنانا ہے؟''

''کھیر بنا لو اور اوپر سے پستے بادام بھر پور ڈالنا۔ ناہید کو بہت پسند ہیں۔'' وہ محبت سے اپنی بہن کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''اسے کیا ہوا ہے؟ بیمار بیمار سی لگ رہی ہے۔'' اسکے باہر جاتے ہی ناہید نے پوچھا۔

باہر نکلتی ایشال اپنے متعلق سن کر ٹھٹکی اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

خاموشی سے دروازے کی اوٹ میں ہوگئی۔

''کچھ نہیں ہوا۔ بالکل ہٹی کٹی ہے۔ بس ہمدردی بٹورنے کے لیئے ایسی مسکین صورت بنائے پھرتی ہے۔'' سعیدہ نخوت سے بولیں۔

''تم بلا وجہ اس سے بدگمان ہورہی ہو۔ معصوم بچی ہے۔''

''تم زیادہ طرفداری مت کرو اس کی۔ اچھی طرح جانتی ہوں میں اسے۔ یہ تو میں نے رعب میں رکھا ہوا ہے ورنہ ناک میں دم کردیا تھا اس نے، سارا وقت اپنے باپ کے ساتھ چپکی رہتی تھی۔ میرے لیئے تو وقت ہی نہیں تھا حامد کے پاس۔ بہت مشکل سے میں نے دونوں باپ بیٹی کو الگ کیا۔ اور شکر ہے کہ شعور کے بعد وہ مجھے اہمیت دینے لگے ورنہ مجھے تو ساری عمر اس کی چاکری کرنی پڑتی۔''

باہر کھڑی ایشال بے یقینی سے سنتی رہی۔

''بہت غلط کیا تم نے سعیدہ۔ چھوٹی سی بچی سے مقابلہ کرنے بیٹھ گئیں۔ اگر تھوڑی سی توجہ اور محبت دیتیں اسے تو وہ ساری زندگی خوشی خوشی تمہارا دم بھرتی۔'' وہ افسوس سے کہہ رہیں تھیں۔

''ایسا بھی کوئی غلط نہیں کیا میں نے۔ بیٹیوں کی تربیت اسی طرح کرتے ہیں، ان پر سختی رکھتے ہیں۔ ہر اچھے برے حالات کا عادی بناتے ہیں کہ اگلے گھر جا کر ہماری ناک نہ کٹوائیں۔'' وہ اپنے دفاع میں بولیں۔

ایشال کی سرمئی آنکھوں میں سے آنسو رواں ہوگئے۔

''سختی کرتے ہیں، ظلم نہیں۔ اور کون سا اگلا گھر؟ اس کے نکاح کے وقت تم نے لڑکے کی معمولی نوکری کو وجہ بنا کر اتنا ہنگامہ کیا تھا۔ اب اس کی اچھی جاب لگ گئی ہے تو تم نے رخصتی روک کر رکھی ہوئی ہے۔ تمہیں جان ہی چھڑانی ہے نا اس سے تو کردو اس کی رخصتی۔'' انہوں سمجھانے کے لیے سعیدہ ہی کا انداز اپنایا۔

''ایویں کروں رخصتی۔ جی بھر پیسہ بہائیں گے حامد اس کی شادی پر۔ سادگی تو صرف نام کی ہوگی۔ قرضے لے کر لاکھوں روپے خرچ کریں گے۔ یہ تو دفعان ہوجائے گی پیچھے ہم رہ جائیں گے قرضے بھگتانے کے لیئے۔ اور سچی بات ہے کہ میں نے تو سارا گھر اس کے حوالے کردیا ہے۔ مجھ سے نہیں ہوتا اب کام۔ مفت کی نوکرانی ہے یہ میرے لیئے۔ جس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ پیسے لیتی نہیں ہے بلکہ دیتی ہے۔ اسکی ٹیوشن کی فیس سے ہی تو آسائشات میں گزر رہی ہے۔ ورنہ حامد کی تنخواہ میں تو بس گزارا ہی ہوتا تھا۔'' وہ شیطانی ہنسی ہنستے ہوئے بولیں۔

ایشال کے لئے مزید ٹھہرنا دوبھر ہوگیا۔

''اور اس کے سسرال والے؟ تم کب تک نہیں ٹالتی رہوگی؟'' وہ اب دبے دبے غصے سے بولیں۔

''اس کے لیے تو میں نے پکا بندوبست سوچ لیا ہے۔ بس ایک رات کے لیے غائب کروانا ہے اسے۔ رات باہر گزارنے والی لڑکی کو قبول کرنے میں اسکے ماں باپ بھی ہچکچاتے ہیں، سسرال والے تو تھوکیں بھی نہیں۔'' ان کا مکروہ چہرہ ان کے شیطانی ارادے کی عکاسی کررہا تھا۔

ناہید سے مزید برداشت کرنا ممکن نہ رہا۔

''خدا کا خوف کرو سعیدہ۔ صرف چند ہزار کے لیے تم اپنی بیٹی زندگی داؤ پر لگا......''

''بیٹی نہیں ہے وہ میری۔ سوتیلی اولاد ہے۔ جو میری شادی کے سنہری سال کھا گئی۔ اب میں اسے اپنے بیٹے کا حق نہیں مارنے دوں گی۔ میرا بیٹا میرے لیے سب کچھ ہے، اسے بہترین زندگی فراہم کرنے کے لیے میں ہر حد تک جاسکتی ہوں۔''

''تف ہے تم پر سعیدہ! اتنی سی بچی کے لیے تم نے دل میں اتنی نفرت بھرلی۔ اولاد ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے مگر اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ اپنی اولاد کی خاطر کسی کی زندگی سے کھیلا جائے۔ ابھی بھی وقت ہے سنبھل جاؤ ورنہ پکڑ بہت بری ہوگی۔'' وہ شعلہ بار انداز میں بولیں۔

''اچھا! اچھا! تم غصہ نہ کرو۔ میں برا نہیں کروں گی اس کے ساتھ۔'' وہ جلدی سے اپنی جان چھڑانے کے لیے بولیں۔ ناہید ان کی واحد سسرالی رشتہ دار تھیں، وہ ان سے تعلق خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆......☆

ایشال تقریباً بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور تیزی سے دروازہ بند کیا۔ دروازے سے کمر ٹکائے وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ کاش اسے یہ سب پہلے سمجھ آجاتا تو وہ اماں کی چال کبھی کامیاب نہ ہونے دیتی۔ ابا کو خود سے دور نہ ہونے دیتی۔ سوچوں کے ساتھ آنسوؤں کا سیل بھی رواں تھا۔

''نہیں!'' وہ یکدم کسی خیال پر چونکی۔ ''آزر نہیں۔ اماں نے مجھ سے ابا کو چھین لیا مگر میں آزر کو نہیں چھننے دوں گا۔ کچھ تو کرنا ہوگا مجھے۔'' وہ ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھتی ایک عزم سے اٹھی اور نگاہ سامنے موبائل پر پڑی۔ اس نے سوچے سمجھے بنا آزر کو کال ملادی۔ دوسرے طرف بیل جانے لگی۔

''مگر کیا میری بات کا یقین کرے گا؟'' اس کے جذبات ڈھیلے پڑے۔ اس نے کال کاٹ کر موبائل کان سے ہٹادیا۔

وہ آزر کو جانتی ہی کتنا تھی، بس ایک کزن کی حیثیت سے کہ وہ سنجیدہ مزاج ہے اور ریزروڈ ہے۔ نکاح کے بندھن بھی ان کے درمیان کوئی مضبوط تعلق نہ بنا سکا۔ ایسے میں آزر پر بھروسا کرنا اس کے لیے مشکل ہورہا تھا۔

آزر کی کال پر اس کی سوچوں کو بریک لگی۔

''جی؟'' کال ریسیو کرکے وہ بولی۔

''تم نے کال کی تھی؟''

وہ آزر کو کچھ نہیں بتائے گی، فیصلہ ہوگیا تھا۔

''وہ میں نے آپ کو خواب میں دیکھا...... ڈرگئی تھی۔'' بے ربط لہجے میں اس نے بے تکی بات بولی۔

''مجھے دیکھ کر ڈرگئی تھی؟'' اسپیکر سے ابھرتی اس کی آواز میں حیرت واضح تھی۔

''نہیں دراصل خواب برا تھا۔'' وہ اب سنبھل گئی تھی۔

''خیر میں تمہیں کال کرنے ہی والا تھا۔ مجھے تم سے ملنا ہے کل۔'' آزر نے بات بدل دی۔ شاید اسے ایشال کی یا اس کے خواب کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

''ضروری کام ہے، آسکتی ہو؟''

''ٹھیک ہے! میں آجاؤں گی۔'' وہ اپنا بخار، تھکن، کالج ہر چیز بھلا کر بولی۔ وہ آزر کو انکار نہیں کرسکتی تھی۔

''اوکے کل ملتے ہیں۔ ٹائم اور جگہ تمہیں میسج کردوں گا۔ اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ!''

''پتہ نہیں کیا بات کرنی ہوگی آزر کو۔'' وہ سوچ رہی تھی مگر یہ تو پکا تھا کہ اس ملاقات کی خبر اماں کو نہیں ہونے دینی تھی۔

''ایشال؟ کھانا تیار ہوگیا؟'' باہر سے آتی اماں کی آواز پر وہ چونکی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

"اوہ انہیں تو پتہ ہی نہیں کہ ان کے ڈرامے کا ڈراپ سین ہوگیا ہے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی۔ مظلوم ایشال کا رول اسے ابھی جاری وساری رکھنا تھا۔

☆......☆

ایشال بنا کچھ کھائے پیے بنا دوائی کھا کر سرِ شام ہی سوگئی۔ خدا جانے سعیدہ کے دل میں اس کے لیے نرمی آگئی تھی یا اسکے بڑھتے ہوئے بخار کا خیال آگیا تھا کہ انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔

اپنے موبائل کی چنگھاڑتی آواز پر ایشال نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں۔اس کا چیختا ہوا فون اب خاموش پڑا تھا۔اس نے ٹائم دیکھا تو صبح کے نو بج رہے تھے۔

"اوہ خدایا! میں اتنی دیر سوتی رہی۔"

آزر کے ڈھیر سارے میسجز آئے ہوئے تھے۔

"میں تمہیں دس بجے تک پک کرلوں گا۔ تیار رہنا۔"

میسج پڑھ کر وہ جوابی میسج لکھنے لگی۔اسی پل سعیدہ ناشتے کی ٹرے اٹھائے اسکے کمرے میں داخل ہوئیں۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو میں نے سوچا تمہارے لیے ناشتہ بنادوں۔" وہ مٹھاس سے بولیں۔ان کے اس انداز پر ایشال بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔

پھر اماں کے لاکھ اصرار کے باوجود اس نے صرف ایک توس اور چائے پینے پر اکتفا کیا۔

"تم کالج نہیں جارہی آج؟" انہوں نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔

"جی بس جارہی ہوں۔" اس نے جھوٹ بولا۔

"کب تک نکلو گی؟"

ان کے اتنے سوالات پر ایشال ٹھٹکی۔

"تھوڑی دیر میں۔آپ کو کوئی کام ہے؟"

"نہیں میں تو بس یونہی پوچھ رہی تھی۔آرام سے جانا۔" کہہ کر وہ باہر نکل گئیں۔

اماں کے اس عجیب وغریب انداز پر سوچتی وہ نہانے چلی گئی۔تیار ہو کر اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کا تنقیدی جائزہ لیا،گلابی رنگ کے ڈریس میں اسکی گوری رنگت بہت واضح تھی۔اپنے لمبے کالے بالوں کی اس نے اونچی پونی بنائی تھی جو کمر پر جھول رہی تھی۔مگر سرمئی آنکھوں کے گرد حلقے بہت واضح تھے۔اس نے کاجل اٹھایا اور آنکھوں میں گہرا کاجل ڈالا جس سے اسکے حلقے مکمل طور پر چھپ گئے۔اس نے مطمئن ہو کر لمبی چین والا پرس اپنے کندھے پر ڈالا اور اماں کے کمرے کی طرف آئی۔

"اماں میں جارہی ہوں۔" کہہ کر وہ چھپاک سے کمرے سے نکل گئی۔

اماں فون پر مصروف تھی نہ اسے دیکھا اور نہ اسکی بات ٹھیک سے سنی۔

گلی کے باہر آزر گاڑی میں اس کا منتظر تھا۔ایشال کو دیکھ کر وہ حیران ہوئے بنا نہ رہ سکا۔اس کے ذہن میں جو کم عمر ایشال کا خاکہ تھا وہ اس کے بالکل برعکس تھی۔وہ اسکی سوچ سے زیادہ خوبصورت ہوگئی تھی۔ایشال کے گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگا مگر اب یکسوئی برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔بھوری آنکھیں بار بار سرمئی آنکھوں کے طرف بھٹک رہی تھیں۔ایشال نروس سی اپنی گود میں رکھے پرس کو دیکھ رہی تھی۔آزر کا بار بار دیکھنا وہ محسوس کرچکی تھی۔

"میں نے سوچا کہ بیٹھ کر بات کرلیتے ہیں۔" گاڑی ایک ریسٹورنٹ کے آگے روک کر، وہ اپنی پیشانی پر بکھرے بھورے بال ہٹاتے ہوئے بولا۔

ایشال مسکرا کر اتری مگر یکدم جیسے ساری دنیا گھوم گئی۔اس نے اپنے چکراتے سر کو تھامتے ہوئے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

آزر نے پلٹ کر اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں۔" ایشال خود کو کمپوز کر کے زبردستی مسکرائی۔

ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہی ایشال کو بہت زور کا چکر آیا۔دھندلاتے منظر کے ساتھ اس نے ہاتھ بڑھا کر پاس کھڑے ستون کو پکڑنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی آزر تیزی سے آگے بڑھا اور اسکے بڑھے ہاتھ کو تھام لیا۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

زرد ہوتی رنگت کے ساتھ اس نے نفی میں سر ہلایا۔اسے سہارا دے کر آزر واپس گاڑی تک لایا۔

"گھر چلنا ہے یا ڈاکٹر کے پاس چلنا ہے؟"

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے نرمی سے پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔آزر کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اپنائیت سے بولا۔

"ایشال اگر کوئی مسئلہ ہے تو تم مجھ سے ڈسکس کرسکتی ہو۔"

بس اتنی سی اپنائیت! اور ایشال پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

☆......☆

"وہ سو رہی ہے اپنے کمرے میں، حامد چلے گئے ہیں۔میں شعور کو لے کر ناہید کی جانب جارہی ہوں۔پچھلا دروازہ کھلا چھوڑ دوں گی۔تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔بہت دھیان سے کام کرنا کوئی غلطی مت کرنا۔" سعیدہ فون پر اپنے سے کئی سال چھوٹے خالہ زاد کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھیں۔انہوں نے اسکی بے روزگاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیسوں کا لالچ دے کر اسے ایشال کے اغوا کے لیے راضی کیا تھا۔اب اسکی ناتجربہ کاری کے باعث انہیں فکر لاحق ہو رہی تھی۔

دوپہر ڈھلنے سے پہلے ہی انہوں نے حامد صاحب کو فون کر کے کہا کہ ایشال صبح کالج گئی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی۔وہ پوری طرح سے اپنی اداکاری کے جوہر دکھانے کے لیے تیار تھیں۔اب انہیں یہ خبر ایشال کے سسرال پہنچانی تھی۔انکی پلاننگ مکمل تھی۔

"کہاں جاسکتی ہے وہ کالج سے؟" حامد صاحب پریشانی سے بولے۔

"مجھے کیا پتہ! مجھے کچھ بتاتی ہی کہاں ہے۔" انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

"میں پتہ کرتا ہوں کالج اور اس کی سہیلیوں کے گھر۔" کہہ کر وہ چلے گئے۔

آنکھوں میں چبھتی تیز پیلی روشنی نے اپنا رنگ کھویا اور شام کی سرخی میں تبدیل ہونے کے بعد رات کی سیاہی میں ڈھل گئی۔ایشال کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔رات کے سائے حامد صاحب کی پریشانی میں اضافہ کر رہے تھے۔

☆......☆

دن بوجھل اور بے کیف سے گزر رہے تھے۔

حامد صاحب صبح سویرے ایشال کو ڈھونڈنے نکل جاتے اور رات کو ہارے ہوئے جواری کی طرح لوٹ آتے۔سعیدہ کا بھی فکر سے برا حال تھا۔ان کے خالہ زاد کا نمبر بند تھا اور ہر جگہ سے معلومات کروانے کے باوجود بھی اس کا کوئی اتا پتہ نہ مل سکا۔وہ ایشال کو لے کر ایسے غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سعیدہ کا پورا کھیل بے کار گیا تھا۔ سونے پہ سہاگا یہ کہ گھر کے سارے کام ان کے سر پڑ گئے تھے۔ نتیجتاً وہ حامد صاحب کی غیر موجودگی میں ایشال کو یا اپنی قسمت کو کوستے ہوئے پائی جاتیں تھیں۔

ایک ایسے ہی بوجھل دن جب حامد صاحب ناکام گھر لوٹے تو بلا ارادہ ہی ایشال کے کمرے میں آ گئے۔ ایشال کا چھوٹا سا کمرہ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ ان کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ وہ ایشال کی چیزوں کو دیکھنے لگے کہ ان کی نظر ایک کتاب پر پڑی۔ سفید اور دبیز کتاب۔ انہیں وہ کتاب دیکھی دیکھی سی لگ رہی تھی مگر کہاں؟ یہ یاد نہیں آیا۔ انہیں یاد کرنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی کیونکہ کے کتاب کے پہلے صفحے پر ہی لکھا تھا۔

From my Baba Jan on 14th birthady

ان کے لبوں پر ایک اداس مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ انہوں نے صفحہ پلٹا اور پھر وہ پڑھتے گئے اور صفحے پلٹتے گئے۔ تھوڑی دیر پہلے کی مسکراہٹ اب اشتعال میں بدل گئی تھی۔ ہاتھ میں ڈائری اور آنکھوں میں چنگاریاں لیے وہ باہر آئے۔

''سعیدہ! سعیدہ!'' وہ حلق کے بل چلائے۔

سعیدہ گیٹ کے پاس کھڑی شعور کو گلی میں کھیلنے سے روک رہی تھیں۔ حامد صاحب کی آواز پر دوڑتی ہوئی آئیں۔

''کیا ہوا؟''

''تم جانتی تھی کہ میں تمہیں اس گھر میں صرف ایشال کی لیے لایا تھا مگر تم! تم نے اپنا سوتیلا پن دکھا ہی دیا آخر۔ کیا خیال تھا تمہارا کہ تم پیٹھ پیچھے میری بیٹی کے ساتھ زیادتی کرتی رہو گی اور مجھے خبر ہی نہیں ہو گی۔'' وہ شعلہ بار انداز میں بولے۔

شعور آنکھ بچا کر باہر کھیلنے بھاگ گیا۔

''کیا ہوا ہے۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' ان کی سانس رکنے لگی۔

جواباً حامد صاحب نے ڈائری ان کے منہ پر ماری، وہ بدک کر پیچھے ہوئیں۔

''تم نے میری بیٹی کو اتنا تنہا کر دیا کہ اس نے بے جان چیزوں سے اپنے دل کا حال بانٹنا شروع کر دیا تھا۔''

''اف! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اس کی دماغی حالت ویسے ہی ٹھیک نہیں تھی۔ پتہ نہیں کیا الٹا سیدھا لکھ دیا اور آپ نے یقین کر لیا۔'' وہ شرمندہ ہونے کے بجائے ڈھٹائی سے بولیں۔

اگر ہم انسان آسانی سے اپنی غلطی مان لیں تو اس دنیا میں کسی قانون یا عدالت کی ضرورت نہ رہے۔

''بکواس بند کرو اپنی! مزید میری بیٹی کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں ڈھونڈنے جا رہا ہوں اسے، اور اگر مجھے پتہ چلا کہ اس کے غائب ہونے میں تمہارا کوئی ہاتھ ہے تو تمہارا انجام بہت بُرا ہوگا۔ میری بیٹی لاوارث نہیں ہے۔ اس کا باپ ابھی زندہ ہے۔ اسکے ساتھ کی گئی ایک ایک زیادتی کا بدلہ لوں گا میں۔'' انہوں نے انگلی اٹھا کر انہیں تنبیہہ کی اور چلے گئے۔

''مطلب انہیں نہیں پتہ چلا کہ اغوا میں نے کروایا ہے۔'' وہ بڑبڑائیں اور ان کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔

''منحوس کو کیا ضرورت تھی یہ ساری بکواس لکھنے کی۔ کوئی فائدہ بھی نہیں ہوا۔ مصیبت الگ میرے گلے پڑ گئی۔ خدا کرے نہ ملے، مر جائے! کم از کم میری تو جان بخشی ہو۔'' انہوں نے پورے دل

سے بد دعا دی، بد دعا بجلی کی تیزی سے آسمان کے وسط میں پہنچی اور اپنا مسکن تلاش کرنے لگی۔

حامد صاحب کو گئے کچھ پل ہی بیتے تھے کہ کسی نے مین گیٹ زور سے بجایا۔ سعیدہ نے جا کر دروازہ کھولا۔ حامد صاحب کے پیچھے بہت سارے لوگ چارپائی کو کاندھا دیے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''یہ کون ہے؟'' وہ ششدر سی پوچھ رہی تھیں۔ چارپائی پر لیٹ وجود پر سفید چادر ڈھکی تھی۔ حامد صاحب نڈھال سے آگے بڑھے اور چادر ہٹا دی۔

خون سے نہائے کپڑوں میں ملبوس شعور کے چہرے پر زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ سعیدہ شل سی زمین پر بیٹھتی چلی گئیں۔

''میں شعور کو روک رہا تھا مگر وہ پھر بھی بال لینے بھاگا اور گاڑی کے نیچے.....'' پڑوس والوں کا لڑکا روتے ہوئے وضاحت دے رہا تھا۔ مگر اب کسی وضاحت کا کوئی حاصل نہیں تھا۔

بد دعا برحق ہے۔ جب ہم کسی انسان کو بد دعا دیتے ہیں تو وہ آسمان کی جانب سفر کرتی ہے اور اُس انسان کو تلاش کرتی ہے مگر جب وہ اسے اس بد دعا کا اہل نہیں پاتی تو وہ واپس ہم پر پلٹ آتی ہے۔

''بابا!'' آواز پر حامد صاحب نے پلٹ کر دیکھا تو چوکھٹ میں ایشال کھڑی تھی۔

☆......☆

آزر کی ہمدردی پر ایشال پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آزر نے پانی کی بوتل اس کی جانب بڑھائی جو اس نے چپ چاپ لبوں سے لگا لی۔ اس کی حالت کچھ سنبھلی تو وہ گیلی آواز میں بولی۔

''بخار تھا، شاید اس لیے چکر آ گئے۔''

''اور رونے کی وجہ؟ کوئی بخار کی وجہ سے اتنا تو نہیں روتا۔'' وہ حیرت سے بولا۔ ''خیر رونے کی وجہ تم بعد میں بتانا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ میڈیسن لی کوئی؟''

''ہاں پیناڈول لی تھی کل۔'' وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''اف! ایک تو یہ پیناڈول اور پونستان! ہماری قومی دوائیاں۔ یہ اثر انداز ہوتی ہیں، مگر ضروری نہیں کہ ہر بیماری کا یہ ہی ہو علاج ہوں۔ کبھی کبھی ڈاکٹر کے پاس بھی چلے جانا چاہیے۔ اس لیے ابھی ہم ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں اس کے بعد تم مجھے ہر چیز کی وجہ بتاؤ گی۔'' نرمی سے کہہ کر اس نے گاڑی کا رخ کلینک کی طرف موڑ دیا۔

ایشال کو آزر کا فکر کرنے کا انداز اچھا لگا۔ اس نے سکون سے گاڑی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆

باہر دھوپ کی سنہری روشنی کے برعکس ریسٹورنٹ میں نیم اندھیرا کر کے ماحول کو خوابناک بنایا گیا تھا۔ اے سی کی خنکی نے باہر کی گرمی کو زائل کر دیا تھا۔ دھیمے سُروں میں بجتا میوزک ماحول کو پُرفسوں بنا رہا تھا مگر اس سب کے برعکس بھوری آنکھیں سنجیدگی سے سرمئی آنکھوں پر جمی تھی۔

''تمہاری اماں نے تم پر بہت ظلم کیے اور تمہارے بابا کو تم سے الگ کر دیا، جس کے باعث تم اکیلی رہ گئیں۔'' ایشال کی ساری روداد سننے کے بعد آزر نے رائے دی۔ ایشال نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مگر مجھے ایسا نہیں لگتا ایشال! میرے خیال میں اس میں تمہارا بھی قصور ہے۔ جب انکا رویہ تمہارے ساتھ بُرا ہو گیا تھا تو تمہیں چچا کو بتانا چاہیے تھا۔ تمہارے پاس بابا بہترین آپشن تھے۔ تم ان

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے سب ڈسکس کر سکتی تھی۔'' آزر کا اندر ہی اندر چچی کی حرکتوں پر غصے سے بُرا حال تھا مگر وہ اپنے تاثرات چھپانے میں بہت ماہر تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اسکا رویہ ٹھیک نہیں ہے مگر فی الحال ایشال کے ساتھ ہمدردی میں وقت ضائع کرنے سے زیادہ اسے مضبوط بنانا تھا کہ وہ مزید اپنی اماں کے ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنے۔

''مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے بابا کو بتایا تو اماں مجھے گھر سے نکلوا دیں گی، وہ بابا کے سامنے اتنی اچھی بنی رہتیں ہیں کہ بابا صرف ان کی بات مانتے ہیں۔''

آزر نے تاسف سے سر ہلایا۔ بھورے بال ماتھے پر بکھر گئے۔

''مجھے نہیں پتہ ایشال کہ تمہاری اماں نے چچا کو تم سے کتنا بدگمان کر دیا ہے، میں بس اتنا جانتا ہوں کہ خونی رشتے' کہہ کر دو انگلی سے میز کی سطح بجائی'' اس طرح کھوکھلے نہیں ہوتے، یہ خون سے جڑے ہوتے ہیں۔ جس میں دنیا کے ہر میگنٹ سے زیادہ کشش ہوتی ہے۔ اس لیے تمہاری اماں کبھی بھی تمہیں بابا سے جدا نہیں کر سکتیں۔''

''تو کیا پھر میں بابا کو سب بتا دوں؟ مگر آپ اماں کو نہیں جانتے، میں بابا کو کچھ بتاؤں گی تو وہ ہزار باتیں بنا کر مجھے جھوٹا ثابت کر دیں گی۔'' آنکھوں میں آنسو لیے اس نے معصومیت سے کہا۔

''تو تمہیں کچھ ایسا کرنا ہے کہ انہیں کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔

''میں کیا کروں ایسا؟'' اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

''یہ تو تم خود سوچو! تم بھی کچھ اپنے زنگ لگے دماغ کو استعمال کرو۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

ایشال نے گیلی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا، سرمئی آنکھوں میں جمع پانی نے بھوری آنکھوں کو پریشان کر دیا۔

اپنے حق کے لیے لڑنا سیکھو ایشال! رونے دھونے سے مسائل حل......''

''رونے سے دل اور ذہن کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے تو انسان حل سوچنے کے قابل ہوتا ہے۔'' وہ آزر کی بات کاٹ کر تلملاتے ہوئے بولی۔

آزر نے حیرت سے اسے دیکھا پھر مسکراہٹ دبا کر بولا۔

''اپنے حق کے لیے لڑنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم مجھ سے ہی لڑنا شروع کر دو۔''

''سوری!'' وہ خفیف مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

واپسی کے سفر میں ان کے درمیان خاموشی تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔

''تم نے کوئی طریقہ سوچا چچا کو بتانے کا؟''

جی! مگر میں ابھی نہیں بتاؤں گی۔ بس اتنا جان لیں کہ مجھے بھی دماغ استعمال کرنا آتا ہے۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔

''ٹھیک ہے! مگر اتنا جان لو گے ایشال کہ زندگی کہ ہر موڑ پر تم آزر احمد کو ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی۔ اور تم بے فکر رہو۔ میں آج ہی امی سے بات کروں گا کہ وہ چچا پر زور دیں رخصتی کے لیے۔ کیونکہ یہ اب امی کی ہی نہیں میری بھی خواہش بن گئی ہے۔'' بھوری آنکھیں مسکرا رہی تھی۔

اس بات پر ایشال بلش کر گئی۔

☆......☆

گھر آنے کے بعد ایشال کا ٹاکرا خوش قسمتی سے اماں سے نہیں ہوا۔ وہ لاؤنج عبور کر کے سیدھا اپنے کمرے میں آئی اور ڈائری تلاش کرنے لگی جوابا نے اسے سالگرہ پر دی تھی۔ اس نے ڈائری میں سارے واقعات کچھ اس طرح لکھے، جیسے وہ دن بھر میں ہونے والی زیادتیاں فارغ وقت میں اُس ڈائری میں رقم کر دیتی ہو۔ اسے یقین تھا کہ اگر اماں کو یہ ڈائری ملی تو وہ توجہ نہیں دیں گیں۔ البتہ ابا نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔ کھٹکے کی آواز پر لکھنے کا تسلسل ٹوٹا۔ اس نے باہر نکل کر دیکھا تو اماں شعور کے ساتھ گھر میں داخل ہو رہی تھیں۔

''تم یہاں کیسے؟'' وہ ششدر سی بولیں مگر پھر وہ فوراً سنبھل کر گویا ہوئیں۔ ''میرا مطلب تم کب آئیں؟''

''بہت دیر ہوگئی ہے۔ آپ میرے لیے چائے بنا دیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ بظاہر مضبوط لہجے میں بولی مگر اندر سے اسکا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔

ایشال کے لہجے پر انہیں دوسرا جھٹکا لگا۔

''کیا کہا تم نے؟''

''میں نے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میرے لیے چائے بنا دیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولیں۔

اماں بے یقینی سے اسے دیکھتی رہیں۔ آزر کی محبت نے ایشال کو اعتماد بخش دیا تھا۔ ایسا اعتماد جو سامنے والے کو بے یقین کر دے۔ اسے پہلے کہ وہ کوئی ایشال کو کوئی کرارا جواب دیتیں، ان کا موبائل بجنے لگا۔ وہ ایشال کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتیں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

''وہ اس وقت میرے گھر میں کیا کر رہی ہے؟ اسے تمہارے پاس ہونا چاہیے تھا نا۔'' اماں کے کمرے سے سرگوشیوں کی صورت آتی آواز پر وہ پریشان ہوگئی۔

''کیا اماں آزر سے بات کر رہی ہیں۔؟'' وہ سوچتی ہوئی اماں کے کمرے کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ خطرے کی گھنٹی اس کے آس پاس بج رہی تھی۔

''میں نے خود اسے صبح چائے میں نیند کی گولیوں کی بڑی مقدار کھلائی تھی کہ تمہیں اغوا کرنے میں آسانی ہو۔ پھر وہ تمہیں کالج جاتے ہوئے کیوں نہیں ملی؟'' طیش سے ان کی آواز بلند ہوگئی۔

اس انکشاف پر ایشال پتھر کی ہوگئی۔

''ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے نیند کی گولیوں کی بڑی مقدار کھائی ہو۔'' ڈاکٹر کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ اور وہ سارا وقت یہی سوچتی رہی کہ ایک گولی کا اتنا اثر کیسے ہو سکتا ہے۔

''نہیں کالج سے نہیں اب کل گھر سے اغوا کر لینا۔ میں پورا بندوبست کر دوں گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔''

اماں کے فون بند کرتے ہی ایشال تیزی سے اپنے کمرے کی طرف آئی۔ اس نے جو سنا تھا اُس پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ اماں سے ہر ظلم کی امید کر سکتی تھی مگر یہ! یہ انتہا تھی۔ اس نے دروازہ مضبوطی سے بند کیا اور آزر کو کال ملائی۔

''آزر! اماں اغوا...... میں نے سنا۔۔ مجھے بچا لیں۔۔'' بدحواسی کی وجہ سے اس کے منہ سے بے ربط جملے نکل رہے تھے۔

''ریلیکس ایشال! مجھے ٹھیک سے بتاؤ کیا ہوا ہے؟''

اس نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ ساری بات بتائی۔

''میں بابا کو نہیں بتا سکتی! یہ بہت بڑی بات ہے، وہ بنا ثبوت کے کبھی یقین نہیں کریں گے۔''

''ہاں! تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر اب تمہارا وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ جب وہ بے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

خوف ہوکر ان اغوا کاروں کو گھر میں گھسا سکتی ہیں تو وہ کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ تم بے فکر رہو۔ میں تمہیں صبح فجر کے قریب لینے آجاؤں گا۔ میرا گھر صرف تمہارا سسرال نہیں بلکہ تمہارے تایا تائی کا بھی گھر ہے۔ تم یہاں پوری طرح سے محفوظ رہوگی۔'' اس نے ایشال کو مزید تسلی دے کر کال کاٹ دی۔ مگر پھر بھی ایشال پوری طرح سے بے فکر نہ ہوسکی۔ آزر کا آئیڈیا اسے پریشان کر رہا تھا مگر اسکے پاس کوئی اور آپشن بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی ڈائری جس حد تک ممکن تھا لکھ ڈالی، سوائے آج کے انکشاف کے۔ وہ اماں کی اس چال کو ثبوت کے ساتھ بے نقاب کرنا چاہتی تھی۔

اس نے فجر سے کچھ وقت پہلے الماری سے اپنا جہازی سائز بیگ نکالا اور اس میں اپنے چند جوڑے رکھ لیے۔ نکلنے سے پہلے اس نے اپنے بیڈ پر تکیے ڈال کر چادر ڈال دی، جس کو دیکھ کر یہ گمان ہورہا تھا کی ایشال سر تک چادر تانے سو رہی ہے۔

☆......☆

ایشال اپنے جہازی سائز ہینڈ بیگ کو مضبوطی سے تھامے بس اسٹینڈ کی بینچ پر بیٹھی تھی۔ وہ ہمیشہ فیشن کی مناسبت سے لمبی چین والا پرس ہی لیتی تھی مگر ابھی یہ ہینڈ بیگ کسی فیشن کا تقاضہ نہیں تھا، اسکی ضرورت تھی۔ اردگرد پھیلا سناٹا اور سنسان سڑکیں اسکے خوف میں اضافہ کررہی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ پہلی دفعہ باہر نکلی تھی اور نہ ہی ایسا تھا کہ وہ کوئی غلط کام کرنے جارہی تھی مگر پھر بھی انجانے خوف سے اسکا دل دھڑک رہا تھا۔ فضا میں پھیلی خنکی کے باوجود بھی اسکے ماتھے پر پسینے کے ننھے قطرے چمک رہے تھے جنہیں وہ بار بار ڈوپٹے کے پلو سے صاف کرتی۔ لرزتے ہاتھوں اس نے ہینڈ بیگ پر گرفت مضبوط کی۔ دفعتاً ایک گاڑی اسکے سامنے آکر رکی۔

گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے آزر کو پہچاننے میں اسے لمحہ بھی نہ لگا۔

وہ تیزی سے گاڑی کی طرف آئی۔ آزر کو دیکھ کر اسکا خوف قدرے کم ہوگیا تھا۔

☆......☆

''بابا!'' آواز پر حامد صاحب نے پلٹ کر دیکھا تو چوکھٹ میں ایشال کھڑی تھی۔ مگر اس کی نگاہ شعور کے بے جان وجود پر ٹھہر گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ حامد صاحب اس کے پاس آتے، چارپائی کے ساتھ سکتے میں بیٹھی سعیدہ کرنٹ کھا کر اٹھیں اور ایشال پر جھپٹیں۔

'ذلیل! منحوس! ساری عمر میرے سر پر مسلط رہیں اور جاتے جاتے بھی اپنی نحوست چھوڑ گئی۔ میرا گھر اجاڑ گئی۔ میں......''

دروازے سے داخل ہوتا آزر تیزی سے ان کے بیچ آیا اور سختی سے سعیدہ کو ایشال سے دور کیا۔

''خبردار جو کسی نے میری بیوی کو ہاتھ لگایا یا اس کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا۔'' اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کی۔ اس کی مضبوط قد و قامت کے پیچھے ایشال چھپ سی گئی۔

''اس نے نہیں! آپ نے خود اپنا گھر اجاڑا ہے۔ یہ آپ کے گناہوں کی سزا ہے جو اس معصوم کو بھگتنی پڑی۔''

''نہیں! ایسا نہیں ہے۔'' وہ چلائیں۔

''آپ نے ہی اسے مارا ہے۔ آپ اپنے لالچ میں حد سے گزر گئیں۔ ایشال پر ظلم کیے، مجھ سے شادی ختم کروانی چاہی، اسے اغوا کروانا چاہا۔ مگر آپ بھول گئی کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ بڑا ہے۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''نہیں مارا میں نے۔'' وہ صدمے سے بولتی ہوئی زمین پر ڈھے گئیں۔

''ایشال کو اغوا؟'' حامد صاحب چونکے۔

''جی! ایک بار نہیں، دو بار۔ جب یہ کالج سے اغوا نہیں کروا سکیں تو گھر سے اغوا کروانا چاہا، مگر ایشال نے سب سن لیا اور مجھے بتا دیا۔ اس لیے مجھے اسے یہاں سے لے جانا پڑا۔ اور اب تو ان کا خالہ زاد بھی حراست میں آچکا ہے، جس کے ذریعے انہوں نے ایشال کو اغوا کروانا تھا۔'' اس نے سارے واقعات بتا دیے۔

زمین پر بیٹھی سعیدہ ابھی بھی کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔

''مجھے کیوں نہیں بتایا ایشال؟'' وہ دکھ سے ایشال کو دیکھتے ہوئے بولے۔

''مجھے لگا آپ یقین نہیں کریں گے۔'' ایشال نے نم آواز میں کہا۔

انہوں نے آگے بڑھ کر ایشال کو سینے سے لگالیا۔

''مجھے معاف کردو بیٹا۔ میں تمہاری طرف سے اتنا لاپرواہ ہوگیا تھا۔ میں اس گھٹیا عورت پر یقین کر بیٹھا۔'' وہ شرمندہ لہجے میں بولے۔

پھر یکدم وہ سعیدہ کی طرف مڑے۔

''مجھے نفرت ہورہی ہے تم سے، تمہاری وجہ سے میرا بیٹا......''

''نہیں مارا! نہیں مارا میں نے۔'' وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر ہذیانی انداز میں چلانے لگیں۔

''ڈرامہ بند کرو اپنا۔'' حامد صاحب دھاڑے۔

مگر سعیدہ کچھ نہیں سن رہیں تھیں۔

''نہیں مارا! نہیں مارا!'' وہ ایک ہی گردان کیے جارہی تھی۔

شاید وہ اب واقعی میں کچھ بھی سننے یا سمجھنے کے قابل نہیں رہیں تھیں۔

☆☆☆

غزل

ہم اگر ردِّعمل اپنا دکھانے لگ جائیں
ہر گھمنڈی کے یہاں ہوش ٹھکانے لگ جائیں

خاکساروں سے کہو ہوش میں آنے لگ جائیں
اس سے پہلے کہ وہ نظروں سے گرانے لگ جائیں

دیکھنا ہم کہیں پھولے نہ سمانے لگ جائیں
عندیہ جیسے ہی کچھ کچھ ترا پانے لگ جائیں

پھول چہرے پہ سر راہ ستارہ آنکھیں
شام ہوتے ہی ترا نام بجھانے لگ جائیں

اپنی اوقات میں رہنا دل خوش فہم ذرا
وہ گزارش پہ تری سر نہ کھجانے لگ جائیں

ہڈیاں باپ کی گودے سے ہوئی ہیں خالی
کم سے کم اب تو یہ بیٹے بھی کمانے لگ جائیں

ایک بل سے کہیں دو بار ڈسا ہے مومن
زخم خوردہ ہیں تو پھر زخم نہ کھانے لگ جائیں

دعویٰ خوش سخنی خیر ابھی زیب نہیں
چند غزلوں ہی پہ بغلیں نہ بجانے لگ جائیں

○○

شاعر: رؤف خیر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

مکمل ناول

چلو عشق کا رستہ چنتے ہیں

حصہ اوّل

گلناز کے اندر جوار بھاٹا اُٹھا تھا اور اس کی سسکیوں کی آوازیں پورے کمرے میں گونج رہی تھیں... امو جان کا نروس سسٹم بری طرح متاثر ہوا تھا...... یقیناً حیدر نے ہی کوئی ایسی بات کہی ہوگی۔

''مرینہ تم نے گلنار کو دیکھا کیا؟'' پریشے نے راہداری میں کھڑی مرینہ سے پوچھا تھا۔

''ابھی تو یہیں تھی اب شاید زرینہ کے پاس نہ چلی گئی ہو تم سائنس ڈیپارٹمنٹ میں جا کر دیکھ لو۔'' مرینہ نے جواب دیا۔

''اوکے!'' کہہ کر پریشے سائنس ڈیپارٹمنٹ کی جانب بڑھ گئی اور تھوڑی پیش رفت کے بعد اس نے گلناز کو ڈھونڈ لیا تھا جو زرینہ کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی۔

''تم یہاں کھڑی ہو اور میں تمہیں پوری یونیورسٹی میں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہی ہوں۔'' پریشے اسے دیکھتے ہی ناراضگی سے گویا ہوئی۔ ''وہ پری مجھے زرینہ کو کچھ نوٹس دینے تھے اس لیے یہاں چلی آئی۔'' وہ بولی۔

''اچھا چلو اب گھر چلیں'' پریشے نے اس کا بازو کھینچا اور ساتھ ہی بیرونی گیٹ کی جانب چل دی۔

''ارے پری رکو تو مس امتیاز کا لیکچر نہیں لینا کیا۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا بازو چھڑایا۔

''نہیں کیونکہ مس امتیاز آج چھٹی پر ہیں اور مس شوکت کا بھی آف ہے۔'' پریشے نے اسے آگاہ کرتے ہوئے کہا تھا کیونکہ پریشے کو معلوم تھا کہ گلناز جیسی پڑھاکو لڑکی جلدی جانے کی وجہ ضرور پوچھے گی۔

''ہیں دونوں چھٹی پر ہیں'' وہ جواباً اپنے آپ سے بولی تھی۔

''اب ہر کوئی تمہاری طرح کا تو نہیں ہوتا کہ ایک سو دو بخار میں بھی یونی پہنچ جائے۔''

پریشے نے ایک پرانے واقعہ کا طعنہ اسے مارا تھا۔ اور وہ جواباً شرمندہ سی دائیں بائیں دیکھنے لگی تھی۔

''جلدی چلو لالہ خان کا ڈرائیور پہنچ گیا ہوگا۔'' پریشے نے دوبارہ اس کا بازو پکڑا اور اسے گھسیٹتی مرکزی گیٹ کی جانب بڑھ گئی تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

☆

جس وقت دونوں گھر پہنچیں کھانا لگ چکا تھا۔ اس لیے دونوں آتے ہی فوراً اپنے مشترکہ کمرے کی طرف بھاگیں اور پانچ منٹ میں فریش ہو کر ڈائننگ ہال میں پہنچ گئیں کھانا ابھی باقاعدہ لگا تھا اس لیے دونوں نے ہی عافیت جانی کیونکہ اموجان کا اصول تھا کہ گھر کے سب افراد کے لیے کھانا ہمیشہ اکٹھے کھایا کریں اور جو ان کے اصول سے سرتابی کرتا اس کی اموجان کے ہاتھ خوب شامت آتی۔ ان دونوں نے مشترکہ باآواز سلام کیا اور اپنی اپنی چیئرز پر بیٹھ گئی تھیں دو منٹ بعد کھانا لگا دیا گیا تھا سب خاموشی سے کھانے لگے کھانے کے بعد سبز قہوہ پیش کیا گیا تھا اور اس کے بعد خواتین اٹھ کر اپنے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں تھیں کیونکہ جب ضروری بات کرنا ہوتی اموجان گھر کی خواتین کو پردہ نشین ہونے کا حکم صادر کر دیتیں اب ڈائننگ ٹیبل پر اموجان، لالہ خان، ظہیر خان اور مہروز خان موجود رہ گئے تھے۔

''اموجان آپ نے کچھ ضروری بات کرنی تھی'' لالہ خان نے مودب انداز میں اموجان کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ ظہیر خان اور مہروز بھی ان کی جانب متوجہ ہو گئے۔

''ہاں ہمیں بہت ضروری بات کہنی ہے۔'' اموجان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تھا۔

''حکم اموجان'' لالہ جواباً بولے

''شہروز اپنے بیٹے کو یہاں بھیج رہا ہے۔'' اموجان کی اس بات نے ان تین بیٹھے نفوس کو ساکت کر دیا تھا

''کیا؟'' لالہ خان یہ سن کر حیرت زدہ رہ گئے۔

''بلکہ اجازت چاہ رہا ہے۔'' اموجان نے بات دوبارہ دہرائی تھی۔

''تو کیا آپ نے اجازت دے دی ہے۔'' مہروز خان نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''یہ سوال ہے یا رائے ہے؟'' اموجان نے جواباً ان کی طرف دیکھا تھا وہ گڑبڑا کر رہ گئے۔

''اموجان سوال ہے۔'' وہ نگاہیں جھکائے بولے تھے۔

''اگر سوال ہے تو اس سوال کا جواب بھی تمہیں معلوم ہے۔'' ان کا انداز ہنوز سپاٹ تھا۔

''تو پھر اموجان آپ کیا چاہتی ہیں؟'' لالہ جان نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے ان کی رائے جاننا چاہی۔

''کیا تم بھول گئے وہ طوفان جو بیس سال پہلے میری زندگی میں آیا تھا جس نے میرے گھر کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا میرے اجڑنے کا وقت بھول گئے۔ ان کے لہجے میں اب کے ایک گہرا کرب اتر آیا تھا جو نمکین پانیوں کی صورت ان کی آنکھوں میں بھی نظر آ رہا تھا۔

''اموجان ہم سب اس وقت کے گواہ ہیں بے شک ہم پر وہ ایک کڑا وقت تھا۔'' ظہیر خان نے ٹیبل پر دھرا ان کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لے کر دبایا تھا۔

''تو اب آپ کا کیا فیصلہ ہے؟'' لالہ خان نے سوالیہ انداز میں ان سے پوچھا۔

''تم کیا کہتے ہو؟'' انہوں نے یہ کہتے ہوئے ان تینوں کی جانب دیکھا تھا۔

''ہم'' وہ تینوں بیک وقت بولے۔

''ہاں اس دفعہ یہ فیصلہ تم لوگ کرو گے۔'' اموجان یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور ان کے کھڑے ہونے کے بعد وہ تینوں بھی احتراماً کھڑے ہو گئے۔

''کل کا وقت ہے تم لوگوں کے پاس سوچ لینا'' وہ اٹل انداز میں کہتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھیں جبکہ وہ تینوں ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر رہ گئے تھے۔

☆

''تائی جان کیا بات ہو گئی؟'' وہ دونوں اس وقت تائی پشمینہ کے کمرے میں موجود تھیں۔ جہاں چچی گل بخت اور چچی ثمرہ بھی موجود تھیں۔

''ہمیں کیا معلوم اموجان ہم سے ذکر کرتی ہیں کیا؟'' انہوں نے سوالیہ انداز میں جواب دیا۔

''کوئی ضروری بات ہی ہو گی۔'' گلناز نے اپنی رائے دی اور اس کی رائے پر پری نے اپنا سر پیٹا تھا۔

''احمقوں کی ملکہ ظاہر ہے ضروری بات ہی ہو گی مگر میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ بات کیا ہے؟''

''تو اموجان سے پوچھ آؤ۔'' گلناز بی بی نے ایک اور عقلمندانہ مشورہ دیا اور پریشے اسے خونخوار نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔

''ارے پریشے کیوں اس معصوم کو ڈانٹ رہی ہو؟'' ثمرہ چچی نے مسکراتے ہوئے گلناز کا دفاع کیا تھا۔

''معصوم اس جیسے چند اور معصوم پیدا ہو جائیں تو پوری دنیا ہی بدل جائے۔'' پریشے نے اسے دیکھتے طنزاً کہا تھا جبکہ وہ اس کے غصہ اور جھنجلانے پر سر جھکائے مسکرا رہی تھی۔

''ہماری گل جیسی تو پورے خاندان میں کوئی نہیں ہے۔'' پشمینہ تائی نے بھی محبت بھرے انداز میں کہا تھا۔

''جی یہ صرف نادر نمونہ ہمارے پاس ہی ہے۔'' پری کے تاؤ کھاتے لہجے پر وہ چاروں بے اختیار مسکرا دی تھیں۔

☆

''گڈ مارننگ ڈیڈ'' وہ ہنستا مسکراتا ہشاش بشاش سا سیڑھیاں اترتے ہوئے دور سے بولا تھا۔

''گڈ مارننگ مائی سن'' وہ بھی مسکراتے ہوئے بولے۔

''آج اتنی جلدی اٹھ گئے خیریت تو ہے نا؟'' انہوں نے جوس کا سپ لیتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

''جی ڈیڈ آج ڈیوڈ کے ساتھ سکاٹ لینڈ جانا ہے۔'' اس نے فرائی انڈے کا پیس منہ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''سب ٹھیک ہے نا؟''

''جی ڈیڈ سب کچھ ٹھیک ہے سائٹ ایریا کی طرف چکر لگانا ہے۔'' وہ بولا۔

''ہوں!'' انہوں نے ہنکارا بھرا۔

''حیدر تمہاری پاکستان کی فلائٹ کب ہے؟'' یہ پوچھتے ہوئے پتا نہیں کیوں ان کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ ایک انجانی سی چبھن انہیں اپنے دل میں گڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''جی ڈیڈ نیکسٹ سنڈے ہے۔'' وہ ان کی جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ بار بار اسے یاد دہانی کیوں کروا رہا ہے یہ ایسا ٹاپک تھا جو وہ ہر روز صبح اس سے ڈسکس کرتے تھے جس کا وہ انہیں اپنی طرف سے تسلی بخش جواب دیتا تھا لیکن اگلی صبح پھر وہی سوال اسے تیار ملتا تھا وہ اپنے باپ کی ذہنی کیفیت کے بارے میں بہت اچھی طرح آگاہ تھا اس کے باپ کے ذہن میں جو ایک خلش کا کانٹا تھا اب اسے نکالنا تھا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اور پاکستان جانا بھی اس کے مقصد کی اصل کامیابی تھی۔

☆

ڈیوڈ اور وہ آکسفورڈ یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھے نوٹس بنا رہے تھے جب نیہا اور جولی انہیں ڈھونڈتی یہاں آئی تھیں۔

''پوری یونیورسٹی میں تم لوگوں کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔'' نیہا آتے ہی حسب معمول بلند آواز میں شروع ہوگئی تھی۔

''کیوں خیریت ہے جو ہمیں ڈھونڈ رہی تھی ویسے جب تم یوں ڈھونڈتی ہو تو پھر خیریت تو نہیں ہوتی۔'' ڈیوڈ نے شرارت سے کہتے نیہا کو چھیڑا تھا حیدر بھی اس کی شرارت خیز مسکراہٹ دیکھ کر ہنس پڑا تھا۔

''تم دونوں سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔'' نیہا غصے سے پیر پٹختی واک آؤٹ کرگئی تھی۔

''یار سن لیتے، کیا کہہ رہی تھی، شاید کوئی ضروری بات ہو'' حیدر نے اب کے سیریس ہو کر کہا تھا۔

''اس کی 'ضروری بات' اگر تمہیں پتہ چلے تو کانوں کو ہاتھ لگاؤ۔''

''کیوں؟'' وہ سوالیہ بولا۔

''کہہ رہی ہے مسٹر جانسن کے کمرے میں ربڑ کے سانپ چھوڑتے ہیں، کیونکہ انہوں نے اس کی انسلٹ کی ہے۔'' ڈیوڈ نے اسے اصل بات بتائی تو اس کا قہقہہ بے اختیار لائبریری کے چاروں اور گونج اٹھا تھا۔

☆

لالہ خان جب اپنے کمرے میں آئے تو رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ نیند تو نہیں ویسے بھی کم آتی تھی مگر جو تھوڑی بہت آتی تھی امو جان کے فیصلے نے وہ بھی اڑا دی تھی۔ وہ نڈھال سے چلتے دیوار گیر کھڑکی کے ساتھ ایزی چیئر پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے تھے۔ درد تھا کہ ان کے انگ انگ میں سرایت کر رہا تھا۔

''شہروز بھائی آپ کے لائے طوفان نے میری زندگی کو کیسے ویران کیا ہے اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں ہے امو جان کو بھی نہیں۔ کرب کی اک لہر ان کے پورے جسم میں اٹھی تھی۔ اس سب میں میرا کیا قصور تھا جس کی مجھے اتنی بڑی سزا ملی۔ میں کہاں سے انصاف تلاش کروں میرے درد کا مداوا کون کرے گا؟'' ان کے دل سے سوالوں کی ہوک نکل نکل کر کمرے میں گردش کر رہی تھی۔

میں نے عشق کا راستہ چنا تھا مگر آپ سب نے مجھے درد کا راستہ چننے پر مجبور کر دیا۔ ضبط کی انتہا ختم ہو چکی تھی اور نمکین پانی قطروں کی مانند ان کے گالوں پر بہتا جا رہا تھا

☆

وہ چاروں اس وقت کیفے ٹیریا میں بیٹھیں سموسوں سے بھرپور انصاف کر رہی تھیں جب مرینہ نے ان تینوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''کیا ہے؟'' پری نے آدھا سموسہ منہ میں ڈالتے جواباً اسے دیکھا۔

''تمہیں کوئی نئی خبر پتا چلی کیا؟'' اس کا اشارہ گلناز کی جانب تھا۔

''نہیں تو'' گلناز نے لاعلمی سے سر ہلایا۔

''کیا خبر ہے؟'' اب کے زرینہ نے بھی پوچھا۔

''گلناز کے ڈیپارٹمنٹ میں بیالوجی کی نئی پروفیسر مس عائلہ خان زئی آرہی ہیں۔'' مرینہ نے ان سب کو بتایا۔

''ہوں اچھا مگر یہ تو گلناز کے لیے گڈ نیوز ہے'' پری نے سر جھٹکا اور دوبارہ سموسہ اٹھالیا۔

''اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کی رابعہ بتا رہی تھی کہ بہت گریس فل شخصیت ہیں۔'' مرینہ نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''جلدی سموسہ کھاؤ اور عائلہ نامہ بند کرو مس شوکت کا پریکٹیکل اسٹارٹ ہونے والا ہے۔''

زرینہ نے کہا تو وہ سب جلدی جلدی کھانے لگیں مگر گلناز کی پتا نہیں کیوں یہ نام سن کر دل کی کلی کھل اٹھی تھی۔

☆

آج ان تینوں بھائیوں کو امو جان کی عدالت میں پیش ہونا تھا۔ وہ تینوں اکٹھے ان کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ امو جان نماز پڑھنے میں مصروف تھیں وہ تینوں خاموش سے نواڑی کرسیوں پر بیٹھ کر ان کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے تھے۔ تینوں بھائی اپنی اپنی سوچ میں گم تھے اور دل میں سوچ رہے تھے کہ امو جان نے انہیں کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔ امو جان نماز ختم کرنے کے بعد اب دعا مانگ رہی تھیں چند لحموں بعد دعا سے فارغ ہو کر ان کی جانب متوجہ ہوئیں۔

''السلام علیکم'' تینوں نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام'' انہوں نے جواب دیا تھا اور نماز کی چوکی سے اٹھ کر اپنے نواڑی پلنگ پر جا کر بیٹھ گئی تھیں۔

''ہاں تو پھر تم تینوں کا کیا فیصلہ ہے؟'' انہوں نے اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے پوچھا تھا

''امو جان گستاخی معاف کیجیے گا ہماری زندگی کے تمام فیصلے آپ کرتی آئی ہیں جن کا حق بھی ہم نے آپ کو دے دیا ہے پھر آپ یہ فیصلہ ہمیں کرنے کا کیوں کہہ رہی ہیں؟'' ظہیر خان آج پہلی مرتبہ ان کے سامنے کھل کر بولے تھے۔

''تم نے وہ کہاوت سنی ہوگی کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے اور ہم بھی اس کہاوت کی مثال بن گئے ہیں میں زری گل جمال جس نے عہد کیا تھا کہ شہروز کی زندگی بھر شکل نہیں دیکھوں گی آج ہار گئی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ان کے لہجے کا دبدبہ کہیں دور جا سویا تھا۔ اس وقت وہ مکمل ماں کے روپ میں لوٹ آئی تھیں۔ اس ماں کے لیے سب کچھ اس کی اولاد ہوتی ہے۔

''جرم شہروز نے کیا تھا اس کی اولاد نے نہیں کہ میں شہروز کے کیے کی سزا اس کے بیٹے کو دوں۔'' انہوں نے لحہ بھر توقف کیا اور دوبارہ گویا ہوئیں۔

''اور رہی بات تم لوگوں کو فیصلہ کرنے کا کیوں کہا تو بات یہ ہے کہ اب یہ گھر تم لوگوں کا ہے اس پر شہروز یا اس کے بیٹے کا کوئی حق نہیں تم اگر چاہو تو انکار بھی کر سکتے ہو مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے کیونکہ ساری زندگی تم میری جائز ناجائز مانتے آئے ہو اس دفعہ میں تمہاری مانوں گی۔'' امو جان تفصیلاً بات کر کے خاموش ہوگئی تھیں۔ اب ان کی نگاہیں ان تینوں پر تھیں جیسے ان کے فیصلے کی منتظر ہوں۔

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے امو جان۔'' سب سے پہلے لالہ خان بولے تھے

''وہ ہمارا خون ہے اور ہم اتنے کم ظرف نہیں ہیں کہ اپنے خون کو رد کر دیں۔'' یہ مہروز خان تھے۔

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں امو جان شیروز چاہے جیسا بھی ہے، ہے تو ہمارا بھائی۔ جو اس نے کیا وہ اس کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اعمال۔'' ظہیر خان بھی اپنی کہہ کر خاموش ہو گئے تھے اور بیس سال کے بعد اموجان کی خشک ہوئی آنکھوں سے چند آنسو بہہ نکلے تھے۔ ان کی سرد مہری کا خول آہستہ آہستہ ٹوٹتا جا رہا تھا۔

☆......

''تو تم ہمیشہ کے لیے پاکستان جا رہے ہو؟'' وہ چاروں اپنی مخصوص جگہ یعنی لائبریری میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب حیدر کی بات پر نیہا نے بے ساختہ خیال ظاہر کیا تھا

''نہیں ہمیشہ کے لیے تو نہیں مگر یہ بھی نہیں جانتا کہ کتنے ٹائم کے لیے'' وہ جواباً بولا تھا۔

''تم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے پاکستان جانے کا' شاید اس طرح انکل کی لائف ٹھیک ہو جائے۔'' جولی نے بھی اس کے پاکستان جانے پر اسے Appriciate کیا تھا کیونکہ وہ حیدر کے اس اقدام سے بہت خوش تھی۔

''ہاں یار جولی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ انکل کو اب اپنوں کی ضرورت ہے۔ اب یہ سو کالڈ خاندانی نفرتیں ختم ہو جانی چاہئیں۔'' ڈیوڈ نے بھی اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

''میں تمہارے پاکستان جانے کے حق میں ذرا بھی نہیں ہوں کیونکہ میں ایک اچھا دوست کھونا نہیں چاہتی مگر انکل کی حالت دیکھ کر یہ کڑوا گھونٹ پینے کو تیار ہوں۔'' نیہا نے اپنے ازلی منہ پھٹ انداز میں اس سے کہا تھا اور وہ اپنے ان تینوں دوستوں کی بے لوث محبتوں پر اپنے اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ آج کے دور میں جب مخلص دوست ملنا ناپید ہو گئے ہیں اس کو اتنے اچھے دوست ملے تھے۔

''نیہا میرے جانے کے بعد تم کسی ٹیچر کے ساتھ کوئی شرارت نہیں کرو گی۔ وعدہ کرو۔'' حیدر نے اسے سمجھایا تھا جبکہ جولی اور ڈیوڈ مسکرانے لگے تھے

''ہوں۔'' وہ لمبا سا ہوں کہہ کر سوچنے لگی اور پھر چند لمحوں بعد بولی

''او کے نہیں کروں گی پر ایک شرط پر۔'' اس نے یہ بول کر ساتھ ہی شرط رکھ دی تھی

''کیسی شرط؟'' حیدر نے ناسمجھی کے عالم میں پوچھا۔

''پہلے وعدہ کرو۔'' وہ بولی تھی۔

''حیدر مت کرنا، پہلے بات سن لو کیونکہ اس کی شرطیں خطرناک ہی ہوتی ہیں' ڈیوڈ نے اسے روکا تھا جبکہ جولی اب بھی مسکرا رہی تھی۔

''کچے ٹنڈے کے منہ والے شکل اچھی نہ ہو تو بات ہی اچھی کر لیا کرو۔'' نیہا نے ایک زور کا دھکا اس کی کمر پر لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''وعدہ!'' حیدر نے ہاتھ آگے کر دیا۔

''دیکھا یہ ہوتا ہے اندھا اعتماد'' نیہا جواباً فاتح نظروں سے ڈیوڈ کو چڑا رہی تھی۔

''اب بولو کیا شرط ہے؟''

''یہ کہ تم اپنے ساتھ جب آؤ گے تو اپنے جیسی خوبصورت ہمارے لیے بھابھی لاؤ گے۔'' نیہا نے شرط سنا دی جبکہ حیدر اس کے بچپنے پر مسکرا کر رہ گیا۔

''دیکھا میں نے کہا تھا نہ اس کی شرطیں خطرناک ہوتی ہیں سوچ لینا' ڈیوڈ مصنوعی گھبراہٹ طاری کیے بولا تھا۔

''جولی اپنے اس کو سنبھالو'' نیہا نے اب ڈیوڈ کے کمزور پوائنٹ پر ہاتھ ڈالا تھا۔

''میں کیا'' جولی یکدم اپنے گھسیٹے جانے پر ہڑبڑا کر رہ گئی۔

''قسم سے سو شیطانوں کو ڈالو تو ایک نیہا بنتی ہے۔'' ڈیوڈ بے بس سا دانت کچکچا کر رہ گیا تھا۔

''تو بولو کیا کہتے ہو'' نیہا اب دوبارہ اس کی جانب آئی تھی۔

''او کے منظور ہے مگر اگر نہ ملی تو......'' حیدر نے زیر لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''تو پھر میں یہاں تمہاری کسی افریقن گدھی سے شادی کرا دوں گی۔'' نیہا نے دھمکی دی تھی اور وہ اس کی دھمکی پر بے ساختہ مسکرا اٹھا تھا۔

☆......

اموجان کی سوات سے کچھ عزیز رشتے دار عورتیں ملنے آئی ہوئی تھیں اس لیے گلناز اور پری نے ان کے غم پر یونیورسٹی سے چھٹی کر لی تھی کیونکہ گھر میں صرف ثمینہ تائی موجود تھیں گل بخت چاچی اور ثمرہ چاچی لالہ خان کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف گئی ہوئی تھیں اس لیے مہمانوں کی خاطر مدارات کا ملبہ ان دونوں پر آ گرا تھا گلناز تو خاموشی سے اپنے حصے کا کام کرتی خوش اسلوبی سے نمٹا رہی تھی جبکہ پری برے برے منہ بناتی کام کر رہی تھی۔

''پری جلدی ہاتھ چلاؤ۔'' کھانے کے ٹائم میں تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔'' ثمینہ نے اس کی سست روی دیکھ کر اسے ٹوکا تھا۔

''کر تو رہی ہوں اور کیسے کروں؟'' وہ جواباً ناک چڑھائے بولی۔

''گلناز تم اب چائے کی ٹرے زنان خانے میں دے کر آؤ۔'' ثمینہ نے چائے کی ٹرے اسے تھماتے ہوئے کہا تھا وہ دوپٹہ درست کرتی زنان خانے کی جانب بڑھ گئی تھی

''گل بخت تو تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہے نا اور اس کی بیٹی بھی ہے تم لوگوں نے پرائے مال کو کیوں رکھا ہوا ہے۔'' اس نے دروازے کی ہان پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر بیٹھی کسی عورت کا یہ کہا گیا جملہ اس کی ہنسی کے پرخچے اڑا گیا تھا وہ یکدم ہڑبڑا کر رہ گئی تھی جس کے نتیجے میں گرم گرم چائے تھوڑی سی اس کے ہاتھوں پر چھلک گئی تھی اس کا وجود آندھیوں کی زد میں آ گیا تھا۔

''کیا ہوا یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' پری نے اسے دروازے پر ایستادہ دیکھ کر پوچھا تھا۔

''پری، یہ چائے تم اندر لے جاؤ مجھے چکر آ رہے ہیں۔'' اس نے چائے کی ٹرے اس کی جانب بڑھائی اور تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بھاگ گئی۔

''ہیں اسے کیا ہوا؟'' پری نے سوچا اور پھر اگلے ہی لمحے سر جھٹک کر اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆......

کمرے میں آتے ہی اس کے اندر کا جوار بھاٹا پھر اٹھا تھا اس کی سسکیوں کی آوازیں پورے کمرے میں گونج رہی تھیں۔

''تو کیا لالہ خان میرے ابو نہیں ہیں؟'' اس احساس نے ہی اس کی جان نکال ڈالی تھی۔

''نہیں وہ عورت جھوٹ بول رہی ہو گی یا کوئی اور بات ہو گی۔ ایسا نہیں ہو سکتا اگر ہم اس گھرانے کی بیٹیاں نہ ہوتیں تو یہ لوگ ہمیں کیوں رکھتے'' وہ اپنے آپ کو تسلی دلاسوں سے مطمئن کر رہی تھی پر پھر بھی کچھ ایسا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھا کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح مطمئن نہ کر پائی تھی۔

......☆......

''حیدر تم نے شاپنگ تو کر لی ہے نہ تیاری مکمل ہے تمہاری'' وہ اس وقت شہروز خان کے آفس میں بیٹھا ایک فائل دیکھ رہا تھا جب انہوں نے اس سے پوچھا تھا اس نے چونکنے کے انداز میں سر اٹھایا۔

''جی بابا میری مکمل تیاری ہے۔'' وہ سرسری سا جواب دے کر دوبارہ فائل میں گم ہو گیا تھا۔

''میرا مطلب ہے اموجان کے لیے، گھر والوں کے لیے۔'' چند لمحوں بعد وہ دوبارہ گویا ہوئے تھے۔

حیدر ان کے اس انداز پر مسکرا اٹھا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا یہ سوال وہ ضرور کریں گے۔

''نو بابا میں نے تو نہیں کی دراصل مجھے ان لوگوں کی پسند ناپسند کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔'' وہ جواباً بولا ''مجھے سب پتا ہے۔'' وہ بے ساختہ بول اٹھے تھے۔ اس نے ان کی جانب دیکھا تو وہ یکدم نگاہیں جھکا گئے تھے۔

''جی بابا آپ مجھے بتائیں میں سب خرید لوں گا۔'' اس نے بغیر کوئی تاثر دیئے کہا۔

''اموجان کو کڑھائی والی چادریں پسند ہیں، مہروز اور ظہیر کو عمدہ اور جدید قسم کے پین پسند ہیں جبکہ لالہ کو، لالہ کا ذکر کرتے ہی یکدم وہ خاموش ہو گئے تھے......

''اور لالہ اکا جان کو کیا پسند ہے؟'' حیدر نے سوال کیا تو وہ چونکے۔

''ہاں اسے گھڑیاں بہت پسند ہیں۔'' وہ دھیرے سے مسکرائے تھے۔

''اور تائی پشمینہ، چچی ثمرہ اور چچی گل بخت اور ان کی بیٹی گلناز اور ظہیر تایا کی بیٹی پریشے کو کیا پسند ہے'' اس نے ایک ہی سانس میں باقی سب افراد کی پسند کا بھی پوچھ ڈالا تھا اور وہ اسے مسکراتے ہوئے بتانے لگے تھے

......☆......

صبح جب وہ یونیورسٹی جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھی تو پورا راستہ خاموش رہی حالانکہ پری اس سے ادھر ادھر کے سوال جواب کرتی رہی جن کا وہ محض ہاں ہوں میں ہی جواب دیتی رہی تھی یونیورسٹی آنے کے بعد بھی وہ خاموش رہی پری نے ایک دو دفعہ اس سے خاموش ہونے کی بابت پوچھا تو وہ ٹال گئی تھی آج مس عائلہ خان زئی کا پہلا دن تھا دو پیریڈ کے بعد گلناز کی کلاس کا انہوں نے اپنا پہلا پیریڈ لینا تھا وہ جو نئی ٹیچر کے آنے پر خوش تھی اب ساری خوشی بھول چکی تھی اس کے ذہن کے پردے پر بس اب ایک سوال نقش ہو گیا تھا کہ وہ کون ہے؟ کس خاندان کی ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ ایسے بہت سے سوال اسے بے چین کر رہے تھے۔

......☆......

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترک الفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں
نہ چھیڑ اے ہم نشیں کیفیت صہبا کے افسانے
شراب بے خودی کے بھر کر ساغر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترک محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

لالہ خان کے کمرے کے سامنے سے گل بخت گزری تو غزل کے ان بولوں نے ان کے پاؤں جکڑ لیے کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ لالہ خان کو آج کل پھر دورہ پڑا ہوا ہے اور جب ایسا ہوتا تو پھر ایسی ہی غزلوں نغموں کی آواز ان کے کمرے سے آتی تھی انہوں نے پلٹ کر ان کے دروازے پر دستک دی اور دروازے کا ناب گھماتی آہستہ سے ان کے کمرے میں داخل ہو گئیں آگے وہ ان کے سوچے ہوئے حلیے کے مطابق موجود تھے دیوار گیر لائٹ کے پاس رکھی ایزی چیئر پر بے خودی سے جھول رہے تھے جبکہ سامنے رکھا ریکارڈ مغنیہ کی آواز کے ساتھ اپنی پیلی پیلی روشنیاں پورے کمرے میں بکھیر رہا تھا انہوں نے آہستہ سے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن بند کیا اور ان کی جانب آئیں ریکارڈ بند ہونے پر وہ ہوش و خرد کی دنیا میں واپس لوٹ آئے تھے ان کو دیکھا تو چونک کر سیدھے ہوئے۔

''آپ یہاں اس وقت خیریت تو ہے نا!'' وہ انہیں اپنے کمرے میں اس وقت دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔

''جی خیریت ہے مگر مجھے اس وقت آپ خیریت میں نہیں لگ رہے۔'' ان کے لہجے میں طنز چھپا تھا جسے لالہ خان نے بخوبی نوٹ کیا تھا۔

''مجھے کیا ہوا ٹھیک ہوں میں۔'' وہ انجان بنے بولے تھے۔

''اتنے انجان بننے کی ایکٹنگ بند کر دیجیے۔ بس اب بہت ہو گیا اب آپ کا یہ سوگ، جایئے اور اپنے لیے اسٹینڈ لیجے یہ آپ کی زندگی ہے کسی اور کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ آپ کی زندگی سے کھیلتا پھرے۔'' گل بخت نے دوٹوک بات کی تھی اور وہ ان کی بات پر لبوں پر زخمی مسکراہٹ سجائے مسکرا اٹھے تھے۔

''جب اسٹینڈ لینے کا وقت تھا تب نہیں لیا اب کیا فائدہ۔'' ان کا لہجہ ہنوز زخمی تھا۔

''کسی سے محبت کا دعویٰ کر کے اسے سر راہ چھوڑ دینا بہادری نہیں ہوتی بزدلی ہوتی ہے'' انہوں نے ایک اور طنز کا تیر چھوڑا تھا۔

''ہاں میں بزدل ہوں ایک گرا ہوا شخص ہوں مجھے کسی سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' وہ یکدم آپے سے باہر ہو گئے تھے

''شاہ زر ہوش کیجیے یوں چیخنے چلانے سے مسئلے حل نہیں ہوں گے۔'' گل بخت ان کی پھوپی کی بیٹی تھیں اور کسی زمانے میں ان کی دوستی بھی رہی تھی اس لیے وہ ان سے بحث مباحثہ کر لیتی تھیں ورنہ اور کسی میں جرات نہیں تھی کہ وہ شاہ زر خان سے سوال جواب کرتا۔

''اگر شہروز لالہ کے ایک غلط اقدام سے یہ گھر بکھرا تھا تو اس کے بعد آپ کی نادانیوں اور بے وقوفیوں نے اسے زیادہ بگاڑا تھا۔ اگر انا کا راستہ چننے کے بجائے معافی کا راستہ چنتے تو یہ گھر کبھی نہ بکھرتا۔ اس گھر کو بکھیرنے میں صرف شہروز قصوروار نہیں ہیں آپ سب قصوروار ہیں۔'' گل بخت زیادہ نہیں بولتی تھیں مگر جب بولتیں تو پھر اگلے بندے کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیتی تھیں۔

''آپ کب تک دوسروں کی زندگیوں کو سنوارتے اور اپنی زندگی کو بگاڑتے رہیں گے۔'' انہوں نے اب کے نرم لہجے میں کہا تھا۔

''میری زندگی تو کب کی بگڑ چکی ہے جسے سنوارنے کا وقت بہت پیچھے چلا گیا ہے اتنا پیچھے کہ اب میں چاہوں بھی تو واپس نہیں لا سکتا'' وہ کھوئے کھوئے سے بولے تھے۔

''آپ چاہیں تو واپس آ سکتا ہے بس تھوڑے سے حوصلے اور استقامت کی ضرورت پڑتی ہے'' گل

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بخت نے ان کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''گلناز کیسی ہے؟ اتنے دن ہوئے اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی'' انہوں نے دانستہ موضوع چینج کر دیا اور گلناز کی بابت پوچھنے لگے

''ٹھیک ہے اور مجھے لگتا ہے اسے حقیقت سے آشنا کر دینا چاہیے کیونکہ اب وہ باشعور ہو چکی ہے اور اسے اپنا اصل معلوم ہونا چاہیے۔ یہ اس کا حق بھی ہے۔'' گل بخت جواباً بولی تھیں۔

''ہوں صحیح کہا آپ نے امو جان سے اس حوالے سے بات کی آپ نے۔'' وہ پرسوچ سے پوچھنے لگے تھے۔

''نہیں ابھی تو نہیں کی پر جلد کروں گی کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ اسے یہ بات کسی اور کے منہ سے پتہ چلے۔'' انہوں نے رسانیت سے کہا۔

''بیس سال پہلے جو ہوا اس کے نشان مٹے نہیں پر مدہم ضرور ہو گئے۔''

''وقت کی دھوپ اچھے برے واقعات جو رونما ہوتے ہیں انہیں اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور انسان کو آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔ گل بخت نے اپنا تجربہ بیان کیا تھا اور لالہ خان ان کی بات پر محض سر ہلا کر رہ گئے تھے۔

''رات کافی ہو گئی ہے۔ اب چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھیں اور اچانک رک گئیں۔

''میری بات پر غور ضرور کیجیے گا۔'' کہہ کر باہر نکل گئی تھیں جبکہ لالہ خان ہلتے پردے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔

☆......☆

عائلہ خان زئی یونیورسٹی کے پہلے دن ہی تمام لڑکیوں کی پسندیدہ بن گئی تھیں ان کی گریس فل شخصیت نرم گفتاری، مدہم ٹھہرے لہجے نے ہر لڑکی کا دل موہ لیا تھا کلاس میں گلناز کا تعارف بھی ان کے ساتھ ہوا تھا مگر وہ اس واقعہ کے زیر اثر تھی اس لیے دوسری لڑکیوں کی طرح زیادہ چارم نہ ہوئی تھی اس عورت کی باتیں مسلسل اس کے ذہن میں ہتھوڑے کی مانند برس رہی تھیں اور بے کلی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اُڑ کر کسی ایسے شخص کے پاس پہنچ جائے جو اسے تمام حقیقت سے آگاہ کر دے اور کہہ دے کہ جو اس نے سنا ہے سب غلط ہے، جھوٹ ہے وہ شاہ زر خان کی بیٹی ہے بس کوئی اتنا کہہ دے اس کی تسلی ہو جائے مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی حقیقت سے جتنا بھاگا جائے وہ اتنا ہی آپ کا تعاقب کرتی ہے۔

☆......☆

کل اس کی پاکستان میں فلائٹ تھی اور اس خوشی میں شہروز خان اپنے گھر ایک چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا تھا جس میں ان کے آفس کے کچھ کولیگ چند دوست احباب شامل تھے جبکہ حیدر کی طرف سے نیہا، جولی اور ڈیوڈ آئے تھے وہ چاروں اس وقت ایک الگ تھلگ ٹیبل پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''ہمارے پاس چند گھڑی بیٹھ جاؤ اڑتے پھر رہے ہو'' نیہا نے حسب عادت شکوہ کیا۔

''نیہا ڈیر اور مہمانوں کو بھی تو دیکھنا پڑتا ہے'' وہ اس کے شکوے پر مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''مس نیہا آفندی کا دراصل کہنا یہ ہے کہ اور سب جائیں بھاڑ میں صرف ہمیں پروٹوکول دیا جائے کیوں؟'' ڈیوڈ نے یہ کہتے ہوئے نیہا کی جانب تائیدی نظروں سے دیکھا

''یہ چیز...... ڈیوڈ تم میری کمپنی میں رہتے ہوئے کتنے ذہین ہو گئے ہو'' نیہا نے فخریہ کالر جھاڑے تھے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com
ہاں یہ تو ہے!''

''او کے آل بوائز جانے سے پہلے میں چند باتیں کہنا چاہوں گا۔'' حیدر نے ٹیبل بجا کر ان سب کو اپنی جانب متوجہ کیا تھا وہ تینوں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے

''اپنی اسٹڈی پر پورا دھیان دینا ہے، نوشی اور خاص طور پر نیہا تم نئے آنے والے اسٹوڈنٹس کے ساتھ کسی قسم کا مذاق نہیں کرو گی، ٹیچرز کو بھی مت تنگ کرنا، اچھی بچی بن کر رہو گی تو میں تمہیں بھابی گفٹ کروں گا۔'' آخر میں وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔

''اوہ'' نیہا نے جواباً ہونٹ سکیڑے۔

''کیا ہوا؟'' حیدر نے پوچھا۔

''تمہاری باتوں پر عمل کرنا مشکل ہے مگر بھابی کے لیے کڑوا گھونٹ پینا منظور ہے۔'' وہ برے برے منہ بناتی بولی تھی۔

''تھینکس!'' وہ ہنس دیا تھا۔

☆......☆......☆

گلناز تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' وہ گھر کی پچھلی جانب بنے باغ میں جھولے پر بیٹھی اپنے خیالوں میں گم تھی جب پریشے اس کے سر پر آ کر بولی تھی۔

''کیا ہوا ہے مجھے؟'' انداز ہنوز گم تھا۔

''واہ جی واہ تمہاری مشکوک سرگرمیاں کھویا کھویا انداز کیا ہو گیا ہے تمہیں اگر کوئی مسئلہ ہے تو بولو۔'' پریشے اب کچھ نرم انداز میں بولی تھی۔

''جب کوئی مسئلہ ہے ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔'' وہ جھنجلا اٹھی۔

''او۔کے تمہاری مرضی۔'' پریشے یہ کہہ کر فوراً اندر کی جانب بڑھ گئی۔ گلناز جانتی تھی کہ وہ ناراض ہو کر گئی ہے مگر وہ یہ بات اسے کیسے بتاتی جو وہ خود سے بھی کرنے سے ڈرتی تھی

''مجھے امی سے بات کرنا ہو گی۔'' یکدم اسے کچھ خیال آیا اور وہ تیزی سے گل بخت کے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

شہروز اور حیدر جب تمام مہمانوں کو الوداع کہہ کر چھوڑ آئے تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔

''حیدر اب تم آرام کرو صبح پھر جلدی اٹھنا ہے۔'' انہوں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں ڈیڈ آج میں اور آپ باتیں کریں گے۔'' وہ انہیں بازو سے تھام کر ڈرائنگ روم میں لے آیا تھا۔

''کیا باتیں کرنی ہیں؟'' وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولے تھے۔

''مجھے ایک مرتبہ پھر وہ سب کچھ سننا ہے وہ ان کی ٹانگوں پر سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

''اس میں اذیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' وہ افسردہ ہو گئے۔ وہ خاموشی سے ان کے چہرے کی جانب دیکھنے لگا تھا وہ اپنی عمر سے زائد بوڑھے لگنے لگے تھے ان کے چہرے پر ایک مستقل کرب ٹھہرا ہوا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

"کیا دیکھ رہے ہو؟" انہوں نے اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر پوچھا تھا۔

"یہ کہ اب آپ کتنے بوڑھے لگتے ہیں، اپنا بالکل بھی خیال نہیں رکھتے۔" وہ بولا۔

"یار اب بوڑھا ہو گیا ہوں تو بوڑھا ہی لگوں گا۔" انہوں نے اس کی بات کو مذاق میں ٹالا تھا۔

"نہیں ڈیڈ آپ کی عمر اتنی نہیں ہے جتنے آپ نظر آتے ہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم بیٹے کی نظر سے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے ایسا کہہ رہے ہو وہ ہولے سے مسکرائے تھے۔

"ڈیڈ مما کی آپ سے ملاقات کہاں ہوئی تھی؟" اس نے وہ سوال چھیڑ دیا تھا جو نئے سرے سے ان کے زخموں کے کھرنڈ ادھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ پشیمانی ندامت ان کو اپنی لپیٹ میں نئے سرے سے لے لیتی تھی۔

"تمہیں ایک بات کہوں گا یا نصیحت جو بھی کہہ لو جب انسان جوان ہوتا ہے تو اسے اپنے آپ پر بڑا زعم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بل بوتے پر جو چاہے کر سکتا ہے رشتوں کے بغیر ان کے سہارے کے بغیر زندگی گزار سکتا ہے کیونکہ اسے اپنی جوانی کا غرور ہوتا ہے مگر وہی شخص جب بڑھاپے کی عمر میں پہنچتا ہے تو نہ رشتوں کو تلاش کرتا ہے ان کے سہاروں کو تلاش کرتا ہے بڑھاپے میں جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ رشتے ہوتے ہیں۔" کہتے ہوئے وہ لحظہ بھر رکے تھے۔

اور میں نہیں چاہتا کہ تم رشتوں کے بغیر زندگی گزارو اس لیے میں تمہیں تمہارے اصل کی جانب بھیج رہا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا میری بدنصیبی تم پر سایہ کرے۔" ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ننھے ننھے قطرے نظر آنے لگے تھے۔

"بابا میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے نہ کہ میں آپ کو اپنے خاندان سے ضرور ملواؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ یکدم اٹھ بیٹھا۔"

"ہاں میں شدت سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی لیے مسکرائے تھے۔

"بس آپ میرے لیے دعا کیجیے گا۔" وہ بے اختیار ان کے سینے سے لگ گیا تھا۔

"میری دعائیں ہر پل تمہارے ساتھ ہیں اللہ تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب کرے آمین۔"

انہوں نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے دل سے دعا دی تھی۔

"بابا میں آپ کو اور یہ تنہائی کاٹنے نہیں دوں گا۔" میرا وعدہ ہے آپ سے اس نے دل میں پکا عہد کیا تھا

☆......

"کیوں اب تک اس بے وفا کی آس پہ بیٹھی ہوئی ہے برسہا برس بیت گئے اس نے پلٹ کر خبر تک نہ لی مگر تم اب بھی اس کے انتظار میں ہو کیوں اپنی زندگی اجاڑ رہی ہو۔" زہرہ نے آج پھر اسے سمجھایا تھا۔ اس کا اب معمول بن چکا تھا وہ جب بھی اس کی طرف آتی اس موضوع کو ضرور گوش گذار کرتی اور پھر اسے ایک لمبا سا اچھی زندگی گزارنے کا لیکچر دیتی، وہ اس کی باتیں آرام سے سکون سے سن لیتی تھی۔ مگر ماننے میں اس کا اختیار نہ تھا جیسے زہرہ کو اسے سمجھانا زہرہ کے اختیار میں نہ تھا ایسے ہی اسے بھی اختیار نہ تھا دونوں اپنی اپنی جگہ بے بس تھیں۔

"آس تو محبت کی سب سے پہلی کڑی ہوتی ہے اگر محبوب کی آس ہی ختم ہو جائے تو محبت ہی پر ختم ہوئی، محبت کو زندہ رکھنے کے لیے آس ضروری ہوتی ہے۔" اس نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا تھا اور وہ اس کے فلسفے پر اور چڑ گئی تھی۔

"پوری زندگی اس فلسفے پر عمل کرتی رہنا مگر حاصل کچھ نہ ہوگا جس کی آس لگائے بیٹھی ہو وہ اپنی زندگی گزار رہا ہوگا اسے تمہارا خیال تک آتا نہ ہوگا۔" زہرہ کو بے حد تاؤ آیا تھا۔

"میں جانتی ہوں ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا اس کی محبت اتنی کمزور نہیں تھی زہرہ۔" وہ پر یقین لہجے میں بولی تھی

"کمزور تھی تب ہی تمہیں بیچ منجھدار میں چھوڑ گیا۔" اب کے وہ خاموش ہو گئی تھی شاید اس بات کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔

☆......

وہ گل بخت کو ڈھونڈتی ان کے کمرے میں آئی تو وہ وہاں موجود نہ تھیں۔ اب وہ اس خیال کے تحت کچن میں آئی کہ شاید وہاں موجود ہو مگر وہ وہاں بھی نہ تھیں۔ کچن میں ثمرہ چاچی مہروز خان کے لیے قہوہ بنا رہی تھی۔

"ثمرہ چاچی امی کہاں ہیں؟ آپ نے دیکھا ہے انہیں۔" اس نے دروازے میں ہی کھڑے ہو کر ان سے پوچھا وہ اس کے پکارنے پر پلٹی تھیں۔

"ہاں وہ اموجان کے کمرے میں ہیں۔" ثمرہ چاچی نے بتایا تو وہ فوراً اموجان کے کمرے کی طرف چل دی۔ عام حالات ہوتے تو وہ اموجان کے کمرے میں جاتے ہوئے سو مرتبہ سوچتی۔ اسے شروع ہی سے اموجان کی شخصیت سے خوف آتا تھا حالانکہ اموجان اس سے بھی سخت طریقے سے پیش نہ آتی تھیں مگر ان کی شخصیت کو لے کر اس کے اندر خوف بیٹھ گیا تھا۔ پریشے کا بھی یہی حال تھا مگر وہ اموجان کے سامنے بات کر لیتی جب کہ اس کی تو اموجان کو دیکھ کر گھگی بندھ جاتی تھی اور وہ آج اس واقعہ کے اتنے زیر اثر تھی کہ اموجان کا ڈر خوف بھی کہیں دور جا سویا تھا۔ اموجان کے دروازے کے سامنے پہنچ کر اس نے ہولے سے دستک دی۔

"آجاؤ!" دستک دینے کے چند منٹ بعد اموجان کی آواز گونجی تو وہ ناب گھماتی آہستہ سے اندر داخل ہو گئی۔ کمرے میں آگے گل بخت اور لالہ خان موجود تھے۔ لالہ خان کو دیکھ کر وہ یکدم جھجکی تھی لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گئی تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے فوراً سلام کیا۔

"وعلیکم السلام گلناز بیٹی کہاں ہوتی ہیں آپ؟" لالہ خان نے پرشفقت انداز میں اس سے پوچھا تھا پر وہ لفظ بیٹی کی بازگشت میں گم تھی۔

"اموجان میں آپ سے کچھ پوچھنے آئی ہوں۔" لالہ خان کے سوال کا جواب اس نے دینا گوارا نہیں سمجھا اور اموجان سے مخاطب ہوئی۔ گل بخت اس کے تیور دیکھ کر ٹھٹک گئی تھیں جبکہ لالہ خان بھی اس کے لاتعلق انداز پر چونک گئے تھے۔

"ہاں پوچھو!" اموجان نے سر ہلایا۔

"کیا لالہ خان میرے اصل باپ ہیں؟" اس کا جملہ ان تینوں نفوس پر بجلی بن کر گرا تھا جبکہ لالہ خان تو یہ سن کر حیرت کے مارے گنگ رہ گئے تھے۔

"گلناز ہوش میں تو ہو؟" گل بخت نے فوراً سخت لہجے میں اسے ٹوکا تھا پر وہ ان کی بات کو ان سنی کر گئی تھی۔

"اموجان مجھے جواب دیجیے۔" اس نے دوبارہ اموجان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"گلناز تم حد سے بڑھ رہی ہو تمہیں کس نے اختیار دیا ہے کہ ہم سے یہ سوال پوچھو۔" اموجان کو چند

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

منٹ لگے تھے سنبھلنے میں وہ دوبارہ اصل حالت میں لوٹ آئی تھیں۔

''گستاخی معاف! اموجان مگر ہر انسان کو اس کی اصل شناخت جاننے کا حق ہوتا ہے اور کوئی بھی اس سے یہ حق نہیں چھین سکتا۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے لالہ خان کی جانب زخمی نگاہوں سے دیکھا تھا لالہ خان سر جھکا کر رہ گئے تھے۔

''ہاں صحیح کہا تم نے ہر انسان کو اس کا اصل جاننے کا حق ہوتا ہے مگر تم مجھے یہ بتاؤ تمہیں کس بات سے لگا کہ لالہ خان تمہارا باپ نہیں ہے، کیا اس نے تمہیں سگی بیٹی کی طرح نہیں پالا، کیا تمہاری فرمائشیں پوری نہیں کیں، کس فرض سے اس نے کوتاہی کی کہ تم آج ہم سے یہ پوچھنے کھڑی ہو کہ لالہ خان تمہارا باپ ہے یا نہیں، صرف باپ ہونا ضروری نہیں ہوتا، اچھا باپ ہونا ضروری ہوتا ہے جو اپنے بچوں کی اچھی تربیت کر سکے، انہیں معاشرے میں ایک اچھا مقام دلوا سکے، ہاں شاہ زر تمہارا حقیقی باپ نہیں ہے مگر اس نے سگے باپ سے بڑھ کر تمہیں چاہا ہے، تمہارا خیال رکھا ہے کیا تم اس بات سے بھی انکار کرتی ہو؟'' اموجان نے لحظہ بھر رک کر سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

''معاشرے میں اردگرد نظر دوڑاؤ کتنے ایسے بچے ملیں گے، جن کے سگے باپ سوتیلوں سے بڑھ کر ان سے سلوک کرتے ہوں گے ان کی جائز خواہشوں کا گلا گھونٹتے ہوں گے پر ہاں ان میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ سگے ہوتے ہیں۔ رشتے اور رشتوں کو برتنا بعد میں آتا ہے سب سے پہلے انسان کا اچھا ہونا ضروری ہوتا ہے کہ وہ سگے اور غیر رشتوں کو بھی ایک طرح سے نبھا سکے، اپنوں کے لیے تو ہر کوئی قربانی دے لیتا ہے مگر اصل مزہ تو تب ہے جب غیروں کے لیے بھی قربانی دی جائے۔'' اموجان یہ کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ پورے کمرے میں چار نفوس کے موجود ہونے کے باوجود ایسا سناٹا طاری تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی واضح سنائی دے سکے۔ گلناز ابھی تک سر جھکائے کھڑی تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب کبھی بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکے گی۔

☆......☆

وہ سب اس وقت ہیتھرو ایئر پورٹ کے وسیع لاؤنج میں موجود تھے۔ حیدر کی فلائٹ کا ٹائم ہونے والا تھا اس لیے وہ سب سے فرداً فرداً گلے مل رہا تھا۔ ڈیوڈ، مائیکل، ٹونی، اسلم جو اس کے یونی فیلوز تھے وہ بھی آج اسے الوداع کہنے آئے تھے۔ ان سب سے مل کر وہ جولی اور نیہا کی جانب آیا۔

''جولی اس نیہا کا خیال رکھنا کیونکہ میرے گروپ میں صرف ایک تم ہی ہو جو سمجھ دار ہو'' حیدر نے جولی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا۔

''تم بے فکر رہو حیدر میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔'' جولی جانتی تھی کہ حیدر نیہا سے چھوٹی بہنوں کی طرح پیار کرتا ہے بلکہ وہ اپنے گروپ کے سب دوستوں سے ہی پیار کرتا تھا حیدر شہروز محبت کی مٹی سے گندھا ہوا تھا۔ اس لیے ہر طرف محبت ہی بانٹتا تھا۔ اسے اپنے سے منسلک ہر رشتہ عزیز تھا جسے نبھانے کی وہ اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا تھا وہ سب کے لیے محبت کی ایک اعلیٰ مثال تھا۔

''جاؤ حیدر تم جس مقصد کے لیے جا رہے ہو اللہ تمہیں کامیاب کرے ایک بہن کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' نیہا نے بھی ہاتھ ملاتے ہوئے اسے دل سے دعا دی تھی وہ تشکر سے مسکرا کر رہ گیا تھا۔ ان سب سے ملنے کے بعد اس کی نظر شہروز خان پر پڑی تھی جو ایک جانب قطار میں لگی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے ان کے

چہرے سے افسردگی جھلک رہی تھی اور انداز ایسا جیسے شکستہ اور ہارے ہوئے ہوں وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ان کی جانب آیا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

''بابا!'' اس نے پکارا تو وہ چونکے۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں'' وہ مصنوعی سا مسکرائے تھے۔

''کچھ تو سوچ رہے تھے؟''

''حیدر میں تمہیں وہاں بھیج تو رہا ہوں پر میرا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا ہے خدشات اور وہم کسی ناگ کی طرح بار بار مجھے ڈس رہے ہیں یہ ڈر الگ کنڈلی مارے بیٹھا ہوا ہے کہ اگر انہوں نے تمہیں قبول نہ کیا تو......'' انہوں نے اپنی پریشانی کا اظہار کر دیا تھا۔

''بابا جان اموجان کی بات ہوئی تھی آپ سے وہ راضی ہیں تو پھر باقی بھی راضی ہیں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا آپ ٹینشن نہ لیں'' اس نے دلاسہ دیا۔

''اموجان نے کس طرح رضامندی ظاہر کی ہے تم نہیں جانتے اس وقت میری کیا حالت تھی؟'' وہ شکستہ لہجے میں بولے تھے۔

''چلیں جیسے بھی رضامندی ظاہر تو کر دی ورنہ وہ دوٹوک انکار کر سکتی تھیں، پلیز آپ اب پریشان مت ہوں، اچھا اچھا سوچیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے یہ کہہ کر ان کا ماتھا چوما تھا اور وہ جواباً کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کی بانہوں میں سما گئے تھے۔ وقت نے انہیں کس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا کہ آج وہ اپنے چھوڑے ہوئے رشتوں کے لیے تڑپ رہے تھے مگر وہ رشتے ان کی پہنچ سے بہت دور ہو گئے تھے۔

☆......☆

''مس شوکت گلناز دو دن سے یونیورسٹی نہیں آ رہی خیریت ہے نا؟'' وہ دونوں اس وقت اسٹاف روم میں بیٹھی ہوئی تھیں جب عائلہ نے ان سے پوچھا تھا۔

''ہاں مجھے بھی حیرت ہے ورنہ گلناز ہماری ایسی اسٹوڈنٹ ہے جو سخت سے سخت طبیعت خرابی میں بھی چھٹی نہیں کرتی۔'' مس شوکت نے بھی تعجب کا اظہار کیا۔

''ہاں ماشاء اللہ کافی بریلنٹ اسٹوڈنٹ ہے مجھے تو اس نے پہلے دن ہی اپنی بہترین کارکردگی پر متوجہ کر لیا تھا اور باقی کسر تمام اسٹاف نے پوری کر دی۔'' وہ دھیمے دھیمے سے مسکراتے ہوئے بول رہی تھیں۔

''ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ گلناز پوری یونی کی بہترین اسٹوڈنٹس میں سے ایک ہے۔'' مس شوکت نے بھی ان کی اس بات سے اتفاق کیا تھا۔

''وہ اس کی کزن جو اس کے ساتھ ہوتی ہے کیا نام ہے اس کا؟'' مس عائلہ نے ایک دم کچھ خیال آنے کے بعد ان سے پوچھا۔

''ہاں پریشے نام ہے۔'' مس شوکت بولیں۔

''اس سے پوچھ لیتے ہیں۔'' مس عائلہ نے جواباً کہا۔

''ہوں بلاتی ہوں۔'' مس شوکت اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اطلاعی گھنٹی بجانے لگیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

☆......

دو دن ہوگئے تھے اسے کمرے میں بند ہوئے وہ اتنی شرمندہ تھی کہ کسی کا سامنا کرنے کی بھی روادار نہ تھی پری اپنی ناراضگی بھلا کر ایک مرتبہ پھر اسے سمجھا رہی تھی۔

''گلناز اب کیا مسئلہ ہوگیا ہے تمہیں جو گھر والوں سے بھی بات نہیں کررہی ہو اور یونیورسٹی جانا بھی بند کردیا ہے پتا ہے تمہیں مس عائلہ اور مس شوکت تمہارا پوچھ رہی تھیں وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی تھی:

''میرا دل اچاٹ ہوگیا ہے سب سے۔'' وہ کھوئی کھوئی سی بولی تھی۔

''واٹ! دماغ تو ٹھیک ہے نہ تمہارا؟'' پریشے کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا تھا۔

''دیکھو گلناز اگر تم مجھے اپنی دوست مانتی ہو تو اپنا مسئلہ شیئر کرو۔'' پریشے نے ایک مرتبہ پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں بہت بری ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ یکدم پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی اور پھر پری کو وہ ساری روداد سناتی گئی اور پری جیسے جیسے سنتی گئی حیرت کے مارے گنگ ہوتی گئی اس کہانی نے تو اس کے دماغ کی چولیں تک ہلا دی تھیں

''تم لالہ خان کی بیٹی نہیں ہو اور گل بخت چاچی' اور گل بخت چاچی' اوہ خدایا یہ کیا ماجرا ہے؟'' پری تو یہ سب سن کر سر پکڑ کر رہ گئی تھی۔

☆......

''اموجان' ہم نے گلناز سے حقیقت چھپا کر غلطی کی ہے۔'' ''ہمیں بہت پہلے ہی اس نے یہ سب بتادینا چاہیے تھا تو شاید اس کا اتنا شدید ری ایکشن نہ ہوتا۔'' گل بخت اس وقت اموجان کے کمرے میں موجود تھیں۔

''چلو' اب جو ہوا' اچھا ہوا' اسے جیسے بھی حقیقت پتہ چل گئی' اب وہ سنبھل جائے گی اور میں بھی اسے سمجھاؤں گی۔'' اموجان نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''ہوں وہ تو ٹھیک ہے پر اموجان آپ جانتی ہیں دو دن ہوگئے ہیں اسے کمرہ بند ہوئے' یونیورسٹی کا بھی بائیکاٹ کیے ہوئے ہے۔'' گل بخت کا لہجہ پریشان کن تھا۔

''ہم جانتے ہیں' وہ ایسا کیوں کررہی ہے وہ شرمندہ ہے ہم سے اس لیے اپنا آپ چھپائے پھر رہی ہے تم دیکھنا ابھی وہ معذرت کرنے آئے گی۔ ہمیں اس کے بارے میں خوب علم ہے۔'' اموجان کا انداز آخر میں فخریہ ہوگیا تھا۔ گل بخت نے ان کی بات پر محض سر ہلایا تھا۔

☆......

''مجھے تم سے ایسی بے وقوفی کی امید نہیں تھی گلناز!'' پری نے اسے ناراض نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''تم بھی ایسا کہہ رہی ہو!'' گلناز نے صدمے سے اسے تکا تھا۔

''ہاں کیونکہ یہ ایک نہایت بے وقوفانہ ردعمل تھا۔ تم نے سب کی محبتوں پر شک کیا تم نے لالہ خان پر شک کیا گل بخت چاچی کو ان کی نظروں سے گرانا چاہا ان سب پر تمہارا شرمندہ ہونا تو بنتا ہے۔'' پری صاف گوئی سے بولی تھی۔

''میں تو صرف یہ پوچھنے گئی تھی کہ میری اصل شناخت کیا ہے۔ میں کون ہوں؟''

''ٹھیک ہے میں مانتی ہوں کہ سچ جاننا تمہارا حق ہے مگر تمہارے پوچھنے کا طریقہ انتہائی غلط تھا تم گل بخت چاچی سے پوچھتی ان سے سچ جانتی مگر تم نے ڈائریکٹ سب سے پوچھ کر سب کو اپنی ہی نظروں میں گرادیا ہے۔'' پری نے تاسف سے اسے دیکھا تھا وہ سر جھکا کر رہ گئی تھی۔

''میرا مقصد تم کو ہرٹ کرنا نہیں ہے سمجھانا ہے کہ جس بات کو لے کر تم نے اتنا ایشو کریٹ کیا ہے اس کی ہمارے خاندان میں کوئی ویلیو نہیں ہے۔ یہ بات صرف تم یا میں نہیں جانتے تھے یا چند اور لوگ باقی سب بڑوں کے علم میں تھا اور باقی سب خاندان والوں کو بھی علم تھا کہ تم لالہ خان کی بیٹی نہیں ہو۔'' پری کی اپنی پشمینہ سے اس معاملے پر پوری تفصیلی بات ہوئی تھی اب جبکہ معاملہ کھل گیا تھا تو پشمینہ نے بھی بات چھپانے کا کوئی فائدہ نہ سمجھا اور ہر بات پری کو بتادی تھی تو کیا لالہ خان ابھی تک غیر شادی شدہ ہیں؟ گلناز کے اس سوال پر پری بری طرح چونکی تھی کیونکہ اس طرف تو اس کا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔

☆......

آج کی رات پر اس بھاری اتری تھی۔ ادھوری محبت کے ناگ آج پھر اس کو اپنے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اور تنہائی نے چاروں اور اپنا جال بچھایا ہوا تھا۔ محبوب کی وہ ادھوری ملاقاتیں' باتیں آج پھر اسے بری طرح یاد آرہی تھیں اور دل کی بے چینی ہر لمحے میں بڑھتی جارہی تھی۔

''کیا میں اب بھی تمہارے دل کے کسی نہاں خانے میں موجود ہوں گی؟'' اس نے بے اختیار دل میں اسے مخاطب کیا تھا۔

''یا تم مجھے قصہ پارینہ سمجھ کر بھول چکے ہوگے۔'' وہ اب کے بڑبڑائی تھی۔

''مگر تم تو کہتے تھے تمہاری محبت کمزور نہیں ہے ہماری محبت کا دھاگہ کبھی نہیں ٹوٹے گا تو پھر اب یہ سب کیسے ہوگیا تم مجھے یوں چھوڑ کر چلے گئے جیسے ہماری کوئی آشنائی نہیں تھی وہ قسمیں وہ وعدے سب جھوٹے تھے کیا جواب دو؟'' وہ ہلکے ہلکے بڑبڑا رہی تھی۔ آج پھر محبت گھاتی ساگر (زہریلے پھول) نے اس پر حملہ کیا تھا اور اب پوری رات اس کی جاگتے میں گزرنا تھی۔

☆......

اس نے سب سے معافی مانگ لی اور سب نے اسے معاف بھی کردیا تھا اموجان کی زبانی اسے پتا چلا تھا کہ اس کا باپ زندہ ہے لیکن کہاں ہے یہ معلوم نہیں ہے اس کی پیدائش کے دو ماہ بعد ہی وہ روزگار کی تلاش میں بیرون ملک گیا اور پھر ایسا گیا کہ پلٹ کر واپس نہ آیا۔ سسرال والوں نے گل بخت اور اس کی ذمہ داری اٹھانے سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ اب ان کا سرپرست کماؤ ہوگیا ہے اور وہ ان کی بہترین کفالت کرسکتا ہے جب ہمیں اس بارے میں علم ہوا تو ہم گل بخت اور تمہیں بے سروسامانی کی حالت میں گھر لے آئے اور ایسے نہیں پورے خاندان کے سامنے لائے تھے۔ تمہارے بہترین مستقبل کے لیے لالہ خان نے تمہیں اپنا لیا تاکہ تمہیں باپ کی کمی محسوس نہ ہو بس یہی حقیقت ہے جو ہم نے تم سے چھپائی تھی اموجان کی باتیں سن کر وہ ایک مرتبہ پھر شرمندہ ہوگئی تھی کہ اس نے ان لوگوں پر شک کیا جنہوں نے اسے سہارا دیا معاشرے میں مقام دلوایا اسے اپنی سوچ پر پہلے سے بڑھ کر شرمندگی ہوئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سب سے معافی مانگی تھی اور سب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نے اسے سچے دل سے معاف بھی کر دیا تھا۔

☆......☆

وہ راہداری کے سرے پر بنے ٹیپ پر بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی جب مس عائلہ کی آواز نے اسے متوجہ کیا۔ انہیں دیکھ کر وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

''السلام علیکم میم!'' اس نے فوراً سلام کیا۔

''وعلیکم السلام آپ گلناز ہیں نا؟'' مس عائلہ نے دھیمی مسکراہٹ لبوں پر سجائے جواباً اس سے پوچھا تھا۔

''جی میم میں گلناز ہوں آپ نے ہماری کلاس کا بھی پہلا پیریڈ لیا تھا۔'' گلناز نے انہیں یاد دلایا۔

''جی جی مجھے یاد ہے آپ تین چار دن سے لیو پر تھیں خیریت تو تھی نا۔'' انہوں نے پوچھا تھا۔

''جی میم تھوڑی طبیعت ناساز تھی۔'' اس نے فوراً بہانہ گھڑا تھا۔

''ہوں ویسے تو سنا تھا کہ آپ سخت سے سخت بیماری میں بھی چھٹی نہیں کرتیں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تو وہ جھجک کر نگاہیں جھکا گئی۔

''نہیں میم ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''ہوں دراصل مجھے بریلنٹ اور لائق اسٹوڈنٹس اٹریکٹ کرتے ہیں جن میں آپ کا بھی شمار ہوتا ہے۔'' مس عائلہ نے کہا تو وہ حیرت سے انہیں تکنے لگی۔

''او کے پھر ملاقات ہوتی ہے میری کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے' ٹیک کیئر۔'' دائیں بازو پر بندھی سیاہ ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالتی وہ آگے بڑھ گئی تھیں جبکہ وہ ابھی تک حیرت کا بت بنے ان کی جاتی پشت کو دیکھ رہی تھی۔

☆......☆

''امی آپ سے ایک بات پوچھوں برا تو نہیں مانیں گی۔'' وہ رات کو گل بخت کے کمرے میں دودھ دینے آئی تو اس نے پوچھا۔

''ہاں بولو برا ماننے والی کون سی بات ہے مجھے تو ابھی تک ملال ہو رہا ہے کہ مجھے تم سے حقیقت نہیں چھپانی چاہیے تھی۔'' گل بخت جواباً سرد آہ بھر کر بولی تھیں۔

''امی پلیز اب اس بات کو بھول جائیں دیکھا جائے تو...... میری غلطی تھی مجھے آپ سے حقیقت جاننی چاہیے تھی خوامخواہ میں نے نادانی میں یہ قدم اٹھایا اور شرمندگی کی مستحق ٹھہری۔'' اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے گل بخت کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تھا انہوں نے جواباً اس کا ماتھا چوم لیا۔

''ہاں تم کچھ پوچھ رہی تھیں؟'' انہوں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''امی اصل بات پوچھیں تو مجھے شروع ہی سے یہاں کے سب لوگ پراسرار لگتے ہیں۔'' اس نے دھیمے سے بات شروع کی۔

''ارے وہ کیوں؟'' گل بخت اس کے اس انداز پر بے ساختہ مسکرا اٹھی تھیں۔

''امی مجھے لالہ خان کو دیکھ کر ہمیشہ یہی لگتا تھا جیسے وہ کوئی دہری شخصیت اپنائے ہوئے ہوں کبھی اتنے رحم دل بن جاتے ہیں اور کبھی اتنے سخت کہ بندے کو بات کرتے بھی ڈر لگتا ہے۔ مہروز لالہ اور ظہیر لالہ بھی تو ہیں

وہ ایسے تو نہیں ہیں، اور آج میں جو سوال پوچھنے آئی ہوں۔ وہ بھی لالہ خان سے ریلیٹڈ ہے۔'' گل بخت اس کی ساری بات دھیان سے سنتے سنتے آخر میں ایک دم چونکی تھیں۔

''کیا سوال؟'' گل بخت نے اچنبھے سے پوچھا۔

''کیا لالہ خان ابھی تک ان میرڈ ہیں؟'' گلناز کی اس بات نے یکدم انہیں ساکت کر دیا تھا۔

''کیا ہوا امی؟'' گلناز نے ان کا کندھا ہلاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں، یہ کیسا سوال ہے؟'' انہوں نے فوراً اپنے آپ کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔

''امی سمپل سا سوال ہے کہ مہروز لالہ اور ظہیر لالہ میرڈ ہیں سب جانتے ہیں مگر لالہ خان، کیا ان کی وائف ہیں؟'' گلناز ان سے وہ سب پوچھ رہی تھی جو راز تھا شاہ زرخان کی زندگی کا راز۔ جس کا بخت گل نے عہد کیا تھا کہ وہ اس راز کو ساری زندگی اپنے سینے میں دفن رکھیں گی آج وہی گلناز ان کو اپنے دل سے نکالنے کا کہہ رہی تھی۔ بھلا وہ شاہ زرخان سے کیا عہد کیسے توڑ سکتی تھیں۔

''امی کہاں گم ہوگئیں؟'' گلناز نے ان کا ہاتھ تھاما تو وہ چونکی تھیں۔

''ہاں شاہ زرخان ان میرڈ ہیں اس کے علاوہ مجھے کچھ معلوم نہیں اب تم جاؤ رات کافی ہوگئی ہے۔'' انہوں نے اسے سرسری سا جواب دے کر ٹالا تھا۔ وہ جواباً انہیں الجھن بھری نظروں سے دیکھتی باہر نکل گئی تھی۔ گل بخت کا بے قابو ہوتا دل ایک دم تھم سا گیا تھا۔

☆......☆

''یہ تم آج کل مس عائلہ کے بڑے ارد گرد نظر آ رہی ہو خیریت ہے۔'' وہ چاروں مس امتیاز کے دیے لیکچر کے نوٹس بنا رہی تھیں جب مرینہ نے اس سے پوچھا

''کیوں نہیں آنا چاہیے؟'' گلناز نے جواباً الٹا سوال کیا۔

''نہیں، نہیں ناز ہمارے گروپ میں سے صرف تمہیں گھاس ڈالتی ہیں تو ہمارے لیے فخر کی بات ہے۔'' مرینہ نے ٹون بدلی تھی۔

''تم جانتی ہو نیکسٹ منتھ بیالوجی کا پیپر ہے اس لیے مس عائلہ نے مجھے کہا ہے کہ اگر میں چاہوں تو ان کے گھر ٹیوشن پڑھ سکتی ہوں۔'' اس نے انہیں آگاہ کیا۔

''ہیں، یہ بات ہوگئی، تم نے مجھے بھی نہیں بتایا۔'' پریشے نے اس بات پر سر اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''یار ابھی تو میں سوچ رہی ہوں کہ اگر امی جان اور لالہ جان نے اجازت دی تو ضرور پڑھوں گی۔''

''ضرور پڑھنا کیونکہ مس عائلہ ایک نہایت اچھی ٹیچر ہیں۔'' زرینہ نے بھی سر ہلایا۔

''وہ تو ہیں!'' گلناز نے بھی اس کی بات پر اتفاق کیا۔

''ویسے مس عائلہ کی شخصیت بالکل لالہ جان سے میچ کھاتی ہے وہی سوبر انداز، بات بات پہ دھیما دھیما سا مسکرانا، کافی عادتیں ملتی ہیں۔'' پری اچانک ہی موضوع دوسری جانب لے آئی تھی۔ اور پری کی اس بات پر یکدم گلناز کے ذہن میں کچھ کلک ہوا تھا۔

☆......☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

"نیہا تم کیوں ضد کر رہی ہو میں تمہیں اس بات کی بالکل اجازت نہیں دے سکتا۔" اسرار آفندی نے کافی بے بس نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن، کیوں ڈیڈ دو دن کی تو بات ہے اور میں کون سا کسی دوسرے ملک جا رہی ہوں؟ سکاٹ لینڈ ہی جا رہی ہوں۔" اس نے جواباً جھنجلائے لہجے میں کہا۔

'بات دور نزدیک کی نہیں ہے بس میں تمہیں اکیلے نہیں بھیج سکتا۔" اسرار آفندی کا انداز رسانیت لیے ہوئے تھا۔

"وہ اس کا مطلب آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے!" اس نے دکھ سے جواباً انہیں دیکھا

"مجھے تم پر اپنے سے زیادہ اعتماد ہے میرا دل نہیں مانتا۔" اب کے ان کا لہجہ زہر تھا۔

"میرے ساتھ جولی بھی ہوگی ڈیڈ مگر پتا نہیں کیوں جب میں کہیں جانے کی بات کرتی ہوں آپ انکار کر دیتے ہیں یہ بھی غنیمت ہے کہ آپ نے یونیورسٹی جانے کی اجازت دی ہوئی ہے۔"

"دیکھو نیہا تم جانتی ہو یہاں میرا تمہارے علاوہ کوئی اپنا نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میں تمہیں کھو دوں۔" آخری بات پر پتا نہیں کیوں ان کا لہجہ اتنا عجیب ہو گیا تھا یا نیہا کو لگ تھا۔

"ڈیڈ ہمارا کوئی رشتے دار تو ہوگا۔" فیملی، آپ کی فیملی ریلیٹوز کچھ تو ہوگا۔" وہ ان کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی تھی۔

"سب تھا پر کہیں کھو گیا۔" وہ مدہم سا بولے

"کیا مطلب" نیہا نے اچنبھے سے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں تم یہ بتاؤ تمہارا بھائی حیدر پاکستان چلا گیا کیا۔" انہوں نے بات کا رخ دوسری جانب موڑ دیا تھا۔

"کیوں آپ کی اس سے بات نہیں ہوئی؟" وہ پوچھنے لگی۔

"ہوئی تھی پر اس نے جانے کا نہیں بتایا تھا۔"

"ہوں چلا گیا، ڈیڈ دعا کیجیے گا اس کے بابا کے، اس کی فیملی کے ساتھ دوبارہ تعلقات قائم ہو جائیں۔" وہ بولی تھی۔

"ہوں، حیدر بہت نیک لڑکا ہے تو اس کا باپ بھی ایسا ہی ہوگا پھر یہ سب......" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ڈیڈ مجھے بھی زیادہ نہیں معلوم حیدر کی زبانی پتہ چلا ہے کہ شہروز انکل نے لو میرج کی تھی جس کی بنیاد پر ان کی فیملی نے ان کا بائیکاٹ کر دیا۔" وہ انہیں بتانے لگی۔

"اوہ سو سیڈ" اس کی باپ کی غلطی کا خمیازہ حیدر کو بھی اپنے خاندان سے دور رہ کر بھگتنا پڑا۔" وہ افسردہ ہو گئے۔

"جی ڈیڈ بس دعا کریں حیدر کو اس کی ساری خوشیاں واپس مل جائیں۔"

وہ جذب سے بولی تھی۔

"انشاء اللہ!" اسرار آفندی نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

☆

وہ سب بمعہ اموجان ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی شیدہ کپڑے والی سے کپڑے دیکھ رہی تھیں۔ شیدہ مہینے کے بعد ایک چکر ضرور ان کی طرف لگاتی تھی اور اس گھر میں واحد اموجان تھیں جنہیں شیدہ کے لائے ہوئے کپڑے پسند آتے تھے ورنہ تائی پشمینہ اور ثمرہ چاچی کو نہ شیدہ ایک آنکھ بھاتی تھی نہ اس کے کپڑے۔ کیونکہ شیدہ جب بھی ان کے ہاں آتی اموجان زبردستی ان دونوں کو کپڑے دلواتیں۔ گل بخت کا اپنا مزاج تھا کہ اسے شیدہ کے منتخب کردہ کپڑے پسند نہ آتے تھے اور جس کا اظہار وہ اموجان سے بڑی سمجھ داری سے کر چکی تھی۔ اب اینڈ میں لے دے کر یہ دونوں پس جاتی تھیں۔ گلناز اور پری کو لالہ خان شاپنگ کرا دیتے تھے لالہ خان کی پسند لاجواب تھی وہ جو بھی لاتے پری اور گلناز کے معیار پر پورا اترتا۔ اس لیے ان دونوں کو شیدہ سے کوئی پرخاش نہ تھی۔

"وہ فیروزی والا دکھاؤ شیدہ!" اموجان سائیڈ پر پڑے جوڑے کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ لیں جی۔ پشیل فیصل آبادی مل کا ہے۔ شیدہ نے فخریہ لہجے اپناتے ہوئے وہ جوڑا بڑے احترام سے اموجان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

"اچھا اچھا زیادہ باتیں نہ بناؤ" ہاں پشمینہ، ثمرہ تمہیں کون کون سے پسند ہیں ان چاروں میں۔"

اموجان نے ان کو مخاطب کرتے سائیڈ پر پڑے منتخب جوڑوں کی جانب اشارہ کیا تھا۔

"جی اموجان۔ یہ ریڈ اور میرون ہمیں پسند ہے" وہ جواباً بولی تھیں۔

"یہ آج ذرا گل بخت کو تو بلا کے لاؤ وہ بھی اپنے لیے کچھ پسند کریں۔' اموجان نے اب اگلا حکم ارشاد کیا تو پشمینہ اور ثمرہ ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگی تھیں

"اموجان آپ تو جانتی ہیں گل بخت کو شوخ رنگ نہیں پہنتیں" ثمرہ مدھم سا بولی تھی اموجان گہرا سانس بھر کر رہ گئیں۔

"ہاں پتا نہیں کب تک اسے سہاگ کے ہوتے ہوئے بھی بن سہاگ رہنا پڑے گا۔" اموجان یکدم افسردہ ہو گئی تھیں۔

☆

ہر گزرتے دن کے ساتھ گلناز عائلہ خان زئی کے قریب ہوتی گئی۔ شاید عائلہ خان زئی کی شخصیت کا کمال تھا یا کچھ اور گلناز کو ان سے باتیں کر کے ایسا لگتا کہ وہ کسی اپنے سے بات کر رہی ہے اجنبیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور سب سے بڑی بات کہ لالہ خان اور اموجان نے اسے ٹیوشن پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ ہر روز لالہ خان کے ساتھ عائلہ خان زئی کے گھر جاتی پک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری لالہ خان نے خود لی تھی اس روز بھی وہ لالہ خان کے ساتھ گاڑی میں مس عائلہ کے گھر کی طرف جا رہی تھی جب اچانک لالہ خان نے اسے مخاطب کیا۔

"گل تم اپنی ٹیچر کی اتنی تعریفیں کرتی ہو لگتا ہے مجھے ان سے ملنا پڑے گا۔" لالہ خان نے ڈرائیو کرتے اچانک اس سے کہا۔

"جی ہاں مگر ایک پرابلم ہے۔" وہ جواباً بولی تھی۔

"وہ کیا؟" لالہ خان نے پوچھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''مس عائلہ غیر مردوں سے پردہ کرتی ہیں۔'' اس نے بتایا

''اوہ اچھا'' لالہ خان ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔

''لالہ خان ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں تو۔'' اسے یکدم کچھ یاد آیا تھا۔

''ہاں پوچھو برا ماننے والی کون سی بات ہے۔'' وہ ہلکا سا مسکرائے تھے۔

''آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟'' یہ سوال تھا یا پگھلا سیسہ جوان کے کانوں میں انڈیل دیا گیا تھا وہ بے بسی کی انتہا پر پہنچ گئے تھے اور شدت جذبات سے اسٹیرنگ پر ہاتھوں کی گرفت اور مضبوط ہو گئی تھی۔

''لالہ خان سوری اگر آپ کو برا لگا تو میں نے امی سے بھی پوچھا تھا انہوں نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا اب جبکہ سارا معاملہ کلیئر ہو چکا ہے تو یہ سوال اہمیت رکھتا ہے۔'' اس نے تائید چاہی تھی لیکن لالہ خان مستقل خاموش سامع بن کر بیٹھے تھے۔

''لالہ خان!'' اس نے انہیں خاموش پا کر دوبارہ پکارا۔

''تمہاری ٹیچر کا گھر آ گیا ہے میں لینے آ جاؤں گا۔'' گاڑی ایک دم زوردار جھٹکے سے رکی تھی اور گلناز بغیر کچھ کہے گاڑی سے اتر گئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی لالہ خان جب کسی بات کا جواب نہ دینا چاہیں تو ایسا ہی لاتعلق انداز اپنا لیتے ہیں وہ سست روی سے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی تھی۔

......☆......

پیاس بڑھتی ہے سر شام سے جلتا ہے بدن
عشق سے کہہ دو کہ لے آئے کہیں سے ساون

زندگی مجھے ایسے مقام پر لا کھڑا کرے گی کبھی سوچا نہ تھا۔ آبلہ پائی، گھٹ گھٹ کر زندگی جینے کا رستہ میرا مقدر ہو گا یہ بھی نہ سوچا تھا مجھے تم نے میرے کس جرم کی، کس غلطی کی سزا دی۔ یہ بھی نہیں جانتی۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ اور بے انتہا کی ہے۔ بغیر کسی مفاد کے کی ہے مگر یوں محبت کا یہ صلہ ملے گا کبھی سوچا نہ تھا۔ آج بھی تمہارے انتظار کی لو جلائے ہوئے ہوں کہ شاید لوٹ آؤ' شاید اب تو انتظار کی زنجیریں بھی زنگ آلود ہوتی جا رہی ہیں اور میں ان زنجیروں میں جکڑی جا رہی ہوں اب تو لوٹ آؤ اسرار آفندی اب تو لوٹ آؤ'' گل بخت کی صدائیں اندھیرے کمرے میں گونج رہی تھیں اور گونج گونج کر آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ محبت اپنی بے قدری پر غمزدہ سی ایک جانب کھڑی تھی۔ افسردہ، دل سوز، سی......

......☆......

''گلناز! آپ کے گھر میں کون کون ہوتا ہے؟'' وہ اسٹڈی سے فارغ ہو کر عائلہ سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی۔ جب عائلہ نے اس سے پوچھا تھا

''جی میم امو جان، لالہ خان ہیں، مہروز خان ہیں، ظہیر تایا ہیں، پشمینے اور ثمرہ چاچی ہیں اور پری کو تو آپ جانتی ہی ہیں نہ اور میری امی گل بخت ہیں۔'' اس نے جواباً تفصیلاً سب بتایا تھا۔

''ماشاءاللہ کافی بڑی فیملی ہے'' وہ ہلکا سا مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ وہی مخصوص مسکراہٹ......

''جی ایک شہروز تایا بھی ہیں لیکن وہ لندن میں ہوتے ہیں۔'' اس نے مزید بتایا۔

''ہوں!''

''میم آپ اکیلی ہوتی ہیں کیا؟'' اس نے جواباً پوچھا تھا۔

''نہیں اکیلی تو نہیں ہوتی میری تنہائی میرے ساتھ ہوتی ہے۔'' وہ بے ساختہ بول اٹھی تھیں۔

''کیا مطلب؟'' گلناز نے ناسمجھی کے عالم میں ان کی جانب دیکھا۔

''میرے ددھیال اور ننھیال کافی مختصر لوگوں پر مشتمل تھا۔ میری والدہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں اور یہی معاملہ میرے والد کے ساتھ بھی تھا وہ بھی اکلوتے تھے اس لیے خالہ، پھوپی، چاچی، تایا کے میں تو رشتے سے بھی ناواقف ہوں کہ یہ رشتے کیسے ہوتے ہیں؟ جب پانچ سال کی ہوئی تو والد اس دنیا سے چلے گئے اور والدہ ہی میرا سب کچھ ہو گئیں۔ میں انہیں میں ہر شے کو تلاش کرتی تھی اور اب چند سال پہلے ان کا بھی انتقال ہو گیا تو بالکل اکیلی رہ گئی۔'' آج پہلی مرتبہ عائلہ نے اس سے اتنی کھل کر بات کی تھی۔

''اوہ!'' گلناز یہ سب سن کر ایک دم افسردہ سی ہو گئی۔

''اور جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا اللہ ہوتا ہے اور جن کا اللہ ہو وہ اکیلا نہیں ہوتا۔'' وہ دوبارہ بولی تھیں۔

''جی میم سب سے بڑا سہارا تو بے شک اس پاک ذات کا ہی ہے۔'' گلناز نے بھی جواباً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے میم مت بلایا کرو۔'' عائلہ نے اسے ٹوکا تھا۔

''وہ کیوں میم'' وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''میم جیسے الفاظ سے اجنبیت ظاہر ہوتی ہے'' انہوں نے جواب دیا۔

''تو پھر کیا کہوں؟''

''مس عائلہ کہہ لیا کرو۔''

''عائلہ ممانی نہ کہہ لیا کروں'' یہ بات وہ دل میں سوچ کر رہ گئی تھی۔

''او کے مس عائلہ۔'' وہ یکدم کھلکھلا کر ہنس دی۔

''آپ سے ایک بات پوچھوں۔''

''ہاں پوچھو۔''

''آپ برا تو نہیں مانیں گی؟''

''نہیں میں تمہاری بات کا برا نہیں مانوں گی۔''

''آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔'' اور یہ سوال عائلہ خان کو ساکت کر گیا تھا۔

''کیا ہوا مس'' گلناز نے ڈرتے ڈرتے ان سے پوچھا۔

''تم بیٹھو میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں''۔ وہ فوراً اٹھ کر کچن کی جانب بڑھ گئی تھیں جبکہ گلناز سوچ رہی تھی کہ لالہ خان اور مس عائلہ کی ایک اور عادت مشترک نکل آئی مگر ابھی وہ کچھ بھی نہ جانتی تھی کچھ بھی......

......☆......

وہ سب کھانے کی میز پر بیٹھے کھانا کھانے میں مشغول تھے جب ان سب کو امو جان نے اچانک مخاطب کیا اور جب بھی وہ ایسے مخاطب کرتیں ضرور کوئی نہ کوئی اہم بات ہوتی۔

''شہروز کا بیٹا حیدر پاکستان آ رہا ہے۔'' اور یہ جملہ چاروں نفوس کو چھوڑ کر باقی کے سروں پر بم کی طرح

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کرا تھا۔

''شہروز خان کا بیٹا یہاں؟'' سب سے پہلے گل بخت کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی جبکہ پشمینے اور ثمرہ تو ابھی تک ساکت تھیں۔

''یہ حیدر کہاں سے آ گیا اچانک؟'' پری نے اچانک اسے ٹہوکا مارتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے کیا پتا تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے شہروز تایا کے ساتھ رہی ہوں۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں جواباً اسے ڈپٹا تھا۔

''پشمینے تم ملازموں کی نگرانی میں اوپر والا کمرہ صاف کروا دینا۔'' انہوں نے فوراً اگلا حکم صادر کیا۔

''جی بہتر اموجان'' وہ یکدم ہڑبڑا کر چونکی تھی۔

''یہاں کب تک پہنچے گا؟'' اب کے ان کا رخ لالہ خان کی جانب ہوا۔

''جی اموجان پرسوں تک یہاں پہنچ جائے گا دبئی میں کچھ کام تھا اسے وہاں رکا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''ہوں...... '' اموجان یہ کہہ کر دوبارہ کھانے میں مشغول ہو گئیں اور اب ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں کوئی غیر معمولی بات کا شبہ تک نہ گزرا مگر اموجان کے علاوہ ان سب کے دل بے چینی کی شیرینی سے لبالب بھر چکے تھے۔

......☆......

رات یوں دل میں تری
کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے
بہار آ جائے
جیسے صحرا میں چپکے سے
بہار آ جائے
جیسے صحرا میں ہولے سے
چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ
قرار آ جائے

''محبت صرف ملن کا نام نہیں ہوتی بچھڑنے کا بھی ہوتی ہے ضروری تو نہیں ہر محبت کا انجام ملن پر ہو جدائی پر بھی ہو سکتا ہے اور محبت کبھی کبھار قربانی بھی مانگ لیتی ہے۔'' لالہ خان کے کانوں میں یکدم کسی کی کہی بات گونجی تھی یکدم ان کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ در آئی۔

''ہاں تم ٹھیک کہتی تھیں ہر محبت کا انجام ملن پر نہیں ہوتا محبت قربانی بھی مانگتی ہے اور دیکھو محبت کی قربانی ہم دونوں کے حصے میں آئی۔ شاید ہماری محبت خوش قسمت نہ تھی اگر ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا۔'' بند آنکھوں کے پیچھے وہ کسی صورت کو سموئے اس سے مخاطب تھے۔

''مگر ایک بات ہے جب بھی تمہارا خیال آتا ہے میرا بے چین دل یکدم ٹھہر جاتا ہے۔ قرار کی لہر میرے

پورے سراپے میں دوڑنے لگتی ہے کیا تمہیں بھی میرا خیال آتا ہے ہاں بالو؟ بولو نا۔'' اور کسی کام کے لیے اندر آتی گلناز لالہ خان کا یہ روپ دیکھ کر اپنی جگہ تھم سی گئی تھی لالہ خان کی شخصیت کا پہلا عقدہ گلناز نے دیکھ لیا تھا۔

......☆......

رات بارش خوب برسی تھی اور برف روئی کے گالوں کی مانند زمین کے کشادہ سینے پر گر رہی تھی۔ آج پورا ''بلیک بار'' خاموشی میں ڈوبا تھا۔ ساکت خاموشی اور ایسی ہی خاموشی مہروز خان کے من میں بھی بسی ہوئی تھی ہر رات کی طرح ان کی یہ رات بھی بے سکون گزرنی تھی خلش، ندامت، پشیمانی کے پنجے انہیں اپنے شکنجے میں جکڑنے کو بے تاب تھے۔

''میں نے وہ کیوں کیا جو نہیں کرنا تھا۔'' بے بسی کی آخری حد ان کی آنکھوں میں نمی لے آئی تھی۔

''تم نے اپنی دل کی خوشی کے لیے وہ سب کیا شہروز خان اب کیوں پچھتا رہے ہو۔'' اس کا ضمیر تن کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا:

''دل کی خوشی، ہونہہ وہ تلخی سے مسکرائے۔

''اگر دل خوش ہوتا تو میں مطمئن ہوتا پر ایسا نہیں ہے۔''

''ایسا ہے تمہارا دل مطمئن ہے تب ہی تو تم اپنی زندگی اتنی شان و شوکت سے گزار رہے ہو۔'' ضمیر نے ان کی بات کو بڑی آسانی سے رد کیا تھا۔

''ہونہہ یہ شان و شوکت تو محض دکھاوا ہے میرا وجود تو اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہے بس اس کھوکھلے پن کو چھپانے کی ایک نام نہاد کوشش ہے۔''

''ہاہاہا! اپنی ذات کو بچانے کے لیے دلیلیں ڈھونڈنا کوئی تم سے سیکھے۔'' ان کے ضمیر نے ایک ہولناک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

''وہ اور دور تھا جب میں دلیلیں پیش کرتا تھا اب تو میں مسمار عمارت کی طرح ہوں ٹوٹے پھوٹے لوگ دلیلیں پیش نہیں کرتے۔''

''اگر تم وہ قدم نہ اٹھاتے تو آج اپنوں کے پاس ہوتے۔ ان کے ساتھ ہوتے، یوں اکیلے نہ ہوتے۔ ضمیر نے ایک مرتبہ پھر ان کے زخموں پر نمک چھڑکا تھا وہ بلبلا کر رہ گئے تھے۔''

''ہاں میں اس ایک غلطی کا ہی تو آج تک خمیازہ بھگت رہا ہوں اور نہ جانے کب تک بھگتتا رہوں گا۔ شاید زندگی کی آخری سانس تک۔''

رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی۔ اور شہروز خان کرب کے سمندر میں آہستہ آہستہ ڈوب رہے تھے۔ بس فرق اتنا تھا کہ رات کا بھیگنا خاموش پر محبت تھا جبکہ شہروز خان کے اندر جوار بھاٹا ہلچل مچا رہا تھا۔ اور ان کی بدنصیبی پر ماتم کناں تھا۔

......☆......

''پری آج مجھے لالہ خان کے راز کا پتہ چل گیا ہے۔'' گلناز پھولی سانسوں کے ساتھ اٹک اٹک کر بولی تھی جیسے کہیں سے لمبی مسافت طے کر کے آئی ہو۔

''ہیں کون سا راز؟ کیا مطلب۔'' پری نے گلناز کی بات پر اچنبھے سے پوچھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''اگر تمہیں بتایا تو تم بے ہوش ہو جاؤ گی۔'' وہ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی تھی

''بلاوجہ کا سسپنس پھیلانا بند کرو، تم جانتی ہو اتنا سسپنس میں برداشت نہیں کر سکتی۔''

پری نے اب کے سخت لہجے میں ٹوکتے ہوئے کہا۔

''پری لالہ خان ماضی میں کسی سے محبت کرتے تھے۔'' یہ سن کر پری کی آنکھیں شاک کے مارے پوری کی پوری کھل گئی تھیں۔

''کیا؟'' وہ بے ساختہ بولی تھی۔

''دیکھا ہو گیا نہ سکتہ' مجھے بھی ایسے ہی ہوا تھا۔'' گلناز نے اسے باور کرایا تھا۔

''تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟'' پری نے بیتابی سے پوچھا۔

''میں خود لالہ خان کے کمرے سے سن کر آ رہی ہوں۔'' وہ بولی۔

''گلناز میں تو پاگل ہو جاؤں گی کیسے کیسے رازوں سے پردہ اٹھ رہا ہے۔'' پری نے یکدم اپنا سر تھام لیا تھا۔

''پتا نہیں ابھی آگے کیا کیا ہوتا ہے؟''

''پہلے تم سے ریلٹڈ واقعے نے حواسوں کو ہلا دیا، اور اب یہ......'' پری کا لہجہ بہت رسانیت لیے ہوئے تھا۔

''ہمارا معاملہ تو صاف صاف تھا اور سب کے علم میں تھا لیکن یہ......'' گلناز نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''گلناز مجھے تو لگتا ہے ہمارے خاندان والے اپنے اپنے راستوں سے بھٹکے ہوئے ہیں' نہ مسافت کا تعین ہے نہ منزل کا پتا' پری کا لہجہ اب کے تھوڑا تبدیل ہو گیا تھا گلناز نے بھی جواباً اثبات میں سر ہلایا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو شہروز چچا کی اپنی کہانی ہماری کہانی اور اب لالہ خان عجب بھول بھلیوں کی نگری ہے۔''

''تم نے کسی اور سے تو ذکر نہیں کیا۔'' پری نے پوچھا تھا۔

''پاگل ہوں میں؟'' گلناز نے اسے گھورا اور بولی۔

''میرے خیال میں تو یہ لالہ خان اور مس عائلہ تھے'' گلناز اپنی ہی دھن میں بولی تھی۔

''کیا مطلب؟'' پری نے جواباً سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''مس عائلہ بھی ان میرڈ ہیں۔'' گلناز بولی۔

''مگر ایسا نہیں ہو سکتا اب'' پریشے کے اس جملے نے گلناز کو افسردہ کر دیا تھا۔

......☆......

حیدر شہروز پاکستان آ چکا تھا۔

لالہ خان ڈرائیور کے ہمراہ اسے ریسیو کرنے پہنچے تھے اور اسے دیکھ کر بالکل دنگ رہ گئے تھے۔ وہ پورے کا پورا شہروز کی کاپی تھا۔ انہوں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ ان کے سینے سے لگ گیا تھا۔

''میں جانتا ہوں آپ لوگوں کے دلوں میں میرے لیے کوئی جذبہ نہیں ہے صرف نفرت، غصہ ہے لیکن میرے دل میں آپ سب کے لیے محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے جس کی گہرائی آپ گننا بھی چاہیں تو نہیں گن سکتے۔'' وہ ان کے گلے سے لگا کہہ رہا تھا اور وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے۔ ائیرپورٹ سے گھر تک کا سفر خاموشی سے کٹا تھا۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم خان ولا پہنچ گئے تھے وہ ان کے ہمراہ گاڑی سے اترا اور ان کے ساتھ ہی اندرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ آج اس کے دل کی حالت عجیب سی تھی۔ ایک بے نام سی

خوشی تھی جس کو وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ آج بالآخر وہ اپنوں کے پاس پہنچ گیا تھا اب اس کے اپنے اسے اپناتے ہیں یا نہیں یہ اس کی قسمت۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ لاؤنج میں داخل ہوا تھا جہاں اس کے اپنے موجود تھے۔

''دیکھیں اموجان کون آیا ہے؟'' وہ لالہ خان کے پیچھے چھپا کھڑا تھا جب لالہ خان یہ کہتے ہوئے اس کے آگے سے ہٹے تھے اس کی پہلی نظر اٹھی تو پھر ہٹنا بھول گئی۔ اسے دیکھتے ہی اموجان کی آنکھوں سے آنسو روانی سے بہہ نکلے تھے۔ وہ اٹھ کر آگے بڑھی تھیں اور دوسرے لمحے ہی اموجان کا ناتواں وجود اس کے مضبوط کشادہ سینے سے لگا بلک رہا تھا۔ اموجان کے آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔

''اموجان بس کریں آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی'' مہروز خان فوراً آگے بڑھے اور ان کو الگ کرتے بولے تھے۔ اموجان کا وجود اب تک ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

بیس سال کے بعد آخر کار اموجان کی انا کا خول پوری طرح چٹخ گیا تھا۔

......☆......

وہ سب سے ملا تھا مگر سب کا انداز لیا دیا تھا ان کے ملنے میں کوئی جوش، ولولہ نہ تھا وہ سب خاموش تھے۔

پری خاموش کھڑی گلناز کو ٹہوکے مار رہی تھی۔

''کیا ہے؟'' گلناز نے غصے سے مگر دھیمی آواز میں پوچھا۔

''یہ حیدر بھائی تو بڑے ڈیشنگ ہیں۔''

''تو اچار ڈالوں کیا؟'' وہ بپھری تھی۔

''اف تم سے تو بات کرنا فضول ہے۔'' وہ اس کے کورے جواب پر بل کھا کر رہ گئی تھی۔

''ہونہہ احمقوں کی ملکہ تو شروع سے ہی مرد بیزار ہے۔'' وہ دل میں اسے کوس کر رہ گئی تھی وسیع و عریض حال میں اس وقت ساکت خاموشی چھائی تھی۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ خاموش تھا وہ بھی ان سب کے درمیان خاموش نگاہ جھکائے بیٹھا تھا۔

''سفر کیسا رہا حیدر بیٹا؟'' ساکت خاموشی کو توڑنے میں پہل ظہیر خان نے کی تھی۔

''جی اچھا رہا تایا ابو۔'' آخری الفاظ پر یکدم وہ خاموش ہو گیا۔

''سوری'' اب کے اس کا لہجہ ندامت لیے ہوئے تھا۔

''کس بات پر؟'' ظہیر خان بولے۔

''تایا ابو کہنے پر کیونکہ میرے ابو تو جاتے ہوئے آپ لوگوں سے ہر رشتہ ختم کر گئے تھے۔ مجھے بھی کوئی حق نہیں ہے آپ کو کسی رشتے سے بلانے کا۔'' وہ شرمندہ سا بولا تھا۔

''تم قصوروار نہیں ہو!'' یکدم خاموش بیٹھی گل بخت اچانک بولیں۔

''میں ہی قصوروار ہوں کیونکہ میں شہروز خان کا بیٹا ہوں' اور ماں باپ کی، جرم کی سزا اکثر ان کے بچوں کو بھگتنی پڑتی ہے اور ایسا کچھ غلط بھی نہیں ہے اگر آپ سب لوگ مجھے یہاں سے دھکے دے کر بھی نکالیں گے تو آپ حق پر ہیں۔'' وہ لحظہ بھر رکا تھا۔

''میرا باپ اپنے کیے کی اتنی سزا بھگت چکا ہے کہ اب اس میں اور سزا جھیلنے کی طاقت نہیں رہی پلیز میری آپ سب سے ہاتھ جوڑ کر درخواست ہے کہ آپ انہیں معاف کر دیں بے شک ان کے حصے کی سزا مجھے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دے دیں میں بخوشی جھیلوں گا مگر انہیں معاف کر دیں۔'' وہ اونچا پورا مرد ہاتھ جوڑے رو رہا تھا اور اس کے رونے سے یہاں بیٹھے ہر شخص کا دل کٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا مگر کب تک ساکت بیٹھیں اموجان یہ سب سن کر یکدم ایک جانب لڑکھڑا گئی تھیں۔

''اموجان۔'' ان سب کی چیخیں یکدم پورے ہال کو دہلا گئی تھیں۔

......☆......

آج سنڈے تھا اور یونی سے آف ہونے کی وجہ سے آج نیہا یوم صفائی منا رہی تھی اس کا یوم صفائی مہینے میں صرف دو یا تین مرتبہ ہی آتا تھا۔ وہ بھی موڈ کے مطابق ورنہ باقی کے دنوں میں تو شمس بوا ہی پورا گھر دیکھتیں شمس بوا دہلی کی رہنے والی تھیں اور یہاں اپنے بیٹے کے پاس آئی تھیں لیکن بیٹے کی حادثاتی موت نے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا اور بہو نے بیٹے کے مرتے ہی انہیں یہ کہہ کر گھر سے نکال دیا تھا کہ اب اس کا ان سے کوئی رشتہ نہیں انجان ملک، انجان لوگوں میں ایک بوڑھی ان پڑھ عورت کہاں تک سفر کرتی ایسے میں انہیں اسرار آفندی ملے اور انہیں اپنے گھر لے آئے۔ نیہا اس وقت سات برس کی تھی۔ اسرار آفندی کو گھر کے کاموں کے لیے ایک عورت کی ضرورت تھی جو نیہا کو بھی سنبھالتی۔ ایسے میں شمس بوا کے علاوہ انہیں اور کوئی نظر نہ آیا اور انہوں نے شمس بوا کو مستقل اپنے پاس رکھ لیا۔ بوا کا بھی اس دنیا میں اور کوئی آسرا نہ تھا اس لیے انہیں بھی سر چھپانے کے لیے آسرا مل گیا تھا۔

''اری او بیٹا کیوں اسرار بیٹے کی چیزوں کو چھیڑ رہی ہے تو بس کر دے میں خود کر لوں گی'' اپنا تعارف کرانے کے بعد اب وہ اسرار آفندی کے کمرے میں صفائی کے لیے آدھمکی تھی۔ اور ان کی چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھ رہی تھی۔ جب بوا اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

''بوا آپ بھی اپنی ہڈیوں کو ذرا آرام دے لیا کریں جو اسپرنگ کی طرح ہر وقت اچھلتی ہیں۔'' وہ ان کی بات ان سنی کرتے اپنی ہانکنے لگی تھی۔

''اونوج سٹھیا گئی ہے کیا اور اب قیمتی کاغجوں (کاغذوں) کو کیوں فائیل سے نکال رہی ہے؟'' بوا نے اس کی کارستانیوں کو دیکھتے اپنا سر تھاما تھا۔

''اف بوا' ویسے تو مجھے مائی منڈا کہتی رہتی ہیں اور آج اگر سگھڑ بیبیوں والے کام کر رہی ہوں تب بھی مسئلہ ہے۔'' اس نے حسب عادت ناک چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

''اے بی بی تو ہمارے لیے وہی صحیح، ہم تم جیسی سگھڑ بیبیوں سے باز آئے۔'' بوا نے فٹ کہا اور وہ برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

'اب یہ سب چھوڑو کچن میں چلو، شوکیس میں سے برتن نکال کر دو!'' انہوں نے کہا تو اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل ٹیبل پر پھینکنے والے انداز سے رکھی تو اچانک اس فائل میں سے ایک تصویر نکل کر نیچے زمین پر گر گئی۔ نیہا کی اس تصویر پر نظر پڑی تو دنگ رہ گئی تھی۔

......☆......

مس امتیاز کا پیریڈ لینے کے بعد وہ پری کو ڈھونڈنے کینٹین آئی تو حسب معمول وہ تینوں وہیں بیٹھی کولڈ ڈرنک اور برگر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

''اچھا تو تم تینوں یہاں پکنک منا رہی ہو؟'' اس نے گھور کر ان تینوں کو دیکھا۔

''پکنک تو نہیں دعوت کہہ سکتی ہو!'' مرینہ نے برگر کا بڑا سا بائیٹ لیتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''کیا مطلب کیسی دعوت؟'' اس نے مرینہ کی بات پر پریشے کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''یار اس کا ہینڈسم ڈیشنگ کزن لندن سے آیا ہے اس کی خوشی میں۔'' پری کے بجائے زرینہ نے جواب دیا تو گلناز بل کھا کر رہ گئی۔

''پری تمہیں ایسی حرکتیں زیب دیتی ہیں، اموجان گھر میں بیمار پڑی ہیں، اور تم یہاں دعوتیں دے رہی ہو' بہت افسوس ہے مجھے۔'' یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی اور کینٹین سے باہر نکل گئی تھی۔ جبکہ وہ تینوں شرمندہ سی نگاہیں جھکا گئی تھیں اور سب سے زیادہ شرمندگی پریشے کے چہرے پر رقم تھی۔

''سوری پری ہماری وجہ سے......'' مرینہ نے معذرت کی تو وہ بول پڑی۔

''اٹس او کے' مرینہ تمہیں معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں غلطی میری ہے مجھے خیال کرنا چاہیے تھا۔''

''اموجان کو کیا ہوا؟'' ان دونوں نے پوچھا

''بس بی پی لو ہو گیا تھا۔'' اس نے بہانہ گھڑا اور فوراً وہاں سے اٹھ کر گلناز کے پیچھے چل دی۔ گلناز اسے ایک سائیڈ پر قطار میں لگے سفیدے کے درختوں کے نیچے کھڑی نظر آئی تو وہ فوراً اس کی جانب لپکی۔

''سوری گل میں نے کوئی دعوت نہیں دی وہ مذاق کر رہی تھیں۔'' اس نے صفائی پیش کی تھی۔

''بہر حال جو بھی تھا، تمہیں حیدر کا ذکر ان سے نہیں کرنا تھا بلکہ یونی میں کسی سے بھی نہیں۔'' گلناز نے اسے سمجھایا۔

''کیوں؟'' وہ سوالیہ پوچھنے لگی۔

''تم جانتی ہو کل جو کچھ ہوا ہمیں تو وہاں سے بھیج دیا گیا تھا ایسی کیا بات ہوئی کہ اموجان کا نروس سسٹم اتنی بری طرح متاثر ہوا' ضرور حیدر نے ہی کوئی ایسی ویسی بات کہی ہوگی جو اموجان برداشت نہ کر سکیں۔ پہلے شہروز چچا نے ہمیں دکھ دیا اور اب ان کا بیٹا آ گیا ہمارا سکون درہم برہم کرنے تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہر کسی سے اس کا ذکر کرنے کی وہ ہمارے لیے اہم نہیں ہے۔'' گلناز نے اپنے دل کی ساری بھڑاس نکال لی تھی کیونکہ پچھلے دنوں ہی اسے گل بخت سے کچھ کچھ معاملے کا پتہ چلا تھا اور اس روز حیدر کے لیے اس کے دل میں نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

......☆......

عائلہ زہرہ کے ساتھ مارکیٹ میں چند گھریلو اشیاء خریدنے بازار آئی تھیں اور اب زہرہ نے اسے کسی نئی مارکیٹ چلنے کا کہہ رہی تھیں جہاں لان کے ایمبرائیڈی جوڑوں پر سیل لگی ہوئی تھی۔

''زہرہ اتنی گرمی میں میرے سے تو نہیں جانا ہوگا میں یہاں فوڈ کارنر میں بیٹھی ہوں تم لے آؤ!'' اس نے انکار کیا۔

''تم بھی چلو کچھ اپنے لیے پسند کر لینا؟'' اور زہرہ کے کہنے پر وہ اس کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ ابھی شاپ کے اندر داخل ہی ہوئی تھیں کہ عائلہ کی نظر سامنے پڑی اور پھر جھپکنا بھول گئی۔

(جاری ہے)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

افسانہ

سیمارضاردا

خشک چہرہ

بظاہر نازک نظر آنے والی عورت اپنے اندر کتنا حوصلہ رکھتی ہے۔ یہ بات صرف عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ زینب بھی ایک مکمل عورت تھی، ماں اور بہن تھی...

ایئر پورٹ لاؤنج میں چار گھنٹے کا تھکا دینے والا سفر تھا...... اگر وہ نہ ملتی تو یہ وقت میں کیسے گزارتی...... کینیڈا کے لیے جہاز میں کوئی ٹیکنکل خرابی ہوگئی تھی...... شدید کوفت کا عالم تھا...... تب ہی

اُس نے زینیہ کو دیکھا...... اس کا نام زینب سے بگڑ کر زینیہ ہوگیا تھا...... اس وقت وہ بہت معمولی شکل کی انتہائی دُبلی لڑکی تھی...... بے کشش چہرے کی مالکہ...... کیا یہ اُس وقت سے ہی ایسی تھی جب میں نے دس سال پہلے اُسے اس آرگنائزیشن میں دیکھا تھا...... جس میں ہم ساتھ کام کرتے تھے...... وقت کتنی جلدی گزر گیا...... اُسے دیکھتے ہی وقت پیچھے سفر کرنے لگا......

ہم ساتھ کھانا کھاتے تھے، ساتھ ہی واپسی میں گھر کے لیے نکلتے تھے، اس کی بس ہمیشہ میری ویگن کے بعد آتی تھی...... اور یہ بات اُس نے ہمیشہ مجھے جتائی تھی کہ تمہارے جانے کے بعد ہی میری بس آتی ہے...... ایسا کیوں ہوتا ہے میرے ساتھ......؟ وہ خود سوال کرتی اور جواب دے دیتی...... میں صرف یہی کہتی کہ تمہارے روٹ کی بسیں بہت کم ہیں...... اور میں نارتھ میں رہتی ہوں تو ہر آدھے گھنٹے میں وہاں کی بسیں آتی رہتی ہیں......

وہ زندگی کے کٹھن ترین دن گزار رہی تھی...... وہ اپنے گیارہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی...... ''ایک بہن چھ دن جی کر مرگئی تھی ورنہ ہم بارہ ہوتے......'' وہ میری ذومعنی مسکراہٹ پر خود ہی وضاحت پیش کر دیتی......

وہ بلا کی ادب شناس تھی...... کتنے ہی کلاسیکل شعرا اور ادیبوں کو اس نے گھول کر پیا تھا...... وہ بظاہر سہمی ہوئی تصویر کی طرح تھی...... مگر اس کے اندر ایک شیر بیٹھا تھا جو ضرورت پڑنے پر اپنی للکار سے اپنی دہشت بٹھالیتا ہے......

اس وقت میری اور اس کی شعوری دوستی کی عمر تھی......

دن بھر آفس میں پرنٹنگ ہاؤس کے دیدہ زیب ڈیزائنوں پہ کام کرتے کرتے ہم تھک جاتے تو ہم 20 منٹ ایک دوسرے سے ضرور کسی نہ کسی موضوع پر بات کرتے...... اُسے گفتگو سے زیادہ بحث میں کمال حاصل تھا......

وہ اپنی بات ثابت کرنے کے لیے نہ جانے کہاں کہاں سے ثبوت اور دلیلیں لے آتی اور میں ہار جاتی...... دانستہ طور وہ ادب کی دُنیا میں بہت نمایاں ہوگئی تھی......

یہ میں نے اس لیے کہا کہ اب سے دس سال پہلے ایسا کچھ نہیں تھا...... اُسے اپنی شخصیت کا احساس تھا کہ وہ گلیمرس نہیں ہے بہت آگے نہیں جاسکتی...... وہ اپنے گھر کے ماحول سے بہت بیزار تھی...... بقول اس کے جب میں نے بی اے کیا تو میرا ایک اور بھائی پیدا ہوا...... اب بتاؤ اماں پیدا کرتی جائیں اور ہم پالے جائیں...... کیا زندگی ہے ہماری......؟ وہ سہمی ہوئی لڑکی اپنے اوپر بیتی مجھے بتانے لگی......

مجھے نفرت ہوگئی ہے ماں بننے سے...... میں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں اتنے بچے پالے ہیں کہ اب مجھے بچے پیدا کرنے کے خیال سے ہی کوفت ہوتی ہے......

زینیہ نے بہت برا سا منہ بنا کر کہا تھا...... ''سُنو تم شادی کرلو......''

یہ سُن کر اس کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا...... وہ خاموش ہوگئی تو میں نے کہا کہ اس میں کوئی ایسی بات تو نہیں جس سے تمہارا دل دکھ جائے......

اُس روز جب ہمیں مہینے کی تنخواہ ملی تو بہت خود ہو کے میں نے اس سے کہا، ''سُنو میرے ساتھ اللہ والی مارکیٹ تک جاؤ گی......؟''

اپنے جواب کو نہ پا کر میں نے اس کی طرف دیکھا وہ کسی سوچ میں گم تھی......

کیا ہوا......؟ چپ کیوں ہو......؟ آج تو تنخواہ

DOWNLOADED FROM PAK

Downloaded from Paksociety.com

ملی ہے...... خوش ہونے کا دن ہے...... چلتی ہو ناں...... مجھے امی اور روزینہ کے لیے سوٹ لینا ہے......

ہاں چلتی ہوں...... اس طرف مجھے بھی کچھ کام ہے...... چلو......

ہم نے آٹو رکشہ کیا اور اپنی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئے...... کچھ دیر میں میری شاپنگ مکمل ہوچکی تھی...... میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اس نے ایک جگہ اشارہ کیا......

وہ آئینوں کی مارکیٹ تھی...... شیشہ مارکیٹ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے پھر اس کی طرف بہت حسرت سے دیکھا...... کیونکہ اُس نے کپڑوں کے انتخاب میں میرا ساتھ ضرور دیا مگر خود کچھ نہیں لیا...... عجیب لڑکی ہے...... میں نے سوچا تھا...... اور پھر درمیانے سائز کا دیوار پہ نصب کرنے والا خوبصورت آئینہ اس نے لیا......

کالے اور سنہری دھاریوں سے آئینے کے چاروں طرف نقش نگاری تھی جبکہ آئینہ کے ختم ہوتے ہوئے حصے پر ایک دراز تھی جہاں میک اپ کی اشیا رکھی جاسکتی تھیں...... اتنے بڑے آئینے کو لے جانا بھی ایک مسئلہ تھا...... گوکہ زینیہ نے بڑی اچھی طرح سے اس کو پیک کروایا تھا...... مگر بس یا ویگن پہ لے جانا عقلمندی نہیں تھی...... وہ سوچ میں غلطاں تھی......

تب میں نے کہا رکشہ میں چلتے ہیں پہلے تم کو اتاروں گی پھر خود میں...... پھر اخلاقاً مجھے اس کے گھر بھی جانا پڑا...... یوں اس کے گھر میرا یہ پہلا تعارف تھا......

تین کمروں کا مختصر سا فلیٹ اور ۱۴ر افراد، جن میں لڑکیوں کی تعداد ۸ر تھی...... جانے کیسے گزارا ہوتا ہوگا...... زینیہ کی بہنیں لپک کر ہمارے پاس آئیں...... اُن کے چہروں پر خوشی عیاں تھی......

''شکر ہے آئینہ تو آگیا...... اب مزہ آئے گا...... اب ڈھنگ سے بال بنیں گے اور تیار ہوں گے......''

''چھوٹے چھوٹے شیشے تو آگ لگاؤ...... ہائے یہ کتنا پیارا ہے...... دیکھو ہم دونوں اس کے سامنے کھڑے ہوسکتے ہیں......'' زینیہ کی بہنیں گھوم گھوم کر اترا اترا کر آئینہ کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھیں...... تب ایک بہت ہی دبلی پتلی سی خاتون اندر داخل ہوئیں...... ملگجی سی ساڑھی میں ملبوس تھیں...... چہرے پہ بیزاری لے کر اُنہوں نے لڑکیوں کو ڈانٹنا شروع کردیا......

''یہ کیا ہڑبونگ مچا رکھی ہے...... تمہارے باوا ابھی آئے ہیں تھکے ہوئے ہیں......''

''اتنا تماشہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے...... اب سارا دن بیٹھی دیکھتی رہنا آئینہ...... جاؤ چلو پہلے باوا کو چائے دے کر آؤ......'' پھر میری طرف دیکھ کر بولیں...... ''آپ کون......؟''

''جی میں زینیہ کی سہیلی ہوں......'' میں نے زینیہ کی طرف اشارہ کیا...... جو اپنی بہنوں کی مدد سے آئینہ دیوار میں نصب کررہی تھی......

''ارے یہ نام بھی ان کے ابا کے دوست نے رکھا ہے...... اچھا خاصہ زینب نام تھا......'' وہ چڑ کر بولیں تو زینیہ کی بہن نے کہا......

''ارے ماں......! یہ نام سب سے اچھا ہے...... آپا پہ سوٹ کرتا ہے......''

''زیادہ تعریف کرنے کی ضرورت نہیں...... چلو ابا کے لئے روٹی بناؤ...... اور دیکھو زبیر اور مبشر کو دیکھو کہیں کھانا کھائے بغیر نہ چلے جائیں...... تم لوگوں کی ہنسی ٹھٹھول میں کچھ پتا نہیں چلتا......'' اس تمام عرصے میں زینیہ اپنے کام میں مگن رہی......

اس کی بہنیں خاصی خوش اخلاق تھیں...... وہ جلدی سے میرے لیے لیموں کا جوس لے آئی تھیں...... تب ہی زینیہ میری طرف مڑی اور اس نے کہا...... ''تمہیں دیر ہوجائے گی...... اب تم جاؤ......''

میں اس کے کہنے پر کھڑی ہوگئی اور میں نے دیکھا کہ گھڑی میں رات کے آٹھ بج رہے ہیں......

''آؤ میں تمہیں نیچے تک چھوڑ دوں......''

اس کی امی کو خدا حافظ کہتی ہوئی میں اس کے ساتھ نیچے آ گئی...... پیچھے اُس کے بہن بھائیوں کے شور کرنے اور لڑنے کی آوازیں تیسرے فلور تک آتی رہیں...... اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں بہت کچھ سوچتی اور اس کی ذات کو کریدتے چلی آئی......

''تمہیں پتا ہے میری امی کو دُنیا کا کچھ نہیں پتہ......'' اُس دن ہم دونوں مدرز ڈے کے حوالے سے کارڈ ڈیزائن کررہے تھے...... جب ماں کے موضوع پر گفتگو ہونے لگی......

''وہ کیسے......؟'' مجھے حیرت ہوئی......

''میں خود اپنا داخلہ لینے گئی تھی اسکول بھی اور پھر کالج میں بھی...... پھر میری دیکھا دیکھی میرے باقی بہن بھائی بھی پڑھائی میں دلچسپی لینے لگے...... بس وہ سبزی اور گوشت لینے کے لیے گھر سے نکلتی ہیں...... کپڑے ہمارے ابا لادیتے ہیں...... باقی اُنہیں کچھ مطلب نہیں......''

پھر تم...... میرا مطلب ہے ایسا کیوں ہے؟ میں کچھ نہ کہہ پارہی تھی...... پھر بھی سوال اُٹھ گیا......

''ظاہر ہے پٹنہ کے گاؤں سے بیاہ کر 14 سال کی عمر میں ابا کے ساتھ آئی تھیں...... پھر ابا پاکستان لے آئے...... ابھی تک دیہاتی طرز پہ ہیں...... ایک فیصد فرق تو آگیا ہے...... صرف بچے پیدا کرنا تو کمال نہیں...... اُن بچوں کی زمانے کے حوالے سے تربیت بھی ضروری ہے......'' وہ بہت تلخی سے بولی تھی...... وہ دبلی پتلی سہمی ہوئی لڑکی آج اور دکھی تھی......

اس کے بعد ہماری بات نہیں ہوئی تھی...... وہ بس آنے والے دنوں سے بہت پُر اُمید تھی...... وہ زندگی کو زندگی کی طرح جینا چاہتی تھی...... اپنے بہن بھائیوں کے لیے چاہتی تھی......

اس کے عزائم بلند تھے...... وہ اُن کو پورا کرنے کے لیے بہت آگے نکل گئی...... اور جب اُس کی عمر کے سنہرے چھ سال اپنے گھر...... اپنے بہن بھائیوں میں بسر ہوگئے تو وہ اس وقت 38 سال کی ہوچکی تھی......

اس کی دو بہنوں کی شادی ہوچکی تھی...... ایک بہن اور بھائی اپنے پیروں پر کھڑے ہوچکے تھے، چھ ماہ پہلے اس کے ابا کا انتقال ہوچکا تھا......

اپنے گھر کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو پورا کرتے کرتے وہ بہت سے لوگوں کی ضرورت بن چکی تھی...... یہ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی اس زندگی سے خفا تھی...... جو اسے ورثہ میں ملی تھی...... اور آئندہ والی زندگی میں کوئی عکس بھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا پڑے......

میں الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ہوگئی تھی...... وہ کہاں تھی مجھے کچھ نہیں پتا...... لیکن مجھے یاد بہت آتی تھی کہ ہم نے اچھے دن گزارے تھے...... وہ خود کو منوانے کے لئے جانے کس دیس کے سفر پہ رواں تھی......

زندگی بھر جدا نہیں ہوتے
درد بھی بااُصول ہوتے ہیں

اور آج اچانک کراچی ایئرپورٹ پر اس سے ملاقات ہوئی تو میں ششدر تھی...... کسی مسافر کا ہینڈ کیری ہاتھوں سے ٹکرایا تو میں حال میں واپس آگئی اور زینیہ کی طرف بڑھی جو چپ چاپ شیشے کو دیکھ رہی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھی......

''تم......!'' وہ مجھے دیکھ کراتنی خوش ہوئی کہ اس کے چہرے کے خدوخال اس کا ساتھ دے رہے تھے...... وہ پہلے فریش اور صحت مند ہوگئی تھی...... میں نے غور کیا کہ اب اس کی مسکراہٹ میں طنز نہیں تھا...... ''تم پہلے سے خوبصورت ہوگئی ہو زینیہ......'' میں نے اس کو یہ کہنے میں ذرا دیر نہیں لگائی......

''تم آج بھی مجھ سے ویسا ہی پیار کرتی ہو...... اس لیے وہی انداز دکھایا تم نے......'' اس نے بھی حساب برابر کیا...... ''تم خوش کرنے کا موقع نہیں چھوڑتیں......''

''آؤ سامنے کافی ہاؤس میں چلتے ہیں...... چار گھنٹے سے زیادہ بھی وقت لگ سکتا ہے......'' اس نے بیگ اُٹھایا اور ہم دونوں ساتھ چلتے ہوئے کافی ہاؤس میں چلے آئے......

کافی کے آرڈر کے ساتھ میں اپنی بے تکلفانہ عادت سے مجبور ہوکر کہہ اُٹھی......

''سنو میں تو شادی کرچکی ہوں......اور میری تین سال کی بیٹی ہے...... حورین اور میرے شوہر فرحان مارکیٹنگ سے وابستہ ہیں...... بہت محبت کرنے اور مخلص شوہر ہیں...... سب ٹھیک ہے...... میری بہن کے سسرالی عزیز آرہے ہیں...... تو بہن کی بیماری کی وجہ سے میں اُن کو ریسیو کرنے آئی ہوں......سوچ رہی تھی انتظار کی اذیت کیسے دور ہوتو دیکھو تم مل گئیں......'' میں خوش دلی سے بولی......

اس نے میری طرف دیکھا اور کہا ''انتظار میں تو اذیت ہوتی ہی ہے......''

اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ بہت کچھ پوچھنے کو دل چاہا......

میں کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا...... ''سنو زینیہ سب ٹھیک ہے ناں......؟''

''ٹھیک تو کچھ نہیں ہوتا...... بس سب کچھ ٹھیک رکھنا پڑتا ہے......''

''تمہاری باتوں میں وقت کے ساتھ اور گہرائی ہوگئی ہے...... کچھ بتاؤ تو سہی ان سالوں میں کیا کچھ حاصل کرلیا ہے......؟''

''بہت کچھ حاصل کرلیا...... وہ جس کی تمنا ہر ایک کو ہوتی ہے......'' وہ کافی کا مگ ختم کرکے ٹیبل پر رکھتی ہوئی بولی......

''اچھا......'' میں حیران ہوئی......

''ہاں...... تم سُننا چاہوگی......؟'' وہ مجھے بہت سنجیدہ لہجے میں بولی......

''آف کورس زینیہ......!! میں کیوں نہیں سنوں گی...... تم میری دوست ہو...... بہت کچھ ہمارے درمیان کی باتیں ہیں...... جو مجھے نہیں پتہ...... مجھے معموں میں نہ بتاؤ...... کیا اب کرتی ہو اور کون شامل ہے تمہاری زندگی میں......؟''

''کیا کرتی ہوں میں...... اس سوال کا جواب گفتگو کے آخر میں دوں گی...... تمہیں پتہ ہے ناں روبی...... میری امی کو کتنی خواہش تھی کہ ہمارا گھر زمین کا ہو...... ساتویں آٹھویں فلور سے وہ عاجز تھیں...... خیر وہ عاجز تو وہ ہر چیز سے تھیں...... میرے ابا کی عاجزی سے لے کر بچوں کی عاجزی تک اُنہیں قطعاً پسند نہ تھی...... اور پھر گھر میں بڑی اولاد تھی اور بہت نفسیاتی دباؤ کا شکار ہوکر میں نے اپنی صحت تک کھودی......'' اس کی آنکھیں یہ سب بتاتے ہوئے ہلکی ہلکی گیلی ہورہی تھیں......

''بہت سکون مل گیا تھا...... اور زندگی کے دکھ، دلدر بہت کم ہوگئے تھے......شاید آسودگی اسی کا نام ہے...... جو میری امی کے وجود میں نظر آرہی ہے...... بقول اُن کے میں اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کا فن جان گئی ہوں......''

وہ بھی شاید سب بتانا چاہتی تھی...... کسی بوجھ سے آزاد ہونا چاہتی تھی......

''مگر زینیہ تم یہ بتاؤ...... تم نے اتنا عرصہ کیا کیا......؟ کہاں رہیں......؟ تمہاری ملازمت کیا ہے......؟ سب ٹھیک ہے ناں......؟''

''ہاں بہت خوبصورت زندگی ہے...... زندگی کی ساری آسائشیں میرے پاس ہیں...... اپنے بارے میں کیا بتاؤں......؟''

''یہی ناں کہ مجھ جیسی خشک بیمار لڑکی اچانک کانٹوں کے راستوں پہ سفر کرتی ہوئی کیسے آگے بڑھ گئی......''

اس نے ایک آہ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور بولی......

''سنو...... نہ مجھ میں کوئی گلیمر تھا نہ ادائے دلبری...... سادہ لباس اور ذمہ داریوں کا بوجھ تھا...... ہاں ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے مجھے بہت کچھ کرنا پڑا......''

''قسمت اُن دنوں مجھ پر مہربان تھی...... جب دبئی سے ایک شیخ کی فیملی سے میرا ٹکراؤ ہوا...... تمہیں پتا تو ہوگا کہ میری عربی بہت اچھی تھی...... بس عربی کا علم مجھے لکھ پتی بنا گیا...... وہ مہربان خاتون مجھے اپنے ساتھ لے گئی...... وہاں رہ کر میں نے بہت کام کیے......''

''میں پس منظر میں رہنے والی تھی...... لیکن یہاں کے اور وہاں کے پس منظر میں زمین آسمان کا فرق تھا...... اُن خاتون کے بچے مجھ سے مانوس ہوگئے...... اُن کی تعلیم و تربیت رکھ رکھاؤ سے لے کر زندگی کے ہر معاملے میں وہ میرے احسان مند تھے...... یوں اُنہوں نے اتنا نوازا کہ گھر کی ہر فکر سے آزاد ہوگئی......''

''زندگی گلاب نہ سہی مگر خوشبو انسان کے وجود میں ہوتی ہے......'' یہ کہہ کر پھر چپ ہوکر بولی......

''میں نے شادی نہیں کی...... یا کسی نے مجھ سے شادی نہیں کی......؟ یہ سوال تمہارے ذہن میں ہوگا......''

''اصل میں شادی دو دلوں کا سودا ہے...... دل کی شادی تو نہ ہوسکی...... مگر آٹھ بچوں کے باپ کا پرپوزل میں نے پچھلے سال قبول کرلیا ہے...... یہ میرا احسان ہے اُن خاتون پر جو اب اس دُنیا میں نہیں...... مگر اُن کے آخری الفاظ تھے کہ ماں بن کر میرے بچوں کا خیال رکھنا......''

''میں ماں نہیں بن سکتی مگر ماں بن گئی ہوں......'' وہ ہلکا سا مسکرا کر بولی...... پلکوں کے کنارے گیلے ہورہے تھے...... اور میں نہ مسکرا اس کی نہ تسلی دے سکی...... جہاز کی روانگی کا اعلان ہورہا تھا......

وہ خشک چہرے والی لڑکی نپے تلے قدم اُٹھاتی آگے بڑھتی جارہی تھی......

وہ اس صدی کی سب سے کامیاب عورت تھی یا ماں...... اس کا فیصلہ آپ بھی کرسکتے ہیں......

☆☆☆

قطعات

بڑے عذاب ہیں دنیا میں آدمی کے لیے
ہے ظلمتوں میں سفر شرطِ آگہی کے لیے
بجھانے نکلے ہیں جن کو نظر نہیں آتا
کہاں کہاں دیے جلاتے ہو روشنی کے لیے

☆

اس عہد نادہند سے کیا مانگتے ہیں آپ
یعنی محبتوں کا صلہ مانگتے ہیں آپ
ہر شخص ڈھونڈتا ہے کسی کو نہیں ملا
ناپید آدمی سے خدا مانگتے ہیں آپ

شاعر: اوسط جعفری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

افسانہ

محبت بنی زباں

سنو عشال ہمیشہ ایسی رہنا جیسی اب ہو محبت کرنے والی۔ مجھے تمہاری آنکھوں سے عیاں ہوتی محبت سے محبت ہے کیونکہ محبت سے بڑی کوئی زبان نہیں ہوتی...

پورے پانچ برس بعد وہ اس کے روبرو تھا۔ اس کے سامنے بیٹھی ہوئی وہ روز اوّل کی طرح دلکش اور حسین لگ رہی تھی۔ اس سے مخاطب ہونے کے لیے وہ الفاظ جوڑ رہا تھا اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ بات

کہاں سے شروع کرے بعض اوقات شرمندگی اور ندامت کا احساس انسان کے لفظوں کو ساکت کر دیتا ہے۔ اس کو بھی یہی لگ رہا تھا کہ اس کے الفاظ کہیں کھو سے گئے ہوں......

یونیورسٹی کا پہلا دن نئے آنے والے اسٹوڈنٹس جوش و خروش، چہرے پر لیے آنکھوں میں کچھ کر دکھانے کا عزم لیے یونیورسٹی کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ اسٹوڈنٹس کی اس بھیڑ میں وہ پر اعتمادی سے نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی پروقار سی آگے بڑھ رہی تھی۔ ارمغان شاہ جو فارمیسی ڈیپارٹ کے فائنل ایئر میں تھا لابی میں کھڑا نئے آنے والوں کو گائیڈ کر رہا تھا۔ اس کی نگاہ بلا ارادہ سامنے کی جانب اٹھی اور پھر ان نگاہوں نے پلٹنے سے انکار کر دیا پنک لباس پر سفید دوپٹہ شانوں پر پھیلائے اپنے سنہری شولڈر کٹ بالوں کو ایک ہاتھ سے سنوارتی اپنے ساتھ چلتی لڑکی کی بات پر مسکرا کر اس کے پاس سے ہوا کے جھونکے کی مانند گزر گئی۔ ارمغان شاہ اس کے گالوں میں پڑتے بھنور میں کھو سا گیا۔

''او ہیلو ہیرو کدھر گم ہو'' وقار شرارت سے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتا ہوا بولا۔

''کہیں نہیں یار!'' وہ مسکرا کر وقار کو ٹالتے ہوئے بولا۔ ''کچھ تو ہے بیٹا جس کی پردہ داری ہے۔'' وقار کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''چل آگے بڑھ کلاس کے لیے لیٹ ہو رہے ہیں۔'' ارمغان اس کے سر پر چپت لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا مگر وہ بھی وقار احمد تھا اڑتی چڑیا کے پر گن لیتا تھا...... ''نام عشال ہے ایم بی اے کی اسٹوڈنٹ ہے ابھی تک بس اتنا پتا چلا ہے'' وقار کیفے میں بیٹھے ارمغان کے پاس آتا ہوا بولا۔ ''کون، کس کی بات کر رہا ہے؟''

''ابے یار اتنا بھولا مت بن جس کے بارے میں بول رہا ہوں تو جانتا ہے ہیرو'' وہ کرسی پر اس کے سامنے بیٹھتا ہوا شوخی سے بولا ''ویسے یہ معلومات مہ وش بی بی سی نے دی ہیں۔'' وقار شرارت سے مہ وش کا نام لیتے ہوئے بولا۔ ان کے گروپ میں مہ وش بی بی سی کے نام سے مشہور تھی۔ ہر چیز کی اسے خبر رہتی تھی بقول وقار کوئی دیکھے نہ دیکھے مہ وش ضرور دیکھے گی۔ ''باقی گروپ کہاں ہے'' ارمغان چپس کھاتا ہوا بولا۔ ''مہ وش کا تجھے پتہ ہے نکلی ہوگی خبریں لینے سب کی، ہمارا شاعر علی بیٹھا ہوگا کسی درخت کے نیچے اور اپنی شاعری سے درخت پر بیٹھے پرندوں کو جی بھر کر بور کر رہا ہوگا اور لائبہ لائبریری میں کتابوں میں منہ دیے بیٹھی ہوگی ہمیشہ کی طرح اور باقی بچا میں وقار احمد صرف لڑکیوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک وہ بیٹھا ہے تیرے سامنے۔'' ارمغان جو چائے کا گھونٹ بھر رہا تھا وقار کے مسخرے پن سے آنکھوں کی ٹھنڈک کہنے پر اس کی ہنسی نکل گئی نتیجتاً چائے کی کلی وقار کے منہ پر ہو گئی جس پر وقار غصے سے بھنا کر ارمغان کو دیکھنے لگا۔ سامنے سے آتی ہوئی سائیکلوجی ڈپارٹ کی عانیہ جس پر وقار آج کل اپنے ہیرو پن کی دھاک بٹھا رہا تھا وقار کے اس مضحکہ خیز حلیے کو دیکھ کر بے ساختہ ہنس دی۔ جس پر وقار جھینپ کر ارمغان کو گھورنے لگا جو اپنی ہنسی ضبط کرنے میں بے حال ہو رہا تھا۔ عانیہ کو دیکھ کر زوردار قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

☆......☆

''سنو سنو ایک خبر ہے تم لوگوں کے لیے۔'' مہ وش دور سے بھاگتی ہوئی اپنے گروپ کے پاس آنے لگی وہ چاروں اس وقت لان میں بیٹھے تھے۔

''اللہ خیر کرنا یونیورسٹی کی زمین پر۔'' علی مہوش کے موٹاپے پر دہل کر بولا۔

''بری بات ہے کسی کو ایسے نہیں بولتے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com
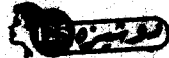
لائبہ برا مانتے ہوئے کتاب سے نظر اٹھا کر علی کو گھورتے ہوئے بولی۔

''اوہ ہیلو کتابی کیڑی زیادہ دادی بننے کی ضرورت نہیں میری، آئی بڑی بری بات ہے۔'' علی منہ بگاڑ کر لائبہ کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔

''اوہ جون ایلیا کے جانشین تمہیں بھی زیادہ کسی کا مذاق اڑانے کی ضرورت نہیں'' لائبہ تپ کر علی کو دوبدو جواب دیتے ہوئے بولی۔

''ابے بھائی لڑنا بند کرو تم دونوں اور اس بے چاری کی سن لو اس کی گھر میں کوئی نہیں سنتا۔'' وقار ان دونوں کو چپ کرا کر مہ وش کی طرف متوجہ ہو گیا جو پرانی فلمی اداکارہ کی طرح گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ ''تمہاری نہیں سنتا ہوگا کوئی گھر میں میری تو سب سنتے ہیں۔'' مہ وش وقار کی بات پر چڑ کر بولی۔

''موٹی ابھی تمہیں پتا نہیں ہے وقار احمد کیا ہے۔ ہیرو بندہ ہے۔'' وقار فخر سے شرٹ کے کالر کھڑا کرتا ہوا بولا ''ابے چل آیا بڑا پاگلوں کا ہیرو۔'' مہ وش ناک پر سے مکھی اڑاتے ہوئے بولی۔ وقار جل کر مہ وش کو دیکھنے لگا اس سے پہلے دونوں پھر لڑنا شروع ہوتے ارمغان بول پڑا'' مہ وش تم نے کچھ بتانا تھا ہمیں۔''

''ہاں سنو ہماری کلاس کے کاش اور مونا کی منگنی ہو رہی ہے۔ بڑے چھپے رستم نکلے دونوں۔ ابھی مجھے مونا نے بتایا ہے۔''

''کیا یہ نہیں ہوسکتا کہہ دو مہ وش یہ غلط ہے۔'' وقار کی زوردار چیخ پر سب ڈر کے اچھل گئے۔ میں نے سوچا تھا اتنی پیاری لڑکی کو تم لوگ کی بھابھی بناؤں گا۔'' وقار مصنوعی آنسو بہاتے ہوئے ارمغان کے کندھے سے سر ٹکاتے ہوئے بولا۔

''ہاں تو بن تو رہی ہے ہماری بھابھی۔ کاشف بھی تو ہمارا بھائی ہے۔'' ارمغان کے شرارت سے کہنے پر سب قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

☆......☆

''میرا ہیرو اتنا اداس کیوں بیٹھا ہے وہ بھی درخت کے نیچے۔ کیا کرتا ہے یار کوئی چڑیل اگر عاشق ہوگئی میرے یار پر۔'' وقار شوخی سے کہتا ہوا ارمغان کے برابر دھم سے بیٹھتا ہوا بولا۔ ''نہ کر یار میرا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔'' ارمغان بیزاری سے بولا ''اوہ تیری خیر، کیا ہوگیا تیرے موڈ شریف کو۔''

''مما اپنی بھانجی سے منگنی کا بول رہی ہیں جبکہ تو جانتا ہے......'' وہ بولتے بولتے رک سا گیا۔

''پہلے تو مجھ سے ہاتھ ملا میرے بھائی۔'' زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کے دو تین جھٹکے دیتے ہوئے بولا۔ ''کیا کر رہا ہے ہاتھ توڑے گا کیا۔'' ارمغان گھور کر ہاتھ کھینچتا ہوا بولا

''دیکھ میرے پیارے راج دلارے بھائی ارمغان شاہ فلم ہو ڈرامہ ہو یا کہانی وہ تب ہی کامیاب ہوتی ہے جب اس میں کوئی ولن انٹری دے تو شکر کر تیری لو اسٹوری میں کوئی ولن تو آیا'' ''تو میری مما کو ولن بول رہا ہے۔'' وہ مصنوعی خفگی سے اسے گھورتا ہوا بولا۔

''توبہ میری اتنی مجال کہ تیری مما کو ولن بولوں۔'' وقار کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا بولا ''میں تو بس مثال دے رہا تھا۔''

''ہاں میں سمجھتا ہوں تیری سب مثالوں کو بیکار کی مثالیں ہوتی ہیں تیری اب تو مجھے مشورہ دے میں کیا کروں۔''

''تو اس درخت کے نیچے دھمال ڈال میں آنٹی کو بولوں گا جا کر، آپ کے بیٹے پر ایک حسین چڑیل عاشق ہوگئی ہے اس کے بیاہ کا خیال اب دل سے نکال دیں۔''

''میں بھول گیا تھا کہ میں تجھ جیسے فضول انسان سے مشورہ لے رہا تھا تو کھڑا ہو جا یہاں سے۔''

''ابے یار قسم سے تو بھی اتنی جلدی ملکۂ جذبات بنتا ہے میں تو تجھے ریلیکس کر رہا تھا۔ میں نے دور سے ہی تجھے اس درخت کے نیچے بیٹھا دیکھ لیا تھا میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ آج کیا علی کی گدی تو نے سنبھالی ہوئی ہے۔ کیا پتا تجھے بھی شعر و شاعری کی آمد ہو رہی ہو۔''

''میں جا رہا ہوں تو بکتا رہے۔'' ارمغان غصے سے کھڑا ہونے لگا۔

''اچھا چل نہیں کر رہا بیٹھ جا۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی بٹھاتا ہوا بولا۔

''دیکھ میرے ہیرو یہاں بیٹھ کر اس لیلیٰ کے لیے آہیں بھرنے سے بہتر ہے تو جا کر اس سے اظہار کر اور جہاں تک بات مما کی ہے تیری، تو ان کو بھی بول مما میں نے آپ کے لیے چاند سی بہو ڈھونڈ لی ہے۔'' وقار کی ایک بار پھر رگ شرارت پھڑک اٹھی۔ اب کی بار ارمغان بھی ہنس دیا۔

☆......☆

''تم نے جواب نہیں دیا اب تک میری بات کا ارمغان بیٹا تم کچھ بولو تو آگے میں راحت سے بات کروں۔'' رخشندہ بیٹے کے برابر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ وہ ابھی ابھی کلب سے آئی تھیں۔

''مما میں نے مہرین کے حوالے سے ایسا کچھ سوچا نہیں۔'' وہ ٹی وی پر سے نظریں ہٹاتا ہوا اماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تو اب سوچ لو مائی سن، مہرین کے ایک دو بہت اچھے پروپوزل آئے ہوئے ہیں۔ راحت اتنا ویٹ نہیں کرے گی۔''

''مما دراصل میری یونیورسٹی میں ایک لڑکی ہے میں اسے پسند کرتا ہوں۔''

''اوہ تو یہ بات ہے' گڈ...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے' پھر کب ملوا رہے ہو۔''

''مما کچھ ٹائم دیں بس۔''

''او کے بیٹا پر خیال رہے۔ اس کا میچ ہماری کلاس سے ہونا چاہیے۔''

''جی مما۔'' وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ جانتا تھا اس کی مما کس قدر کلاس کانشس ہے۔

☆......☆

اس کو اکیلا لائبریری میں بیٹھا دیکھ کر وہ اس کی طرف چلا آیا۔ آج اس کے ساتھ اس کی دوست نہیں تھی۔

''کیسی ہیں آپ۔'' ارمغان کے سوال پر عشال مسکرا کر فقط سر ہلا کر رہ گئی۔

اس کی اس حرکت پر وہ جز بز سا ہو گیا۔ کافی ٹائم سے آپ سے بات کرنے کا سوچ رہا تھا پر آپ کے ساتھ آپ کی دوست ہوتی تھی تو بات نہیں ہو پاتی تھی۔'' وہ گلا کھنکارتے ہوئے بات شروع کرنے لگا۔ عشال کتاب سائیڈ پر رکھ کر اس کی جانب متوجہ ہو کر اس کی بات سننے لگی۔ ارمغان شاہ کی نگاہیں اس کے چہرے پر الجھ سی گئیں گندمی رنگت پر بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں۔ چہرے پر غضب کا بھولپن لیے وہ سیدھی اس کے دل میں اتر رہی تھی۔

''عشال میں سیدھا سادا بندہ ہوں، لفظوں سے کھیلنا جانتا نہیں، بات کو گھما کر کرنے کی نہ میری عادت ہے سیدھی سی بات ہے میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں جانتا آپ کے بارے میں، اتنا جانتا ہوں کہ آپ کو دیکھ کر میرے دل نے گواہی دی تھی کہ یہی ہے وہ لڑکی جس کی مجھے چاہ تھی۔ آپ جتنا وقت لینا چاہیں سوچنے کے لیے لیجیے آپ کو پورا حق ہے جو جواب آپ کا ہو مجھے منظور ہے۔'' وہ اس کی کشادہ آنکھوں میں تیرتی حیرانی کو دیکھ کر کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

☆......☆

میں نے اس کو بول تو دیا کہ آپ کا جو جواب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گلِ نرگس

یونان کا ایک ایسا بادشاہ گزرا ہے جو اپنی شخصی وجاہت حسن و دلکشی میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اسے دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے لیکن اس دور میں آئینہ ایجاد نہیں ہوا تھا لہذا بادشاہ اپنا سراپا دیکھنے ایک جھیل کے کنارے جا کر ٹھہرے ہوئے پانی میں اپنا عکس دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا اور اس کی موت اسی جھیل میں ڈوب کر ہی ہوئی۔

گلِ نرگس بہت ہی کمیاب پھول ہے اس کی شکل انسانی آنکھ جیسی ہوتی ہے بس آنکھ جیسی لیکن بینائی سے خالی جبکہ چمن کے دوسرے پھول بھی اپنے حسن کو دیکھنے سے قاصر حتیٰ کہ نرگس بھی۔ فارسی کے عظیم شاعر بیدل کا شعر جس کا ترجمہ علامہ اقبال نے پیش کیا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

انگریزی میں اس کے دو نام ہیں Narcissi اور Narcissus اور نرگسیت کے لیے Narcissism یعنی خود پسندی خود نمائی اسی لیے کسی ایسے شخص کو جو خود پسندی، خود نمائی میں مبتلا ہو کہا جاتا ہے کہ نرگسیت کا شکار ہے۔

نجیب عمر، کراچی

ہوگا وہ مجھے منظور ہے۔ اگر اس کا جواب انکار میں ہوا تو میں کیا رہ پاؤں گا اس کے بنا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر لان میں دیکھتا ہوا سوچنے لگا۔ پر وہ مجھے کیوں منع کرے گی میں ہر طرح سے اس کے لائق ہوں مگر اس کے دل میں کسی اور کے لیے محبت ہوئی تو میں کیا کروں گا۔ ارمغان کے دل میں خدشات سر ابھار رہے تھے۔ اللہ نہ کرے کہ ایسا کچھ ہو۔ اس کا جواب اقرار میں ہو۔ میں عشال کو نہیں کھو سکتا۔ پہلی بار تو میرے دل نے کسی کی چاہ کی ہے۔ میں پھر کیسے اس کو کھونے کا حوصلہ کر سکتا ہوں۔ کاش عشال ایسا ہو جائے جو میرے احساسات ہیں تمہارے حوالے سے تمہارے دل میں بھی وہی سب میرے لیے ہو جائے۔ ارمغان سچے دل سے دعا کرنے لگا۔

☆......☆

یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا

اک ہی شخص تھا جہان میں کیا

''کیسا ہے یہ شعر۔'' علی سب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''تیرا تو نہیں ہے جو تو اتنا خوش ہو رہا ہے۔'' ارمغان سموسہ کھاتے ہوئے بولا۔ وہ لوگ اس وقت کیفے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ''تھوڑی تھوڑی دیر بعد تجھے کیا شعر و شاعری کے دورے پڑتے ہیں۔'' وقار علی کے بازو پر گھونسہ مارتے ہوئے بولا۔

''ایک شاعر کا مقام حساس لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں تجھ جیسے بد ذوق لوگ نہیں کیوں لائبہ ٹھیک کہا نا میں نے۔'' وہ کولڈ ڈرنک کے سپ لیتی ہوئی لائبہ سے مخاطب ہوا۔

''پتا نہیں کیا کہا تم نے میری تو سماعتیں ہی متاثر ہو گئی ہیں اتنے سالوں سے تمہاری بے تکی شعرو شاعری سن سن کر اب تو۔'' لائبہ بے نیازی سے بولی جس پر مہ وش قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

''لو بھائی ہو گئی تمہاری ٹھنڈی ٹھار عزت۔'' مہ وش لائبہ کی بات کو انجوائے کرتے ہوئے دوبارہ سے ہنسنے لگی۔ ''آہستہ ہنسو، لگ رہا ہے کیفے میں زلزلہ آ گیا۔'' علی مہ وش کے ہنسنے پر اپنا بدلہ لیتے ہوئے بولا۔ ''ہاں تو میں تمہاری طرح تھوڑی ہنستی ہوں تم ہنستے ہو تو لگتا ہے چوزہ چوں چوں کر رہا ہے۔'' مہ وش علی کی دبلی پتلی جسامت پر چوٹ کرتے ہوئے ڈھٹائی سے بولی۔ ''یہ ارمغان کو کیا ہو گیا۔ اتنا چپ چپ سا کیوں بیٹھا ہے۔'' مہ وش اپنے برابر خاموش ارمغان کو دیکھ کر حیرانگی سے بولی۔

''وہی جو مجنوں کو لیلیٰ سے ہوا تھا۔'' وقار کی بات پر ارمغان اس کو گھور کر دیکھنے لگا۔

''کیا مطلب؟'' مہ وش کے کان فوراً کھڑے ہو گئے۔

''کچھ نہیں یار اس کی تو عادت ہے بیکار کی بک بک کرنے کی۔'' وہ مہ وش کو ٹالتے ہوئے کھا جانے والی نظروں سے وقار کو دیکھنے لگا جو علی سے سموسہ جھپٹ کر کھاتے ہوئے ارمغان کے گھورنے پر ڈھٹائی سے آنکھ مار کر ہنس رہا تھا۔

☆......☆

میں تم سے کیسے کہوں ارمغان کہ عشال بھی تمہیں کس قدر چاہتی ہے۔ تمہاری وہ نگاہیں جو بار بار میری جانب اٹھتی ہیں مجھے ان نگاہوں کی سچائی سے کس قدر پیار ہے پر میں کتنی بدنصیب اور بے بس ہوں کہ چاہ کر بھی تم کو نہیں بتا سکتی کہ میں تم سے کس قدر پیار کرتی ہوں۔ میری زندگی میں آنے والے پہلے شخص ہو تم جس کے نام پر میرا دل ہر لمحے ہر پل یہی گواہی دیتا ہے کہ مجھے بھی تم سے محبت ہے پر میں تمہارے قابل نہیں۔ ارمغان شاہ میں کیسے تمہیں یہ بتاؤں کہ میں تم کو کیسے کھو سکتی ہوں اے اللہ میں کیسی بے بسی میں گرفتار ہو گئی ہوں۔ عشال اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆......☆

''کیسے ہو ارمغان؟'' لائبہ ارمغان کو لان میں اکیلا بیٹھا دیکھ کر اس کے پاس آ گئی۔

''میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو۔'' وہ مسکرا کر لائبہ کو دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا اس کو اپنے گروپ میں لائبہ اچھی لگتی تھی۔ دھیمے مزاج کی کم کم بولنے والی پڑھاکو سی۔ ''باقی سب کہاں ہیں؟'' لائبہ اپنے گروپ کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتے ہوئے بولی۔

''کوئی بھی نہیں آیا میں سمجھا تم بھی نہیں آئیں تم نظر نہیں آتیں تو میں تو بس گھر جانے والا تھا اب۔''

''نہیں میں لائبریری میں تھی آج صبح کلاس مس ہو گئی تھی تو میں لائبریری چلی گئی۔ پر آج دل نہیں لگ رہا کتابوں میں۔''

''خیریت تو ہے ہماری لائبہ کا دل کون لے گیا۔'' ارمغان شوخی سے لائبہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''بس فضول بکواس کرو آج وہ دونوں مسخرے نہیں ہیں نا تو تم نے ان کی جگہ سنبھالی ہوئی ہے۔'' لائبہ کتاب ارمغان کے بازو پر مارتے ہوئے بولی جس پر ارمغان زور سے ہنس دیا۔ لائبہ اس کے خوبرو چہرے سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی

☆......☆

میرا اک مشورہ ہے التجا نہیں

تو میرے پاس سے اس وقت جا نہیں

علی برابر میں بیٹھی لائبہ کو کن انکھیوں سے دیکھتا ہوا شعر پڑھنے لگا۔

''واہ، واہ محفل لوٹ لی، تو نے پر افسوس میرا دل نہ لوٹ سکا۔''

''تو تو جب بولے گا بے تکی بولے گا۔'' علی وقار کی بات پر بدمزہ سا ہو کر بولا۔

''مس یونیورس پر سفید رنگ کس قدر جچ رہا ہے۔'' مہ وش عشال کو دیکھتے ہوئے بولی جو ڈیپارٹ سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی تھی۔ مہ وش نے اس کا نام مس یونیورس رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کو بھی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کسی سے بات کرتے دیکھا ہی نہیں بس ہر وقت اپنی دوست کے ساتھ بھی ہوتی ہے تو چپ چپ سی۔'' مہ وش عشال پر غور کرتے ہوئے بولی۔

''یار اتنی بیوٹی فل ہے تو غرور بھی ہوگا اس میں'' لائبہ مہ وش کی بات پر بولی'' ہاں بیوٹی تو بہت ہے کیوں ارمغان؟'' وقار ارمغان کو دیکھ کر آنکھ مار کے بولا۔'' ویسے سفید رنگ تو تم پر بھی بہت جچ رہا ہے''علی لائبہ کو دیکھ کر آہستگی سے بولا جس پر لائبہ نے ان سنی کر دیا۔ وہ اس کی بے نیازی پر مسکرا دیا

''سب کو چھوڑو یہ بتاؤ تم لوگ کا بھائی کالی شرٹ میں کیسا لگ رہا ہے؟'' وقار اترا کر شرٹ کا کالر کھڑا کرتا ہوا بولا۔'' بالکل باسی پاپے جیسا لگ رہا ہے ہمارا بھائی۔'' ارمغان کے شرارت سے کہنے پر سب نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ وقار سب کو مصنوعی خفگی سے گھورنے لگا۔

☆......☆

پیپرز کی ڈیٹ آ گئی تھی۔ سب پڑھائی میں مصروف ہو گئے تھے۔''کل ہی کی بات لگتی ہے جب ہم یونیورسٹی آئے تھے۔ اتنی جلدی وقت بیت گیا پتا بھی نہیں چلا۔'' ارمغان اداسی سے بولا'' ہاں یقین ہی نہیں آتا کہ وقت اتنی جلدی گزرے گا۔ کیسا ہمارا گروپ بنا فرسٹ سمسٹر میں اور اب پیپرز کے بعد ہمیں اپنی پیاری یونیورسٹی کو خیر باد کہنا ہے۔'' وقار بھی آج خلاف توقع سنجیدہ تھا۔'' ہم تیری باتوں کو بہت مس کریں گے وقار۔''

''اور ہم تیری شاعری کو یاد کریں گے۔'' علی کے بولنے پر وقار بولا۔

'' ہم مہ وش کی روز کی خبروں سے محروم ہو جائیں گے'' وقار مہ وش کو دیکھ کر بولا جس پر مہ وش افسردگی سے مسکرا دی۔

''تم کچھ نہیں بولو گی لائبہ۔'' ارمغان لائبہ کو چپ بیٹھا دیکھ کر بولا۔'' کیا بولوں بس تم لوگ بہت یاد آؤ گے۔'' وہ بہ مشکل مسکرا کر آنکھوں میں آئی نمی کو دھکیلتے ہوئے بولی۔

☆......☆

''یار میں نے اس سے بات کی پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وقار مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' وہ اس وقت وقار کے کمرے میں بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا۔

''دیکھ یار میری مان تو' تو ابھی ان باتوں کو ذہن سے نکال دے۔ پیپرز شروع ہونے والے ہیں تو بس ان پر توجہ دے اور دماغ کو ریلیکس رکھ اس کے بعد اس سے آرام سے دوبارہ بات کر کے دیکھ لینا پتا چل جائے گا انشااللہ سب اچھا ہوگا۔'' وہ اس کو مطمئن کرتا ہوا بولا۔ اس کی بات پر ارمغان سر ہلا کر رہ گیا۔

☆......☆

میرے یاروں یہ ساتھ کے پل
اک اک داستاں میں بدل رہا ہے
آ گیا وہ موڑ جس میں الوداع کہنا پڑ رہا ہے
کلاس اور کینٹین والی کہانی ہوگی اب ختم
ڈیپارٹمنٹ کی وہ سیڑھیاں جمتی تھیں جہاں محفلیں
وہ سیڑھیوں کا اسٹیج بھی اب خالی کرنا پڑ رہا ہے
آ گیا وہ موڑ جس میں الوداع کہنا پڑ رہا ہے
یہ پل بھی کیسے ڈھل گئے
ہاتھ میں ڈگری ملی اور ہم سب سیانے ہو گئے
ایک عرصہ پل میں گزرنا کا
اک دور بھی اب تھم رہا ہے
آ گیا وہ موڑ جس میں الوداع کہنا پڑ رہا ہے
میرے دوستوں ٹھیک سے دیکھ لو
کہیں کوئی چھوٹا نہ ہو، کہیں کوئی روٹھا نہ ہو
بھول کر سب رنجشیں گلے مل لو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پھر سے ملنے کا وعدہ کرلو
کیونکہ جا رہا ہے وقت جو
وہ دوبارہ آنے سے رہا
دل تھام، آنکھیں پونچھ کر
الوداع کہنا پڑ رہا ہے
میرے یاروں یہ ساتھ کا پل
اب اک داستان میں بدل رہا ہے
آ گیا وہ موڑ جس میں الوداع کہنا پڑ رہا ہے
الوداع کہنا پڑ رہا ہے

برسوں کا ساتھ آج چھوٹنے والا تھا۔ سب ایک دوسرے سے ملنے ملانے کے وعدے لے رہے تھے پورا گروپ صبح سے ان کا یونیورسٹی اور اساتذہ کے ساتھ اور ایک ایک جگہ جا کر تصویریں لے رہا تھا ۔ وقت رخصت آنکھوں میں نمی لیے اپنے ساتھیوں کو محبت سے دیکھتے ہوئے بیتے وقت کو الوداع کہہ رہے تھے ۔ جن کے ساتھ انہوں نے مل کر یہ حسین وقت گزارا ایک دوسرے کے کاندھے پر سر رکھ کر اپنی پریشانی پر کبھی رو دینا تو کبھی کسی بے تکی بات پر دیر تک ہنستے رہنا۔ لائبہ مسلسل اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رہی تھی ۔ مہ وش بھی اس ہی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی مگر دونوں کا ضبط ٹوٹ گیا اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو دیں۔ بے فکری کے دور کو الوداع کہہ کر نئی زندگی میں اب قدم رکھنے والے تھے اب ان یادوں کو ڈائری کے اوراق اور موبائل میں تصویروں کے ذریعے محفوظ کر لینا تھا بس فرصت کے لمحات میں اس بیتے وقت کو یاد کر کے کبھی دوستوں کی شرارتوں کو سوچ کر ہنسا جائے گا ۔ تو کبھی ان کو یاد کر کے آنکھوں کو پرنم کیا جائے گا۔

☆......☆

وہ جانے سے پہلے اس کے پاس آ گیا تھا۔ عشال سیڑھیوں سے اتر رہی تھی اس کو دیکھ کر ٹھہر سی گئی۔

''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا ،عشال اب تک۔'' ارمغان کی بات پر وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی وہ بھی اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ پرس سے کاغذ نکال کر اس پر کچھ لکھنے لگی۔ وہ نا سمجھی سے اسے لکھتا دیکھنے لگا۔ عشال نے کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ ارمغان پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس پر لکھے لفظوں کو پڑھنے لگا۔ اک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر وہ سر جھکا گیا۔ عشال کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ آنسو ضبط کرتی اس کے پاس سے اٹھ کر چل دی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے......

☆......☆

''پانچ سال بیت گئے۔ اتنی جلدی یقین نہیں آتا۔'' وقار جوس کا سپ لیتے ہوئے بولا۔ وہ لوگ اس ریسٹورنٹ میں جمع تھے۔ علی کی شاعری کی کتاب چھپی تھی ۔ اس خوشی میں اس نے سب دوستوں کو ٹریٹ دی تھی ۔ ''ویسے مجھے یقین نہیں آتا کہ تیری شاعری کی کتاب چھپ گئی۔'' وقار مسخرے پن سے علی کو دیکھتے ہوئے بولا ''چل کھڑا ہو یہاں سے اگر یقین نہیں آتا تو اتنا ڈھیر کھانا تو کھا کس خوشی میں رہا ہے۔'' علی اس کے آگے سے چاولوں کی پلیٹ ہٹاتا ہوا بولا ''ارے پگلے مجھے پتا تھا تو ایک دن میرا نام ضرور روشن کرے گا۔'' سیاست دانوں کی طرح وقار اپنا بیان بدلتا ہوا بولا ''اچھا تم لوگ میری منگنی میں آ رہے ہو نا'' وقار اپنے گروپ کو یاد دہانی کراتا ہوا بولا ۔ ''کتنا کھاتی ہو یار تم مجھے تو لگتا ہے اپنے شوہر اور بیٹے کے حصے کا بھی تم کھا جاتی ہو گی ۔'' وقار مہ وش کو کھاتا دیکھ کر شرارت سے بولا ''تم زیادہ میری فکر میں ہلکان مت ہو منگنی کرو، تم کہیں فکر میں چل بسو۔'' مہ وش منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''ارمغان تم شادی کب کر رہے ہو۔'' مہ وش ارمغان کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی ۔ ''پہلے ارمغان منگنی تو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کرلے۔'' وقار شوخی سے ارمغان کو دیکھتے ہوئے بولا ''تم تو چپ بیٹھا کرو' میں نے سنا تھا ارمغان تمہیں یونیورسٹی میں کوئی لڑکی پسند تھی۔'' مہ وش کے کہنے پر ارمغان غصے سے وقار کو گھورنے لگا۔ اسے اس سے اس غداری کی امید نہ تھی۔

''زیادہ اسے گھورنے کی ضرورت نہیں جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔''

''ہاں تھی ایک لڑکی عشال''

''عشال...... کون ارے وہ مس یونیورس۔'' مہ وش پر جوش ہو کر بولی۔ لائبہ چونک کر ارمغان کو دیکھنے لگی اور چپ چاپ سر جھکا کر اپنے بے بس دل کو تھپکی دینے لگی۔

''ہاں وہی عشال۔'' ارمغان کہہ کر چپ سا ہوگیا۔ ''پھر تم نے اس سے شادی کیوں نہیں کی۔'' علی حیرت سے پوچھنے لگا۔

''عشال قوت گویائی سے محروم تھی۔'' ارمغان کہہ کر چپ سا ہوگیا۔ ''اگر وہ بول نہیں سکتی تھی تو آپ تو بول سکتے ہیں۔ محبت جب ہوتی ہے تو وہ کچھ بھی نہیں دیکھتی۔ محبت تو ہو جانے کا نام ہے۔ وہ محبوب کی خوبیاں، خامیاں نہیں دیکھتی۔ اسے تو محبوب کی خامیاں بھی خوبیاں ہی لگتی ہیں۔ اور جہاں تک یہ کہ وہ بول نہیں سکتی تو محبت کو بھلا کبھی زبان کے سہارے کی ضرورت پڑی ہے' محبت تو خود ایک زبان ہے۔ جو کبھی آنکھوں سے عیاں ہوتی ہے تو کبھی آپ کے رویے سے'' لائبہ کے سنجیدگی سے کہنے پر ارمغان شرمندہ سا سر جھکا گیا۔

''حیرت ہے لائبہ محبت کو اتنا جانتی ہو پھر بھی نہ سمجھ سکی۔'' برابر بیٹھے علی کی سرگوشی پر لائبہ چپ سی ہوگئی۔

☆......☆

میں جانتی تھی ارمغان شاہ تم مجھے کبھی نہیں اپناؤ گے۔ اس میں تمہاری بھی کوئی غلطی نہیں۔ تمہارا حق ہے یہ کہ جب تم کسی سے اظہار محبت کرو تو وہ بھی تم سے اظہار کرے بھلا تم میرے ساتھ کیسے خوش رہتے جو لڑکی بولنے سے محروم ہے وہ تم کو کیا خوشی دیتی۔ پانچ سال بیت گئے اب تو تمہاری شادی بھی ہوگئی ہوگی چلو اچھا ہے تم جہاں رہو خوش رہو۔ عشال کے دل میں ہمیشہ تمہارے لیے محبت رہے گی۔ میں چاہ کر بھی تم کو نہیں بھلا سکتی۔ وہ بیڈ پر لیٹی تکیے میں منہ دے کر رو دی۔

دروازے کی ناک پر وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بیٹھ گئی۔ سامنے ملازم کھڑا تھا۔

''باجی آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔ ملازم کے کہنے پر وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم کی جانب چل دی۔ سامنے صوفے پر اس دشمنِ جاں کو براجمان دیکھ کر وہ وہیں ساکت ہوگئی۔

''عشال آؤ۔'' اس کو آتا دیکھ کر وہ کھڑا ہوگیا۔ وہ وہیں اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میرے پاس الفاظ نہیں ہیں عشال کہ میں کن لفظوں میں تم سے معافی مانگوں۔ میں مانتا ہوں عشال میں نے غلط کیا مجھے خوف تھا کہ لوگ کیا بولیں گے پر پانچ سال تک جب میں خود سے جنگ کرتے کرتے تھکنے لگا میرا دل مجھے کسی طور سمجھا ہی نہیں پارہا تھا کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔ کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو عشال۔'' وہ اس کے جھکے سر کو دیکھ کر بے بسی سے بولا۔ اس کی اس بات پر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے رو دی۔

☆......☆

وہ دونوں اس وقت اسٹیج پر بیٹھے سب سے مبارکباد وصول کر رہے تھے۔ سجی سنوری عشال ارمغان شاہ کے دل میں اتر رہی تھی۔ خوبرو سا دولہا ارمغان بھی بہت اچھا لگ رہا تھا۔

''تو تو بھی بڑا فاسٹ نکلا میری منگنی سے پہلے بیاہ رچالیا۔'' وقار اس کی کمر پر دھموکا لگاتا ہوا اس کے برابر بیٹھتا ہوا بولا۔

''تو نے ہی تو بولا تھا ارمغان پہلے منگنی تو کرلے اس دن ریسٹورنٹ میں وہ تیری بات ہیرو کے دل پر لگ گئی۔''

''ہائے کاش میں پہلے ہی یہ کام کرلیتا۔''

''یہ لائبہ کیوں نہیں آئی وقار۔''

''پتا نہیں بول رہی تھی کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس سے تو میں پوچھوں گا بعد میں اچھے طریقے سے۔ سامنے دیکھ موٹی مہ وش کو کیسے سب سے معلومات لینے میں لگی ہے۔ ماں یہ عورت بڑے ہو کر رشتہ کرانے والی بنے گی۔'' وقار کی بات پر ارمغان اپنی ہنسی ضبط کرنے لگا اور علی کو دیکھ کیسی وحشت زدہ سی شکل بنائے بیٹھا ہے لگ رہا ہے اس کو آمد ہو رہی ہے شاعری کی۔'' وقار سامنے بیٹھے علی کو دیکھ کر بولا جو اپنے کلاس فیلو سے باتیں کرنے میں مگن تھا۔ تو یہاں سے کھڑا ہوجا۔ ورنہ بہت پٹے گا۔'' ارمغان وقار کو گھورتے ہوئے بولا۔

''میں نے کیا کیا ہے اب تیری شادی ہوگئی نہ تو تو نے بھی پارٹی بدل لی۔'' وہ برابر بیٹھی عشال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ''پر میں نہیں چھوڑوں گا تجھے میرے ویر'' یہ کہہ کر وقار شرارت سے اس سے لپٹ گیا جس پر ارمغان کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا۔ ہال میں موجود لوگ بھی پلٹ کر اسٹیج پر بیٹھے دولہا کو دیکھنے لگے۔ برابر بیٹھی عشال بھی وقار کی اس حرکت پر مسکرادی۔ رخشندہ بیٹے کے خوش و خرم چہرے کو دیکھ کر مطمئن سی ہوگئیں

☆......☆

''منگنی کے دن بھی تو پیارا نہیں لگ رہا۔'' علی اسٹیج پر بیٹھے وقار کو دیکھ کر بولا ''تو کیوں جل رہا ہے تیرے سہرے کے پھول جو نہیں کھلے۔'' وقار نے بھی فوراً حساب چکایا۔ ''چپ کرو آج تمہاری منگنی ہے۔'' مہ وش وقار کے بازو پر گھونسہ مارتے ہوئے بولی۔

''اوئے یار موٹی اتنا بھاری ہاتھ ہے۔ ہر وقت اپنے شوہر کو لال نیلا رکھتی ہوگی مار مار کر۔'' وقار کے کہنے پر مہ وش جھینپ سی گئی۔

''کیسی ہو لائبہ؟'' علی ایک جگہ کھڑی مسکراتی لائبہ کو دیکھتے ہوئے بولا جو پنک کلر کی فراک میں بالوں کا جوڑا بنائے ہلکا میک اپ کیے یونیورسٹی والی لائبہ سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ ''ٹھیک ہوں تم کیسے ہو۔''

''میں تمہارے سامنے ہوں دیکھ لو کیسا ہوں۔ دراز قد پہلے کے مقابلے میں بھرا بھرا سا آنکھوں پر نفیس سا چشمہ لگائے چہرے پر دھیمی سی مسکان لیے لائبہ کو دیکھنے لگا۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر وہ انجان سی بن کر مہ وش کی جانب متوجہ ہوگئی۔ علی اس کی بے نیازی پر ہمیشہ کی طرح مسکرادیا۔

''ہیرو آگیا بھئی!'' وقار کی آواز پر سب اسٹیج پر چڑھتے ارمغان اور عشال کی جانب متوجہ ہوگئے۔ بلیک سوٹ میں ارمغان اور گولڈن ساڑھی میں سجی سنوری عشال دونوں ایک دوسرے کے ساتھ بہت جچ رہے تھے۔ ''بات مت کرنا تم مجھ سے بہت غصہ ہے مجھے تم پر'' ارمغان لائبہ کو دیکھتے ہی بولا۔ جواباً لائبہ دھیرے سے مسکرادی۔ ''عشال اس سے ملو یہ ہے میری پیاری مخلص دوست لائبہ جس نے مجھے بتایا کہ ارمغان محبت سے بڑی کوئی زبان نہیں یہ تو وہ جذبہ ہے جو آنکھوں سے عیاں ہوتا ہے۔'' ارمغان لائبہ کو ممنونیت سے دیکھتا ہوا بولا۔ عشال لائبہ کے محبت سے گلے لگ گئی۔ وہ بھی خوش دلی سے لائبہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے ملنے لگی۔

جو لڑکی مجھے یہ بتا سکتی ہے کہ محبت کی اپنی زبان ہوتی ہے تو میں کیا اس کی آنکھوں سے جھلکتی اپنے لیے پسندیدگی سے کیسے غافل ہو سکتا ہوں۔'' وہ لائبہ کو اکیلا دیکھ کر اس کے پاس چلا آیا۔ ''پتا ہے لائبہ یہ جو دل ہوتا ہے نا کسی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ اس پر کسی کی مرضی نہیں چلا کرتی اگر اس پر مرضی چلتی تو میں عشال کے بدلے تمہارا ہاتھ تھامتا۔ کہتے ہیں جو آپ سے محبت کرے اس کا ہاتھ تھام لینا چاہیے۔ علی تمہاری محبت میں کب سے تمہارے اقرار کا منتظر ہے اور دیکھو تو اتنے برسوں سے کیسی محبت کرتا آرہا ہے۔ نہ کوئی شکوہ تم سے نہ شکایت تو کیا اس اچھے انسان کو اس کے صبر کا پھل نہیں ملنا چاہیے۔۔تم بتاؤ کیا ملے گا تمہیں کوئی علی جیسا انسان۔ ارمغان کے پوچھنے پر وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

ارمغان میں نے تم کو چاہا یہ سچ ہے پر جس دن تم کسی اور کے ساتھ نکاح جیسے پاکیزہ بندھن میں جڑے میں نے اپنے دل کی سائیٹ سے تمہارا نام کھرچ دیا۔ میں جانتی ہوں علی کب سے میرا منتظر ہے۔ میں اس اچھے انسان کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی میں پوری ایمانداری سے اس کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی تھی جس کے لیے اب میں تیار ہوں۔ لائبہ آنکھوں میں چمک لیے ارمغان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ لائبہ کی بات پر ارمغان کے لبوں پر بھرپور مسکراہٹ آ گئی اور وہ دونوں اسٹیج کی جانب بڑھ گئے۔ ''ہاں بھئی پورے گروپ کی ایک تصویر ہو جائے۔'' وقار سب کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں کیوں نہیں'' مہوش کہتے ہوئے جلدی سے دلہن کے برابر بیٹھ گئی۔ ارمغان عشال صوفے کی پشت پر کھڑے ہو گئے۔ لائبہ بھی ان کے برابر جا کر کھڑی ہو گئی۔ ''علی آ بھی جاؤ اتنی دیر لگا دی تم نے۔'' لائبہ کی آواز پر علی حیرت سے لائبہ کے چہرے پر پھیلی شوخی کو دیکھنے لگا۔ ''آ جا علی کیا وہیں کھڑے کھڑے بے ہوش ہونا ہے۔'' ارمغان محظوظ ہوتا ہوا بولا ''تصویر سے پہلے ایک گڈ نیوز سنا دوں ہمارے گروپ کے شاعر صاحب اور ہماری پیاری لائبہ بھی جلدی منگنی کرنے والے ہیں۔''

''یا اللہ میری سماعتیں کیا کیا سن رہی ہیں۔'' ارمغان کی بات پر وقار کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا اوور ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا ''آپ کو کس خوشی میں صدمہ ہو رہا ہے برابر بیٹھی منگنی کی دلہن وقار کو گھور کر بولی'' نا میری ہونے والی بیگم، میری پاکدامنی پر شک نہ کرو۔'' وقار کے بولنے پر سب ہنس دیے۔

''کیا یہ سچ ہے جو میں سن رہا ہوں؟'' علی لائبہ کو دیکھتے ہوئے بولا ''ہاں سچ ہے۔'' لائبہ کے شرما کر سر جھکا کر کہنے پر علی اس کے انداز پر جھوم اٹھا۔

''سنو عشال ہمیشہ ایسی رہنا جیسی اب ہو محبت کرنے والی۔ مجھے تمہاری آنکھوں سے عیاں ہوتی محبت سے محبت ہے کیونکہ محبت سے بڑی کوئی زبان نہیں ہوتی۔'' ارمغان کی سرگوشی پر عشال محبت سے مسکرا دی۔

☆......☆

لفظ تم چنو
گیت ہم بنائیں گے
غزل تم چنو
راستہ ہم بتائیں گے
خوش تم رہو
خوشیاں ہم دلائیں گے
بس تم صرف محبت بنی رہنا
محبت ہم نبھائیں گے

☆☆☆

دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

ستمبر 2017 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

''چوزن ون'' عمران مظہر

آپ کی نظر میں اس ماہ ''دوشیزہ'' کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

دوشیزہ اکتوبر 2017

عنوان: ____________

قلم کار: ____________

نام: ____________

پتا: ____________

ماہنامہ دوشیزہ کراچی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

منی ناول

تحسین انجم انصاری

میرے چارہ گر کو نوید ہو

زندگی سے جڑے ایک حسین ناول کا آخری حصہ

''نہیں بالکل نہیں......'' وہ سنجیدہ ہوگئی۔
''سچی سچی بتائیں ...... آپ کو واقعی انتظار نہیں؟'' سارا حیران تھی۔
''نہیں اس لیے کہ صبح بابا جانی کو ان کا فون آچکا ہے اور وہ رات کو یہاں پہنچ رہے ہیں...... اور تمہیں گیسٹ روم سیٹ کرنا ہے اُن کے لیے۔''
''اوہ کتنی چالاک ہیں آپ؟'' سارا حیرت آمیز مسکراہٹ سے بولی۔ میں تو کمرہ سیٹ نہیں کروں گی اُن کے لیے، آپ یہ خدمت اپنے نازک ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ سر انجام دیں گی...... اور اصل میں آپ یہی چاہ رہی ہیں...... ہیں نا؟'' جواب سن کر زارا خاموش ہوگئی۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔
''چلو کمرہ میں سیٹ کر دیتی ہوں اور کھانے کی ذمے داری تم سنبھال لو......''
''کیوں...... میں تو کچھ نہیں کروں گی...... آپ کے ''وہ'' آرہے ہیں۔ آپ ہی ساری ذمے داریاں سنبھالیں...... مجھے بھلا کیا فائدہ ہوگا کام کرنے سے۔''
''بس فائدے کی سوچا کرو......'' زارا کو غصہ آ گیا...... یہ نہیں سوچتی میں اکیلی یہ سب کچھ کیسے کروں گی اور......''
''ارے میں مذاق کر رہی تھی...... ویسے بھی میں نہیں چاہتی کہ آپ کچن میں جا کر اپنا خوبصورت رنگ خراب کرتی پھریں...... آپ کو تو تمام کیل کانٹوں سے لیس ہو کر ڈرائنگ روم میں جانا چاہیے تا کہ آپ کو دیکھتے ہی وہ بے ہوش ہو جائیں......''
''خدا نہ کرے کیسی باتیں کرتی ہو سارا...... اور کیل کانٹے سے لیس وہ بھی بابا جانی کے سامنے...... پاگل ہوئی ہو کیا؟''
''افوہ آپ رہیں وہی بدھو کی بدھو۔ میں آپ کو طریقے بتاؤں گی...... کیل کانٹوں سے کس طرح لیس ہوا جاتا ہے کہ پتہ بھی نہ چلے......''
''تم تو جیسے بہت ماہر ہو۔''
''وہ تو میں ہوں...... زمانے کے ساتھ چلنا جانتی ہوں آپ کی طرح سادگی پسند نہیں ہوں......''
''اچھا چھوڑو یہ باتیں...... یہ بتاؤ مینو کیا بنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گا آج......'

''عالی بھائی کی پسند کا تو پتہ ہوگا آپ کو......''

''تم کچن میں چلو میں آ کر بتاتی ہوں...... ویسے تو ای جان کا کیا خیال ہے......''

''آپ جانتی ہیں کھانے پینے کا معاملہ اب انہوں نے آپ پر چھوڑا ہوا ہے......اس لیے ہم دونوں مل کر ڈیسائیڈ کر لیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میں فی الحال گیسٹ روم کی صفائی کے لیے جا رہی ہوں۔''

''لیکن جلدی آ یئے گا......مینو کے مطابق چیزیں نکالنی ہیں......ورنہ دیر ہو جائے گی۔''

زرا نے اسے جلدی جلدی چند ڈشز کے بارے میں بتایا اور پھر گیسٹ روم کی طرف چل دی۔

☆......☆......☆

آج کل چونکہ گرمیوں کا سیزن نہیں تھا اس لیے مری میں سڑکوں پر اور خصوصاً مال روڈ پر زیادہ رش نہیں تھا وہ مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے مال پر آئے...... دائیں جانب خشک میوے کی انڈر گراؤنڈ بڑی مارکیٹ تھی۔ اب تو وہاں کپڑے اور دوسری اشیاء کی دکانیں بھی کھل گئی تھیں...... وہاں سے آگے گزر کر وہ آہستہ آہستہ مختلف سڑکوں اور دکانوں کی طرف دیکھتے ہوئے گاڑی گزار رہے تھے اجالا مسلسل بول رہی تھی۔ وہ شروع سے ہی باتونی تھی ایک سال کی عمر میں چھوٹے چھوٹے ٹوٹے پھوٹے جملے بول لیتی تھی۔ ڈیڈی بتایا کرتے ان کے ایک دوست کا بیٹا بھی چھوٹی سی عمر سے ہی بولنا شروع ہو گیا تھا اس کی پہلی سالگرہ تھی جب وہ خوش خوش سب کو بتاتا پھر رہا تھا ''میری سالگرہ ہے کیک لینے جا رہا ہوں۔''

اب تو اجالا کی زبان کافی صاف ہو گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے جملے روانی سے بول لیتی تھی۔ جینا نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پنک کیوٹ سی پینٹ اور اس پر پنک پھولا پھولا خوبصورت سا سوئیٹر پہنے ہوئی تھی پہلے جینا کا ارادہ تھا کہ اس کے بالوں کی دو پونیاں بنا دے پھر اسی طرح کھلا چھوڑ دیا اس کے بال بہت خوبصورت تھے۔ براؤن کلر کے کرلز گردن تک آتے تھے اور اس کی براؤن آنکھوں سے میچ کرتے تھے۔ بولتے بولتے اچانک اس کی نظر غبارے والے پر پڑی۔ اس نے وہیں پہ پرجوش انداز میں چیخنا شروع کر دیا

''ماما بلون......وہ دیکھیں کتنے سارے بلون...... ماما مجھے بلون لینا ہے۔'' وہ بیلون کو بلون کہتی تھی۔

''دلاور خان گاڑی سائیڈ پر روک دو اور اجالا کو پانچ چھ بیلون لا دو......''

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی اور جینا باہر نکل ادھر ادھر دکانوں کا جائزہ لینے لگی۔

سڑک کے دوسری جانب پھولوں اور کتابوں کی دکانیں تھیں۔ اس نے سرسری انداز میں ان کا جائزہ لینا شروع کیا۔

یکا یک اسے ایسا لگا اس کی ٹانگوں میں جان نہیں رہی۔ ابھی وہ بھری بھری مٹی کی مانند زمین پر آ رہے گی...... لیکن وہ پتھر کی بن گئی تھی جیسے زمین میں ایستادہ مجسمہ ہو۔

''ماما دیکھیں...... کتنے پیارے ہیں...... ماما اچھے ہیں نا......'' اجالا بول رہی تھی لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی نظریں تو سڑک کے پاس کتابوں کی دکان پر جم کر رہ گئی تھیں...... وہاں وہ تھا...... ہاں، ہاں وہ شخص تھا...... وہی جو اس کا چارہ گر تھا جس کی وجہ سے پچھلے تین سال اس نے سولی پر کاٹے تھے۔ جسے اسے اپنے ہار جانے کی نوید دینی تھی وہ شخص جس سے بنا سوچے سمجھے اس نے تن من سے، دل کی گہرائیوں سے محبت کی تھی وہ جس پہ اس نے پوری دنیا سے زیادہ محبت اور اعتبار کیا تھا۔ وہ اس کا چارہ گر تھا...... لیکن اس نے صرف اسے ایک رات کی محبت دی تھی۔ یہ کیسی چارہ گری تھی۔

وہ شخص جس کی وجہ سے آج وہ گھر سے بے گھر ہو گئی تھی اپنے گھر سے دیس نکالا لے لیا تھا۔

وہ شخص جس کی وجہ سے اس کا ہر دن دکھی اور ہر رات اشکبار رہی تھی۔

وہ جس نے اس کے دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

اس کی نظریں وہاں جم کر رہ گئیں...... چہرے پہ اذیت اور آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں لیے وہ ٹرانس کی حالت میں کھڑی تھی...... براؤن کرلی بالوں کے ساتھ وہ آج بھی ویسا ہی لگ رہا تھا۔ چہرہ قدرے کمزور اور جسم تھوڑا دبلا ہو گیا تھا...... لیکن بلاشبہ وہ وہی تھا...... جینا کی آنکھیں بھیگنا شروع ہو گئیں لیکن اس کا جسم بے جان تھا قدموں میں سکت نہیں تھی کہ سڑک کا درمیانی فاصلہ طے کر کے اس تک جا سکے۔ اس کا گریبان تھام سکے۔

اس نے کتابیں پیک کروائیں اور باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی...... جینا کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔

''دلاور خان...... جلدی کرو...... اس سیاہ کرولا کا پیچھا کرو......'' اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ہذیانی انداز میں کہا...... آنسو آنکھوں سے نکل کر گالوں کو بھگونے لگے۔ رانی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی لیکن اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

''ماما کا ہوا؟'' اجالا نے ماں کی حالت میں زبردست تبدیلی محسوس کی۔ یوں بھی وہ رو رہی تھی۔ اجالا ہمیشہ اس کے رونے پر اپ سیٹ ہوتی تھی۔

''ماما......'' اجالا نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا اس پر درد و غم اور ہجر کی کٹھنائیوں کی داستان رقم تھی۔

''کا ہوا ماما......؟ کا بات ہے؟؟''

''کچھ نہیں میری جان۔'' اس نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''نئیں رونا ماما...... اچھے بچے نئیں روتے۔''

وہ بے اختیار ایک لمحہ کو مسکرا دی لیکن اس وقت مسکرانا یا کوئی بھی بات کرنا اس کی ہمت اور طاقت کے لیے بہت زیادہ تھا...... اس کے دماغ میں پچھلے تین سالوں کا کرب اور تکلیفیں، ذہنی اذیتیں اور دل کے ناقابل برداشت درد کی تصویریں ایک ایک کر کے گزر رہی تھیں اور اشکوں سے لبریز آنکھیں سامنے والی گاڑی پر جمی تھیں...... گاڑی بل کھاتی سڑک پر ہلکی رفتار سے رواں دواں تھی۔

''بی بی...... اگر میں ٹھیک طرح سے دیکھ سکا ہوں اور ان تین سالوں میں امارا حافظہ خراب نہیں ہوا تو یہ وہی شخص ہے جو تین سال پہلے دوبارا اپنے اسلام آباد والے گھر آیا تھا اور مجھ سے آپ کا پتہ پوچھا تھا......''

''یہ کیا کہہ رہے ہو دلاور خان...... یہ کب کی بات ہے اور تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا......؟'' وہ آنسوؤں کے دوران حیرت سے بولی۔

''ایک بار وہ تب آیا تھا جب امریکہ سے بڑے صاحب کے دوست کی فیملی آئی ہوئی تھی وہاں...... اس وقت آپ مارکیٹ گئی تھیں...... میں نے کہا بی بی تو گھر پر نہیں تم اپنا نام بتاؤ...... میں بی بی کو بتا دوں گا لیکن اس نے نام نہیں بتایا اور کہنے لگا وہ پھر آئے گا......''

''اور دوسری بار......؟''

''تین دن بعد بڑے صاحب نے بتایا کہ آپ پڑھنے کے لیے باہر جا رہی ہیں...... وہ ایک ہفتے کے بعد آیا۔ تو آپ جا چکی تھیں...... وہ چپ سا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہوگیا جیسے دل کو تکلیف پہنچی ہو۔ میں نے تب بھی نام پوچھا تو کہنے لگا نام جان کر کیا کرو گے خان...... میں نے بتایا کہ بی بی تو دو سال بعد آئیں گی...... وہ کافی دیر کھڑا رہا اور پھر چلا گیا......''

''اور تم نے مجھ سے ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا......'' جینا غصے اور تلخی سے بولی۔

''آپ گھر میں نہیں تھیں بی بی آپ کو کیسے بتاتا...... بڑے صاحب یا بیگم صاحبہ کو بتانا مجھے اچھا نہیں لگا......''

''کوئی پندرہ منٹ کے بعد گاڑی ایک پکی سڑک پر اتر کر نشیبی علاقے کی طرف جانے لگی تو دلاور خان تھوڑی دیر رک گیا...... گاڑی کو مناسب فاصلہ دے کر وہ بھی نیچے اتر گیا...... بڑا سا میدان تھا جس میں لہلہاتے کھیتوں کے درمیان ایک خوبصورت مینشن بنی تھی...... گاڑی اس کے سامنے رک گئی...... وہ شخص اترا...... کتابیں اٹھائیں اور مین دروازے سے اندر چلا گیا...... دلاور خان نے ایک پہاڑی تودے کی اوٹ میں گاڑی کھڑی کردی...... مینشن تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ جینا نیچے اتری...... اپنے بال برش کیے۔ ہاتھوں سے آنسو صاف کیے اور اپنا پرس اٹھالیا۔

''تم لوگ ادھر ہی رکو...... اجالا کا خیال رکھنا...... میں اندر جارہی ہوں۔ دلاور خان تمہارے پاس اپنا موبائیل ہے نا...... میں جب کال کروں تو گاڑی ادھر ہی لے آنا......''

''لیکن چھوٹی بی بی...... کوئی خطرہ تو نہیں...... میرے پاس میری گن ہے۔ آپ بس ایک کال کریں۔ ام فوراً پہنچ جائے گا......''

''گن......'' جینا گھبرا گئی۔ ''کہاں ہے تمہاری گن۔ اجالا کی پہنچ سے دور رکھنا۔''

''ام جانتا ہے بی بی۔ ہم اتنے بے وقوف نہیں ہے۔''

اجالا ساتھ جانے کی ضد کرنے لگی لیکن رانی نے اسے غباروں سے بہلا لیا اور کھلونے بھی تھے اور اجالا باتوں کی شوقین تھی...... اس کی توجہ بٹانا مشکل نہیں تھا۔

جینا جب مینشن کی جانب رواں دواں تھی تو اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ قدم من بھر کے ہو رہے تھے اور آنکھیں بار بار آنسوؤں سے بھری جارہی تھیں جسے وہ ہاتھ اوپر اٹھا کر بار بار آستینوں سے صاف کررہی تھی۔

آج اسے کسی سے تین سال کی تکلیفوں کا حساب لینا تھا۔

☆......☆......☆

شاہ زیب نے کتابیں اپنے کمرے میں میز پر رکھیں اور جیسے بے دم ہوکر بیڈ پر گر گیا...... آج اس کا درد حد سے سوا ہو رہا تھا...... پندرہ دن پہلے ہی وہ دو سال کی ٹریننگ مکمل کرکے واپس آیا تھا۔ سخت ڈیوٹی اور اسٹڈی کے بعد اس کا کام یہی ہوتا کہ وہ ہر ملک کی مشہور یونیورسٹی کی ویب سائٹ پر جائے۔ اس کا نمبر معلوم کرے اور وہاں کال کرکے معلوم کرے کہ کیا جینا جواد خاقانی نام کی کوئی اسٹوڈنٹ نے فلاں فلاں دنوں میں وہاں ایڈمشن لیا ہے یا نہیں...... کسی یونیورسٹی کی پالیسی اتنی سخت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنی لسٹ چیک کرتے...... جو کہ کافی لمبی ہوتی۔ ان یونیورسٹیوں میں پوری دنیا سے آئے ہوئے ہزاروں اسٹوڈنٹس ہوتے تھے۔ ایک لڑکی کے بارے میں معلوم کرنا آسان نہیں تھا کچھ لوگ فوراً انکار کردیتے کہ یہ ان کی پالیسی کے خلاف ہے اسے کیسے کیسے بہانے بنانے پڑتے...... لیکن کبھی تو کامیابی ہوجاتی اور کہیں کوئی بہانہ بھی کام نہ آتا اتنے زیادہ ملک اور لاتعداد یونیورسٹیاں...... کام آسان

نہیں تھا لیکن اسے ہمت نہیں ہارنی تھی...... اسے جینا کو تلاش کرنا ہی تھا...... پہلے چھ ماہ اس نے جو غلطی کی تھی اپنی شرمندگی کی وجہ سے رابطہ نہیں کیا تھا آج تک اس کا خمیازہ بھگت رہا تھا۔ پہلی بار جب وہ جینا کے گھر گیا تھا اور چوکیدار سے اس کے بارے میں معلوم کیا تھا کیا ہی اچھا ہوتا وہ گاڑی میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا...... چاہے کتنی دیر ہوجاتی لیکن اسے کیا معلوم تھا کہ پورے دو سال کے لیے اتنی جلدی وہ ملک سے باہر چلی جائے گی۔ کوئی نشان پیچھے نہیں چھوڑے گی...... لیکن وہ اس کے لیے نشان کیسے چھوڑتی۔ اس نے تو جینا سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ وہ یقیناً اسے دھوکے باز اور بے وفا سمجھ کر مایوس ہوکر باہر چلی گئی ہوگی۔ اور پھر جاتے ہوئے وہ جلدی میں اپنے بریف کیس میں پڑے نکاح نامے کی دونوں کاپیاں ساتھ ہی لے گیا۔ اتنی شرمندگی اور اتنی عجلت میں گیا تھا کہ ایک کاپی اسے دینا تو ممکن نہیں تھا کسی میز پر رکھ سکتا تھا...... لیکن اس وقت وہ ایسی ذہنی کیفیت میں تھا کہ دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ تھا۔ اور اس کاپی کے نہ ہونے سے اس نے کتنی تکلیف اٹھائی ہوگی۔ اس کے ڈیڈی یقیناً اس کی شادی کرنا چاہتے ہوں گے اور وہ عجیب سچویشن میں تھی...... ہاں کہہ نہیں سکتی تھی اور ناں کہنے کی وجہ بھی نہیں بتاسکتی تھی...... وجہ بتاتی تو ثبوت پیش نہیں کرسکتی تھی۔

پورے دو سال وہ اسی ذہنی اذیت میں رہا...... بے شمار یونیورسٹیز سے رابطے کیے لیکن وہ کہیں ہوتی تو ملتی...... مایوس واپس لوٹ آیا تو گھر والوں نے پھر شادی کا تقاضا شروع کردیا۔ اس کی غیر موجودگی میں کلینک بھی بن چکا تھا...... مصروف رہنے کے لیے آتے ہی اسٹارٹ کرلیا۔ کبھی اسلام آباد میں اور کبھی ہاسپٹل میں ڈیوٹی دیتا اور پھر شام کو واپس آکر کلینک میں بیٹھ جاتا...... گھر والوں اور بابا کا شادی کے لیے دباؤ زیادہ ہوگیا تو مجبوراً بابا کو ساری حقیقت بتانی پڑی...... وہ شاک میں آگئے...... انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ان کا لاڈلہ بیٹا ان سے پوچھے بغیر، انہیں شامل کیے بغیر یوں اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا ہے...... وہ چپ ہی ہوگئے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ناراض ہوگئے تھے اور انہیں صدمہ پہنچا تھا۔ شاہ زیب پریشان ہوگیا۔ دو سال کے عرصے میں اس نے کتنی بار سوچا تھا کہ کیوں نہ براہ راست جواد خاقانی سے ہی جینا کے بارے میں پوچھ لے لیکن یہ اندیشہ کہ پتہ نہیں جینا نے ان سے اس نکاح کا تذکرہ کیا ہے یا نہیں اسے روک دیتا تھا۔ اگر انہیں معلوم نہ ہوا اور شاہ زیب کی زبانی معلوم ہوا تو وہ جینا کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ اس کا بھرم ٹوٹ جائے گا...... اس نے پریشانی سے بالوں میں انگلیاں پھیریں...... سر درد سے پھٹا جارہا تھا۔

باہر دوپہر کا کھانا لگ چکا تھا...... سب اپنی اپنی کرسیاں سنبھال چکے تھے لیکن بابا نے اب تک کھانا شروع نہیں کیا تھا۔

''کامران جاؤ چاچو کو بلا کر لاؤ...... ان سے کہو کھانا لگ چکا ہے۔'' کامران فوراً اٹھا۔ تابندہ نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ جانے کس بات پر ناراض ہیں لاڈلے بیٹے سے پھر بھی اس کے بغیر کھانا نہیں کھاتے۔ یہ بھی تو محبت کا انداز تھا...... شاہ زیب بابا کے بلاوے پر فوراً اٹھ گیا۔ سر میں درد تو تھا لیکن اس ناراضگی کے دنوں میں ان کا حکم ٹالا نہیں جاسکتا تھا جبکہ قصور بھی اتنا بڑا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر آیا اور اپنی سیٹ سنبھال لی...... کھانا شروع ہوا تو بچوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ابھی سب نے چند لقمے ہی لیے تھے کہ بیرونی دروازہ آہستہ سے کھلا...... جینا آہستہ سبک قدموں سے اندر داخل ہوئی...... دل کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

دھڑکن اتنی تیز تھی کہ اسے صاف سنائی دے رہی تھی...... قدموں کی آواز پر سب کی نظریں ادھر اٹھ گئیں۔

شاہ زیب نے سب کی غیر معمولی توجہ محسوس کر کے جھکا سر اٹھا کر ادھر دیکھا تو نوالہ واپس پلیٹ میں گر گیا۔ وہ کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر ایک دم کھڑا ہو گیا...... تھوڑا قریب آ کر جینا رک گئی......

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا...... اور پھر جیسے زمین و آسمان کی گردش رک گئی۔ کمرے میں ان کے سوا کوئی نہ رہا...... جینا کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو سیلاب کی صورت گالوں پر گرتے جارہے تھے اور شاہ زیب کے چہرے پر ان کہی اذیت تھی۔

دونوں ہی وقت اور لمحوں کے طلسم میں جکڑے تھے...... کوئی مقناطیسی کشش تھی جو نظروں کے جمود کو قائم رکھے ہوئے تھی...... اور سب نفوس جو اس وقت کھانے کی ٹیبل پر موجود تھے حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی سکتے کے عالم میں تھے، کھانا بھول چکے تھے۔

''لڑکی...... کیا بات ہے...... رو کیوں رہی ہو...... اور کہاں سے آئی ہو؟''

اس نے چونک کر بابا کی طرف دیکھا طلسم ٹوٹ چکا تھا...... پھر ایک دم دوبارہ شاہ زیب کی طرف دیکھا...... شاہ زیب کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جذبات ابلنے کو بیتاب تھے۔

اور وہ جو حساب لینے آئی تھی سوچنے لگی۔

کیا وہ اس وقت اس شخص کو جو اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے ان سب کے سامنے شرمندہ کر سکتی ہے۔

پتہ نہیں اس نے بابا کو ہمارے نکاح کے بارے میں بتایا ہے یا نہیں۔

اور اگر میں نے کچھ کہہ دیا، راز کھول دیا تو کیا اس کے چہرے پہ خفت اور پشیمانی کے تاثرات دیکھ سکوں گی، نہیں میں اسے سب کے سامنے شرمندہ نہیں کر سکتی۔

''لڑکی میں نے کچھ پوچھا ہے......؟'' بابا پھر بولے کیونکہ وہ تو سب سمجھ گئے تھے انہیں تو شاہ زیب نے داستان سنا دی تھی۔ وہ دونوں کی کیفیات سے باخبر تھے۔

''اوہ...... آئی ایم سوری......'' اس نے اپنی ہتھیلیوں سے جلدی جلدی اپنے آنسو صاف کیے۔ میں دراصل ادھر سیر کر رہی تھی تو اتنی خوبصورت مینشن دیکھ کر رک گئی۔ معافی چاہتی ہوں۔ لنچ کے دوران مداخلت کرنے کی...... میں چلتی ہوں۔''

وہ تیزی سے مڑی...... سامنے برآمدہ تھا برآمدے کے بعد کاریڈور تھا جو بیرونی دروازے تک جاتا تھا۔ وہ ابھی برآمدے کے سرے تک پہنچی تھی کہ اسے آواز آئی۔

''جینا رک جاؤ...... پلیز رک جاؤ......'' اس کے قدم وہیں جم کر رہ گئے۔

لیکن اسے پلٹ کر دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی کیونکہ یہ کم بخت آنسو ہر شے دھندلائے دے رہے تھے۔ اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی تھی...... یہ وہی چاپ تھی جسے سننے کو اس کے کان ترس گئے تھے۔ لیکن اس سے پہلے بیرونی دروازہ کھلا اور رانی اجالا کو گود میں لیے اندر آئی۔

''سوری بی بی جی...... لیکن اجالا بے بی رک نہیں رہی تھیں۔ آپ کے پاس آنے کی ضد کر رہی تھیں پھر رونا شروع ہو گئیں تو مجھے لانا پڑا......'' اسے دیکھتے ہی اجالا رانی کی گود سے اتر کر اس کی طرف بھاگی...... اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی...... میز کے گرد ساکت بیٹھے نفوس پتھر کے بن گئے۔

''ماما مجھے آپ کے پاس آنا تھا......'' پھر اس کا چہرہ دیکھا جو آنسوؤں سے تر تھا۔ پریشان ہو گئی۔

''ماما کا ہوا...... ؟ آپ پھر گندی بچی بن گئی ہیں......''

''نہیں میری جان...... وہ اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی...... میں ٹھیک ہوں۔''

''آپ سے کہا تھا رانی کے پاس رہنا......''

''نہیں ماما مجھے آپ کے پاس آنا تھا...... پھر اس نے پیچھے کھڑے شاہ زیب کی طرف دیکھا۔ شاہ زیب کی آنکھوں کا تحیر قابل دید تھا دل کی عجیب کیفیت تھی۔

''آپ نے میری ماما کو مارا ہے......؟'' شاہ زیب کے لیے یہ لمحہ کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ اس کا دل چاہا آگے بڑھے اور اس انمول خزانے کو سینے سے لگا لے...... لیکن وہ ہمت نہ کر سکا...... ایک ٹک اسے دیکھے گیا آفتاب صاحب کا دل قابو میں نہ تھا میز پہ ہلکی ہلکی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

''یہ بچی تو ہو بہو شاہ زیب کی تصویر ہے......'' سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹی تھیں...... بابا نے سچویشن کو سنبھالا۔

وہ ایک دم ہوش کی دنیا میں واپس آئے اور جسم انوکھے ولولے اور توانائی سے بھر گیا۔

''...... شاہ زیب جینا کو اپنے کمرے میں لے جاؤ...... اور وہاں بات چیت کرو۔''

شاہ زیب نے ملتجی نظروں سے جینا کی طرف دیکھا۔ حساب تو اسے بھی لینا تھا۔

''اجالا آپ رانی کے ساتھ واپس جائیں...... میں ابھی آتی ہوں۔''

''نائیں ماما...... میں رانی کے ساتھ نہیں جاؤں گی...... آپ میری ماما کو کہاں لے جا رہے ہیں......'' اس نے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کتنا جاں افزا لمس تھا۔

''اجالا بیٹے...... ماما کی بات مانو۔ اچھی بچی ہونا؟'' جینا بولی۔

''لڑکی...... اجالا کو ہمارے پاس چھوڑ دو۔''

بابا نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو جینا نے بے اختیار حیرت سے ان کی طرف دیکھا...... اجالا خود ہی بھاگتی ہوئی ادھر چلی گئی...... وہ رانی کے ساتھ جانے پر راضی نہ تھی۔

بابا نے کسی متاع عزیز کی طرح اسے گود میں بٹھا لیا...... اجالا نے گردن موڑ کر پیچھے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''آپ کون ہیں......؟''

''ہم تمہارے دادا ہیں پرنسس......'' بابا کی آنکھوں میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔

''دادا......؟'' وہ حیران ہوئی۔ بڑی بڑی براؤن آنکھیں بے حد چمکدار تھیں۔

''دادا؟'' سب بچے بیک وقت پر جوش انداز میں بولے۔

''تم سب نے کھانا کھا لیا ہے تو اپنے کمرے میں جاؤ۔ ہمیں تمہارے والدین سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''دس از ناٹ فیئر دادا جان۔''

''فوراً......'' انہوں نے آنکھیں دکھائیں تو سب بلا چوں و چرا اٹھے اور اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ دادا جان نے مختصر الفاظ میں سب کو شاہ زیب اور جینا کی کہانی کے بارے میں بتا دیا...... وہ انتہائی ناراض تھے لیکن اجالا کی آمد نے جیسے شاہ زیب کے لیے سات خون معاف کر دیے تھے۔

''تو آپ کی حسرت آخر کار پوری ہو گئی۔''

یہ شاہ نواز تھے۔

''وہ بھی اتنے خوبصورت انداز میں...... شاہ ایاز بھی پیچھے نہ رہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

"واقعی بہت ہی پیاری بچی ہے اور ہو بہو شاہو کی کاپی ہے جینا سے تو بالکل نہیں ملتی......" یہ تابندہ تھی۔ اجالا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"میری ماما کو کچھ نہ کہیں......" اجالا بڑے پیارے انداز میں بولی تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

☆......☆......☆

شاہ زیب نے جینا کے ساتھ اندر پہنچ کر دروازہ لاک کیا۔ اور مڑ کے اسے بے قرار نظروں سے دیکھا اور پھر بے چینی سے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے لیکن جینا نے سختی سے اس کے ہاتھ ہٹا دیے۔

"میں یہ سب کرنے نہیں...... اپنی تکلیفوں کا حساب لینے آئی ہوں شاہ زیب صاحب...... اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں...... آخر آپ کا نام معلوم ہو ہی گیا...... آپ نے کیا کیا میرے ساتھ کیوں کیا؟ کیا میں صرف وقت گزاری کا ایک ذریعہ تھی آپ کے لیے؟ چند لمحوں کو رنگین بنانے والا کھلونا...... آپ کو میں نے اپنے دل کے تخت پر شہزادہ بنا کر بٹھایا...... سب کچھ آپ پر نچھاور کر دیا لیکن آپ بھی وہی عام مرد نکلے...... لڑکی کو پھنسایا...... سنہری خواب دکھائے اور پھر اپنا مطلب پورا کر کے پھر سے اڑ گئے۔

"اتنی توہین نہ کرو میری ...... میری محبت کی......" شاہ زیب کی آنکھوں سے اذیت چھلک رہی تھی۔ چہرہ درد کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"پھر کیا کروں...... آپ کو شاباش دوں...... آپ کو یہ سب کرنے کا تمغہ پیش کروں۔ آپ نے اتنے لمبے عرصے میں ایک بار بھی یہ نہیں سوچا کہ اس حرماں نصیب لڑکی کا کیا حال ہوگا...... آپ کو ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ ایک بار کال کر کے اس کا حال تو پوچھ لیں جسے آپ بے یارو مددگار دنیا بھر کے طعنے سننے کے لیے چھوڑ آئے ہیں۔ اس نے اپنے گھر والوں ملنے جلنے والوں کا سامنا کیسے کیا ہوگا...... یہی ہے نا آپ کی مردانگی اسی پہ ناز کرتے ہیں آپ......

"اتنے تیر نہ چلاؤ جینا کہ میں سہہ نہ سکوں۔ میرا کلیجہ چھلنی ہو جائے گا۔"

وہ صبر وضبط کی تصویر بنا اس کے سامنے کھڑا تھا قصوروار جو تھا اس کا۔

"آپ سہہ نہ سکیں......؟ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ سہنا کسے کہتے ہیں وہ آپ مجھ سے پوچھیں میں نے آپ کی وجہ سے اپنی دوستوں کو چھوڑا اپنی پڑھائی چھوڑی۔ اپنا گھر چھوڑا۔ سزا کے طور پر آج تک وہاں نہیں گئی کہ لوگوں کے سامنے اجالا کا کیا جواز پیش کروں گی کہ آپ تو نکاح نامہ تک ساتھ لے گئے تھے تا کہ آپ کی دھوکہ دہی کا کوئی ثبوت میرے پاس نہ رہے اور میں دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں۔

"جینا پلیز...... کچھ بھی کہہ لو مجھے دھوکے باز اور بے وفا نہ کہو...... میں ان الزامات کا متحمل نہیں ہوسکوں گا......" شاہ زیب درد سے بولا لیکن جینا پہ کہاں اثر ہونا تھا اس وقت۔

"الزامات......؟ آپ انہیں الزامات سمجھتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں جن کی تاب نہ لاتے ہوئے شاہ زیب نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا......

"چہرہ چھپانے سے حقائق نہیں بدل جاتے...... آپ خود کو بے وفا نہیں سمجھتے تو بتائیں آپ نے وعدے کے مطابق جاتے ہی فون کیوں نہیں کیا؟"

ایک نہیں دو نہیں...... تین نہیں...... پورے چھ ماہ فون نہیں کیا...... کیا آپ کے دل میں ایک بار بھی خیال نہیں آیا کہ میرے دل پر کیا گزر رہی ہوگی...... میری

تڑپ کا اندازہ نہیں تھا آپ کو...... میں جو اپنا سب کچھ ہار گئی تھی۔ سب کچھ وار دیا میں نے آپ پہ۔ آنکھیں بند کر کے اعتبار کیا اور آپ نے کس بے دردی سے میرے اعتبار اور بھروسے کا خون کر دیا۔ کس بات کی سزا دی مجھے۔ اس تھپڑ کی جو میں نے انجانے میں آپ کو مار دیا...... آپ کی مردانگی کو اس سے چوٹ پہنچی آپ کی انا اسے نہ بھلا سکی۔ مرد ہیں نا...... عورت کی غلطی سے چشم پوشی تو اس معاشرے کی عادت ہی نہیں ہے نا...... سزا دو...... عورت کو عورت ہونے کی سزا دو، اسے تباہ و برباد کردو۔ اس کی انا کو کچل دو......"

"جینا...... بس کرو...... خدا کے لیے بس کرد و۔" شاہ زیب جو بڑی مشکل سے کھڑا تھا، کرسی کا سہارا لے کر بولا اس کی آنکھیں شدت ضبط سے خون آلود ہو رہی تھیں...... وہ تو جیسے نزع کی کیفیت میں تھا۔ جینا کی باتیں اس کے دل پہ ناقابل برداشت چرکے لگا رہی تھیں اور اس کی انا ان بے رحم چرکوں کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

"کیوں بس کرو......؟" میں جب تک آپ کے ایک ایک دکھ اور ایک ایک زیادتی کو بیان نہیں کرلوں گی مجھے چین نہیں آئے گا مجھے ایک ایک بات کا حساب لینا ہے۔ مجھے ان ساری بے خواب راتوں کا حساب لینا ہے جو آپ کی کال نہ آنے پر ٹہلتے ہوئے گزار دیں...... اپنی غلطی، اپنا قصور سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہو گیا۔ میں نے کتنی اذیت محسوس کی ہوگی آپ کو احساس ہے......؟" ایک نہیں، دو نہیں، چار نہیں پورے چھ مہینے آپ کو کال کی فرصت نہیں ملی؟" میں نے اس لمحے کا حساب لینا ہے جب مجھے پہلی بار شک ہوا کہ میں شاید پریگننٹ ہوں آپ اندازہ کر سکتے ہیں میں کتنی خوفزدہ تھی۔

شاہ زیب نے شدت کرب سے آنکھیں سختی سے بند کرلیں۔

اور جب مجھے یقین ہو گیا تو میں کتنا روئی۔ خود کو کس قدر تنہا محسوس کیا...... میں کتنی ڈری ہوئی تھی...... کسی کو بتا نہیں سکتی تھی...... میری عمر کی لڑکیاں اپنے امتحان کی تیاریاں کر رہی تھیں اور میں کسی اور امتحان سے گزر رہی تھی میں بالکل اکیلی تھی میں ہر اس جگہ گئی جہاں آپ سے ملاقات ممکن تھی...... ہر آدمی میں آپ کے ان دوستوں کا چہرہ تلاش کرتی رہی کہ شاید آپ کے دوست نظر آئیں تو میں آپ کے بارے میں پوچھ سکوں آپ کا پتہ جان سکوں...... آپ کا نام جان سکوں...... کیا آپ نے مجھ سے زیادہ بے وقوف کوئی لڑکی دیکھی ہے جو کسی کا نام تک نہیں جانتی اور اسے اپنا سب کچھ مان کر اسے اپنا سب کچھ سونپ دیتی ہے...... اگر آپ نے کبھی میرے بارے میں سوچا ہوگا تو ہنستے ہوں گے کہ کس قدر بے وقوف لڑکی سے پالا پڑا ہے...... شاید اسی لیے آپ نے فوراً ہی پیچھا چھڑا لیا......"

"اف......" شاہ زیب نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا سر جو پہلے ہی درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ جینا کی باتوں سے جیسے وہ درد ناقابل برداشت ہو گیا۔

"اور...... اور کتنی تذلیل کرو گی میری...... اور کتنا گراؤ گی مجھے اپنی نظروں میں میں تو پہلے ہی شرم سے خود سے نظریں نہیں ملا پا رہا......"

"آپ کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔" وہ بے رحمی سے بولی۔ آپ نے ایک کمزور بے یارو مددگار لڑکی کو دنیا کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا اور اپنا گھناؤنا چہرہ لے کر غائب ہو گئے۔ یہ عزت دار مردوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔ مجھے شرم آتی ہے یہ سوچ کر کہ میں نے آپ جیسے آدمی سے محبت کی...... آپ...... آپ تو نفرت کے قابل بھی نہیں ہیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کہ......

''نہیں۔'' شاہ زیب کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر انتہائی سختی سے اسے کندھوں سے تھام کر عین اپنے سامنے کھڑا کردیا...... اور اپنی خون آلود اور درد سے بھرپور آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں......

''اتنی دیر سے میرے صبر وضبط کا امتحان لیے جارہی ہو......تم نے مجھے کیا سمجھا ہے آخر؟'' حساب لینے آئی ہو تو حساب لو...... بولے جارہی ہو جو منہ میں آرہا ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ میرا دل کتنا تڑپا ہے......میں کیا محسوس کررہا ہوں۔''

جینا نے ششدر ہو کر اسے دیکھا اس کے کندھوں میں اس کے ہاتھوں کی سختی سے درد ہونے لگا......وہ ہلکا سا کسمسائی۔

''آپ مجھے ہرٹ کررہے ہیں......؟''

''کچھ نہیں ہوگا تمہیں......'' شاہ زیب نے سختی سے کہا لیکن ہاتھوں کی گرفت تھوڑی نرم کردی......''کوئی شیشے کی بنی ہوئی نہیں ہو جو ٹوٹ جاؤ گی...... درد صرف تمہیں نہیں ہوا...... تکلیفیں صرف تم نے برداشت نہیں کیں...... میں بھی اسی طرح تڑپتا رہا ہوں...... میں نے بھی یہ سارا عرصہ کانٹوں پر چل کر گزارا ہے۔ میرے پاس بھی بے خواب راتوں کی ایک بڑی کلیکشن ہے...... میں بھی اس سارے عرصے میں خود کو ملامت کرتا رہا ہوں۔ اپنا محاسبہ کرتا رہا ہوں...... خود کو سزا دیتا رہا ہوں......''

جینا ابھی تک حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی...... اسے لگ رہا تھا اب اس کے بولنے کی باری تمام ہوئی۔ اب شاہ زیب کا وقت ہے......وہ بولے گا اور وہ سنے گی......لیکن اس کے دل سے شکایات کا جہاں ابھی بھی نہیں مٹا تھا اسی طرح قائم تھا آباد تھا اور وہ اپنے تمام سوالوں کا جواب چاہتی تھی۔

''ٹھیک ہے...... پھر حساب دیجیے اور سب سے پہلے یہ بتایئے آپ اس رات مجھے خدا حافظ کہے بغیر اتنی عجلت میں کیوں چلے گئے تھے...... میرے نکاح نامے کی کاپی بھی اپنے ساتھ کیوں لے گئے؟ جانے کے بعد مجھے کال کیوں نہیں کی......؟

شاہ زیب نے اسے کندھوں سے تھامے تھامے بیڈ پر بٹھایا......سائیڈ ٹیبل سے شیشے کے جگ میں سے پانی گلاس میں بھر کر اسے دیا......ایک گلاس خود پیا...... کرسی اس کے سامنے کھینچی اس پر بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے......جنہیں جینا نے فوراً چھڑا لیا......ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔

''تمہارے تمام سوالوں کے جواب دینے سے پہلے میں ایک حقیقت تم پر واضح کرنا چاہتا ہوں...... کہ آج سے تین سال قبل بھی میں تم سے محبت کرتا تھا......ان تین سالوں میں اس محبت میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور تم میری زندگی ہو...... میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہو اور میں دنیا کا خوش نصیب ترین انسان ہوں کہ جب میں مایوسی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا اس وقت تم میری آس زندہ کرنے آگئیں...... اور میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے کہ...... کہ'' وہ فرط جذبات سے خاموش ہوگیا...... جینا کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی اس کے چہرے سے نہیں ہٹی تھیں۔ شاہ زیب نے خود پہ قابو پایا۔

''کہ خدا نے......تم نے اتنا خوبصورت، اتنا نایاب تحفہ مجھے دیا......

جینا کے دل میں سکون کی لہریں اتریں......

لیکن وہ خاموش رہی...... نظریں بدستور اس کے چہرے پر تھیں۔

''تو آپ کہہ رہے تھے......'' وہ واپس بات کی طرف پلٹی۔

''تم نے اچھا کیا کہ سارے سوالات ایک ساتھ ہی پوچھ لیے کیونکہ ان سب کا جواب ایک ہی ہے۔''

اس رات میں نے تمہیں کھو دینے کے ڈر سے تمہیں مجبور کیا کہ تم مجھ سے کورٹ میرج کرلو۔ میں نے اپنا ایک اصول توڑا......لیکن بعض اوقات حالات کو صحیح رخ پر موڑنے کے لیے بعض اصول توڑنے پڑتے ہیں...... مجھے پوری امید تھی کہ میں بابا جان کو اپنی معقول وجہ بتا کر منالوں گا لیکن یں نے یہ بھی فیصلہ کیا تھا کہ رخصتی سے پہلے تمہارے قریب نہیں آؤں گا۔...... وہ بھی اس صورت میں کہ میں چھ ماہ کے لیے ملک سے باہر جارہا ہوں...... اپنی سہاگ رات کے لیے میرے دل میں بہت ارمان تھے، بہت اسپیشل طریقے سے بے شمار پھولوں اور رومانٹک ماحول کے درمیان......لیکن تم نے التجا کی کہ تم جانے سے پہلے ایک بار میرے سینے سے لگنا چاہتی ہو...... یہ خواہش ناجائز نہیں تھی...... غیر فطری بھی نہیں تھی......لیکن میں اپنے جذبات کی شدت اور بے پناہ محبت سے ڈر رہا تھا......اسی بے پناہ محبت کی وجہ سے میں تمہاری خواہش رد نہیں کرسکتا تھا ......پھر مجھے اپنے ضبط، کنٹرول اور با اصول ہونے پر بہت ناز تھا۔ لیکن وہ سب مٹی میں مل گیا...... میں کمزوری میں بہہ گیا...... میں یہ سب برداشت نہ کرسکا...... مجھے ایسا لگا جیسے میں نے وقت اور اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور یہ کہ تمہیں یہ اچھا نہیں لگا ہوگا...... یہ ٹھیک ہے کہ شرعی طور پر ہمیں اختیار تھا لیکن معاشرتی طور پر رخصتی سے پہلے ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا میں جو سمجھتا تھا کہ مجھے خود پر بہت کنٹرول ہے میں دوسرے مردوں کی طرح نہیں ہوں وہ سب باتیں محض باتیں ہی ثابت ہوئیں...... میں اتنا شرمندہ تھا کہ خود سے نظریں نہ ملا سکا......تم سے کیسے نظریں ملاتا؟ میں جانتا تھا کہ تم بہت ناراض ہوگی۔ تم یہ عمل جو مجھ سے ہوگیا تھا اسے معاف نہیں کروگی اس لیے میں بزدل بن کر چوروں کی طرح اپنا بیگ اور بریف کیس اٹھا کر نکل گیا کیونکہ میں تم سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ اسی شرمندگی میں تمہیں کال نہیں کیا...... کہ تم سے کیا بات کروں گا۔ کیا کہہ کر معافی مانگوں گا حالانکہ میں تڑپ رہا تھا ترس رہا تھا تم سے بات کرنے کے لیے لیکن خود کو سزا دینے کے لیے بات نہیں کی...... یہ تو سوچا ہی نہیں کہ خود کو دی جانے والی سزا تمہاری سزا بھی بن جائے گی تمہارے دل میں جو منفی خدشات ابھریں گے تم مجھے بے وفا اور ناقابل اعتنا سمجھو گی میں نے تب یہی سوچا کہ واپس جاؤں گا تو روبرو ٹھیک سے اپنا موقف سمجھا کر تم سے معافی مانگ سکوں گا۔

''لیکن جو کچھ بھی ہوا......اس میں آپ سے زیادہ میرا قصور تھا......شاہ زیب پھر آپ خود کو اور مجھے سزا کیوں دیتے رہے......''

''نہیں جینا...... میرا قصور تھا...... میں مرد ہوں میرے اوپر خود کو کنٹرول کرنے اور اصول و قوانین قائم رکھنے کی زیادہ ذمہ داری ہے......واپس آیا تو سوچا آخر کب تک خود ترسی کا شکار رہوں گا...... پہلے مرد بن کر جو غلطی کی ہے اب بزدلی چھوڑ کر مرد بن کر اسے مجھے خود ہی سدھارنا ہوگا...... سو میں تمہارے گھر چل پڑا......دلاور خان نے بتایا کہ تم اس وقت موجود نہیں ہو...... میں کل آؤں......لیکن میری بدقسمتی کہ ہاسپٹل میں کام زیادہ ہونے کی وجہ سے میں پورا ہفتہ نہ آسکا اور جب آیا تو میری دنیا لٹ چکی تھی......دلاور خان نے بتایا کہ تم اسٹڈیز کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لیے دو سال کے لیے کسی باہر کے ملک چلی گئی ہو......
میرا دل بیٹھ گیا...... خود کو کوستا رہا...... مجھے یقین ہو گیا
کہ تم مجھ سے مایوس ہو گئی مجھے دھوکے باز اور بے وفا
سمجھ کر مایوس ہو کر چلی گئی ہو سو میں بھی دو سال کے
لیے حکومت کی طرف سے ملک سے باہر چلا گیا وہاں
بھی میرا کام تمہیں تلاش کرنا تھا...... ڈیوٹی کے بعد
میں کمپیوٹر کے آگے بیٹھ جاتا۔ مختلف یونیورسٹیز کو فون
کرتا کہ کیا جینا فواد خاقانی نام کی کوئی اسٹوڈنٹ
وہاں رجسٹرڈ ہے...... سب لوگ تعاون نہیں کرتے
تھے۔ میں ان دو سالوں میں بھی تمہیں تلاش نہ کر سکا
واپس آیا تو بابا نے شادی کے لیے زور دیا تب میں
نے انہیں اپنی بے وقوفیوں سمیت سب کچھ بتا دیا
لیکن مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی...... آخر تم کون
سی یونیورسٹی میں تھیں......''

جینا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''میں اس سارے عرصے میں ملک سے باہر
گئی ہی نہیں۔ ڈیڈی نے مجھے ممی کے ساتھ آزاد کشمیر
چھوڑ دیا...... وہیں میں نے اجالا کو جنم دیا اور پتہ ہے
کیا جب میں نے باپ کی جوہ ہینڈسم لکھا تو نرس نے
عجیب نظروں سے مجھے دیکھا...... پھر میں گھر واپس
ہی نہیں گئی۔ اجالا کو لے کر میں اپنے گھر نہیں جا سکتی
تھی۔ ملنے جلنے والے آتے رہتے تھے۔ انہیں اس
کی موجودگی کا کیا جواز دیتی...... نکاح نامہ تک تو
میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے ڈیڈی سے فرمائش کی
کہ مجھے مری میں ہی فلیٹ خرید کر سیٹ کروا دیں......
مجھے اپنے خاندان کی عزت بہت عزیز ہے...... اس
لیے میں نے خود کو ان سے دور کر لیا ہے۔''

''آئی ایم سو سوری جینا...... میری وجہ سے تم
اتنی تکلیفیں اٹھائیں لیکن آج تم اس مینشن تک کیسے
پہنچ گئیں۔

''اجالا کی ضد پہ ہم آج مال کا چکر لگا رہے
تھے کہ آپ مجھے ایک بک اسٹور پر نظر آئے میں نے
فوراً دلاور خان سے کہا کہ آپ کا پیچھا کرنا ہے......''

آج اتنے سالوں بعد میری تلاش ختم ہوئی
ہے...... آپ نے ایک ذرا سی بات کے خود کو اور
ہمیں اتنی دیر تکلیف میں رکھا...... ہم شرعی طور پر
میاں بیوی تھے ہمیں...... ہمیں...... وہ شرم کے
مارے جملہ مکمل نہ کر سکی اور رو پڑی شاہ زیب نے
بے چین ہو کر اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں لے لیا
اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی...... اتنے سالوں کی
تکلیفیں کلفتیں اور رستے کی ساری کٹھنائیاں ان
آنسوؤں میں بہہ گئیں۔ شاہ زیب بڑے ضبط سے
اپنی متاع عزیز کو روتے برداشت کرتا رہا...... تین
سالوں سے جمع غبار نکلنا بے حد ضروری تھا...... جب
وہ رو چکی تو شاہ زیب نے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ
اپنی ہتھیلیوں سے بہت نرمی اور محبت سے صاف کیا۔

میں نے تمہیں کہا تھا میں ان خوبصورت
آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا......

ہاں اسی لیے مسلسل تین سال تک آنسوؤں
کی سوغات دیتے رہے...... وہ شاکی نظروں سے
اسے دیکھ کر بولی۔

''میں نے سوری کیا ہے نا...... کہو تو اپنی جان
قربان کر دوں۔'' وہ دلکش انداز میں مسکرایا۔

''ابھی تسلی نہیں ہوئی اب ساری عمر کے لیے
سوغات دینا چاہتے ہیں......؟ وہ ذرا شوخی سے
بولی۔

''اُفوہ...... ہمیشہ غلط موقع پر غلط بات کہہ دیتا
ہوں۔'' اب میں اور صبر نہیں کر سکتا جلد ہی بابا جان
اور بھابیوں کو لے کر آؤں گا اور رخصتی کروا کر تمہیں
ہمیشہ کے لیے یہاں لے آؤں گا......''

''کیا میں ایک بار پھر آپ کے سینے سے لگ
سکتی ہوں......'' وہ شرمیلے انداز سے بولی۔

''نہیں...... بالکل نہیں...... اب اور غلطیوں
کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی سزائیں بھگتنے کی۔
سمجھیں۔''

''تو میں سمجھوں آپ ضبط و کنٹرول کے
معاملے میں بہت کمزور ہیں......''

شاہ زیب نے آگے بڑھ کر بہت محبت سے
اسے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگا لیا اور اس کی
پیشانی پر اپنے لب رکھ دیئے۔ جینا نے سکون سے
آنکھیں بند کر لیں تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

''شاہو......'' تابندہ بھابی کی آواز تھی۔ ''اپنی
ننھی شہزادی کو اپنے بستر پر لٹا لو...... یہ سو چکی ہے۔''

''اوہو...... یہ تو اجالا کے سونے کا ٹائم تھا......
اس نے دودھ بھی نہیں پیا......''

''فکر نہ کرو...... دادا سے دوستی ہو گئی ہے۔
انہوں نے بہت کچھ کھلا دیا ہے۔ اتنی پیاری پیاری
باتیں کی ہیں کہ دادا تو نثار ہو گئے ہیں اس پہ......
برسوں کی حسرت پوری کر دی تم نے شاہو۔''

شاہ زیب نے شیشے کی نازک سی شے کی طرح
بہت نرمی اور محبت سے اسے تابندہ بھابی کی گود سے
اپنی گود میں منتقل کیا۔ اور اسے دھیرے سے اپنے
سینے سے لگا لیا۔ اجالا کے لمس نے ایک باپ کی
شفقت اور محبت کو جذباتی بنا دیا...... وہ اپنے جذبات
پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کی پیشانی اور پھولے پھولے
پنک گالوں کے کتنے ہی بوسے لے ڈالے...... لیکن
نہایت نرمی سے......

پھر آہستہ سے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔

''یہ تمہارے پاپا کا بیڈ ہے میری شہزادی......
آرام کرو......''

دیکھا آپ نے...... اجالا ہو بہو آپ کی
تصویر ہے......

''ظاہر ہے بھئی میری تصویر جو ہر وقت
تمہاری ان حسین آنکھوں میں رہتی تھی...... وہ فخر اور
غرور سے بولا۔

''جی نہیں...... اب ایسی بھی کوئی بات نہیں
ہے۔''

''کیا مطلب نہیں رہتی تھی میری تصویر ان
آنکھوں میں......؟''

''میرا مطلب ہے ہر وقت نہیں رہتی تھی......
کبھی کبھی اور باتوں کے بارے میں بھی سوچتی رہتی
تھی...... آئی مین دن میں ایک آدھ بار......''

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''کتنی پیاری ہے میری بیٹی......؟'' شاہ
زیب فخر سے بولا۔

''ہماری بیٹی......'' جینا نے تصحیح کی۔

''تمہارے ڈیڈی مان جائیں گے نا رخصتی
کے لیے۔ میرا مطلب ہے مجھے اپنے داماد کے طور
پر تسلیم کر لیں گے......؟''

''کیوں نہیں کریں گے کس چیز کی کمی ہے
آپ میں...... یوں بھی وہ ساری عمر اپنی لاڈلی بیٹی کو
تنہا نہیں دیکھنا چاہیں گے...... کیونکہ وہ جانتے ہیں
میں کبھی کسی اور سے شادی نہیں کروں گی......''

دروازہ ایک بار پھر ناک ہوا۔

''دونوں مجرم بابا جان کی عدالت میں حاضر
ہوں یہ ان کا حکم ہے......''

تابندہ کہہ کر چلی گئی...... دونوں نے ایک
دوسرے کی طرف دیکھا۔

''اجالا نہ اٹھ جائے ہمارے پیچھے۔''

''ابھی دو گھنٹے تک اس کے اٹھنے کا کوئی
چانس نہیں ہے...... اجالا کے اردگرد تکیے رکھتے جینا
نے کہا...... بس یہ تکیے رکھ دیئے ہیں تو گرنے کا
چانس بھی نہیں رہا......

دونوں باہر آئے...... بابا لاؤنج میں صوفے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

پر بیٹھے تھے۔ دونوں سامنے جا کر کھڑے ہوگئے۔ بابا جان نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور پھر تادیبی نظروں سے شاہ زیب کی طرف دیکھا۔

''......تم نے میری بہو کے ساتھ اچھا نہیں کیا ...... میرے ساتھ اچھا نہیں کیا...... میں تمہیں اتنی جلدی معاف کرنے والا نہیں تھا لیکن تمہاری وجہ سے ہمیں جو نایاب تحفہ ملا ہے ہم اس کے لیے برسوں سے ترس رہے تھے...... تڑپ رہے تھے...... اس لیے ہم تمہیں معاف کرتے ہیں اور ہم جلد سے جلد اجالا کو اپنے گھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ بیٹی بولو کب آئیں تمہارے والدین کے پاس؟''

''ڈیڈی اور ممی کل آ رہے ہیں...... ادھر ہی میرے فلیٹ میں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے ہم کل ہی آ جائیں گے۔'' انہیں جلدی تھی اجالا کو گھر لانے کی۔

''جیسی آپ کی مرضی......'' وہ ادب سے بولی۔

''شاہو...... تم دونوں یہاں بیٹھو...... میں آج تمہارے کمرے میں آرام کروں گا اور بیٹی اپنے ڈرائیور اور اس لڑکی کو گھر واپس بھیج دو...... آج تم رات تک یہیں رہو گی اور رات کو شاہو تمہیں چھوڑ آئے گا......''

شاہزیب مسکرا دیا وہ جانتا تھا کہ بابا اس کے کمرے میں کیوں آرام کرنا چاہتے ہیں...... وہ مسلسل اجالا کو دیکھنا چاہتے تھے۔ بابا کے جاتے ہی سارے خاندان نے ان دونوں پر ہلہ بول دیا۔

☆......☆......☆

سیلاب کی تباہ کاریاں تو جاری تھیں...... لیکن زیادہ تر لوگوں کو افواج پاکستان نے محصور جگہوں سے آپریشن کرکے محفوظ جگہوں پر پہنچا دیا تھا۔ دوسرے ملکوں کی ٹیمیں بھی ساتھ ساتھ مصروف تھیں...... لوگوں میں اشیائے خورد و نوش کے علاوہ دوسری اشیائے ضرورت بھی تقسیم کر رہی تھیں کچھ ملکوں نے تو سارا کچھ پاکستانی حکومت پر چھوڑ دیا تھا اور انہیں دواؤں اور ضروریات زندگی کی چیزوں کے کارٹن بھجوا دیے تھے لیکن ان چیزوں کی تقسیم میں کھلی کرپشن دیکھتے ہوئے کچھ ممالک اپنی ٹیموں کے ذریعے خود ہی یہ خدمت انجام دے رہے تھے۔

عالی اور مائیک کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے بے شمار لوگوں کو میڈیکل کی سہولیات فراہم کی تھیں دوائیں بھی تقسیم کی تھیں اب دواؤں کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اپنا کام انہوں نے کافی حد تک مکمل کر لیا تھا اس لیے انہیں ایک ایک ہفتہ آرام اور تھوڑی بہت سائٹ دیکھنے کے لیے دیا گیا تھا اس کے بعد واپسی تھی مائیک کے ایک دوست کی فیملی اسلام آباد میں رہتی تھی وہ چونکہ امریکن ایمبیسی سے وابستہ تھی اس لیے وہیں رہائش پذیر تھی اس نے ایک ہفتہ ان کے ساتھ گزارنے کا پروگرام بنا لیا...... عالی بھی اسلام آباد جانے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے بذریعہ فون اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی...... گھر تو اس نے دیکھ ہی رکھا تھا۔ اس کا شاندار استقبال کیا گیا...... شہری نے دروازے پہ ہی اسے خوبصورت پھولوں سے بنا گلدستہ پیش کیا۔ اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔

بابا جانی اسے ساتھ لیے ڈرائنگ روم میں آ گئے...... جو انتہائی نفاست سے سجا تھا اس میں ڈیکوریشن کی کچھ ایسی بیش قیمت اشیاء بھی تھیں جو وہ ہندوستان سے لے کر آئے تھے ان کے نوابی کے دور کی یادگار تھیں۔

''سارا! معزز مہمان کے لیے کوئی عمدہ مشروب لے کر آئیں۔ بچہ دن رات کام کرکے بہت تھک گیا ہوگا...... اسے قوت بحال کرنے اور تھکاوٹ دور کرنے کی ضرورت ہے۔''

''ابھی حاضر کرتی ہوں حضور والا......'' سارا شرارت سے تھوڑا سا جھک کر بولی۔

امی جان اس کی اس حرکت پر مسکرا دیں۔ لیکن زارا خلاف معمول خاموش اور چپ چاپ سی تھی۔ عالی نے جتنی بار بھی اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی غیر معمولی سنجیدگی اور قدرے بے نیازی دیکھ کر دل بیٹھ گیا۔

کیا اسے میرے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی......؟

کیا وہ میری منتظر نہیں تھی......؟

کیا وہ بھی میری طرح اس ملاقات کے لیے بے تاب نہیں تھی......؟ ہزاروں خدشات دل میں جنم لے کر پریشان کر رہے تھے۔

سارا خوبصورت ٹرے میں کرسٹلز کے گلاس میں خوش رنگ مشروب لے آئی اور سب سے پہلے عالی کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں شرارت سے بھری تھیں۔

''لیجیے جناب...... یہ خالص مقوی مشروب خوش رنگ اور ذائقہ دار پھلوں سے کشید کرکے خالص آپ کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ منٹوں میں آپ کے اندر قوت و طاقت اس طرح بھر دے گا جیسے ٹائر میں ہوا بھری جاتی ہے۔''

''سارا......'' بابا جانی نے سرزنش کی ادب و احترام کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔''

''کنیز معافی چاہتی ہے......'' وہ مصنوعی خوف سے بولی تو بابا جانی کو ہنسی آ گئی۔

''ہماری یہ بیٹی بہت ہی زیادہ شرارتی اور لاابالی ہے...... بیٹا اس کی گستاخیوں کو نظر انداز کر دیجیے گا۔''

''کوئی بات نہیں سر میں تو لطف اندوز ہو رہا ہوں......'' وہ شائستگی سے بولا تھا۔

سارا نے شکایتی نظروں سے بابا جانی کی طرف دیکھا۔

''دیکھا بابا جانی آپ کی یہ نستعلیق قسم کی گفتگو یہاں نہیں چلے گی ماحول کو ہلکا پھلکا کرنا ہے تو کوئی خوشگوار اور ہلکی پھلکی گفتگو کیجیے...... پہلے ہی کچھ لوگوں نے اپنی سنجیدگی سے ماحول کے بھاری پن میں اضافہ کر دیا ہے۔'' اس نے مسکرا کر زارا کی طرف دیکھا۔ وہ پھر بھی نہ مسکرا سکی۔

''کیوں زارا بیٹا! آپ کیوں اس قدر خاموش ہیں؟''

''انہوں نے روزہ رکھا ہوا ہے......''

''روزہ......؟'' امی جان حیران ہوئیں۔ کیسا روزہ...... اور روزے میں بولنا منع تو نہیں ہوتا......''

''چپ کے روزے میں تو منع ہوتا ہے امی جان......'' زارا شوخی سے بولی۔

''زارا بیٹا...... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا......؟''

''ہاں امی جان آپ کیوں فکر کرتی ہیں...... سارا تو بس بولتی رہتی ہے ہر وقت......''

''امی جان اصل میں آپی تھک گئی ہیں۔ صبح سے عالی بھائی کے لیے کمرہ سیٹ کرنے میں لگی ہوئی تھیں...... بہت محنت کی ہے انہوں نے......''

سارا مزے سے بولی تو زارا کے چہرے پہ رنگ سا آ گیا لیکن گھور کر سارا کو دیکھا۔

عالی کے چہرے پر اس بات سے مسکراہٹ پھیل گئی۔ دل کو کچھ سہارا ملا۔

بیگم اگر کھانا تیار ہے تو لگا دیا جائے۔''

جیسا آپ کہیں۔

عالی بھائی آپ اگر کھانے سے پہلے فریش ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو گیسٹ روم میں لے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چلوں؟"

"ہاں ضرور......" وہ زرا کے ہاتھوں محنت سے سجا کمرہ دیکھنا چاہتا تھا۔

شیری بیٹا......تم بھائی کو گیسٹ روم لے جاؤ سارا اور زارا کھانا لگاتی ہیں......"

عالی کمرے میں آیا تو بے حد خوبصورت مہک نے اس کا استقبال کیا۔ کمرے میں جگہ جگہ چھوٹی شیشے کی تپائیوں پر زرد گلابوں کے جاذب نظر گلدستے منقش گلدانوں میں سجے تھے، فرش پہ بیش قیمت ایرانی قالین تھا جو نوابی حویلی کی یادگار تھا۔

کمرے کے درمیان میں مسہری تھی جس پہ زرد اور سرخ امتزاج کی قیمتی بیڈ سپریڈ بچھی تھی۔ ایک سائیڈ پر منقش صوفہ سیٹ تھا جس کی لکڑی پہ بے انتہا خوبصورت مینا کاری کی گئی تھی۔ کھڑکیوں پر مہین ریشمی پردوں کے علاوہ بھاری پردے بھی تھے جو رات کو پھیلا دیے جاتے وہ کتنی دیر کھڑا کمرے کا جائزہ لیتا رہا ہر چیز پہ زارا نے محنت کی تھی۔

"تمہیں کیسے پتہ تھا کہ مجھے زرد گلاب پسند ہیں" وہ بے خودی میں ہی خود سے بولا۔

"مجھ سے پوچھ رہے ہیں یا زارا آپی سے......" شوخ سی آواز پر اس نے چونکتے ہوئے مڑ کر دیکھا سارا کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ اسے یہ شوخ و شریر لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔

"کیا یہ کمرہ تم نے سجایا ہے؟"

"نہیں تو......اس نے مسکین کی شکل بنائی میں یہ کریڈٹ تو نہیں لے سکتی۔"

تو پھر میں تم سے کیوں پوچھوں گا؟"

اوہ تو زارا آپی سے پوچھ رہے ہیں وہ کھلکھلائی لیکن مجھے تو زارا آپی کہیں نظر نہیں آ رہیں......وہ مصنوعی سنجیدگی سے ادھر ادھر دیکھ کر بولی......اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اب سمجھی......آپ تصور ہی تصور میں ان کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر پوچھ رہے ہیں......"

"کافی سمجھدار ہو......عالی نے مسکرا کر کہا۔

لیکن اتنے تردد کی کیا ضرورت ہے آپ براہ راست بھی ان سے پوچھ سکتے ہیں، اتنی ڈراؤنی چیز بھی نہیں ہیں کہ آپ ڈر کے مارے کچھ پوچھ بھی نہ سکیں۔"

"شاید......شاید، انہیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا......"

'یہ بے کار کے خدشات اچھے نہیں ہوتے عالی بھائی......سارا سنجیدگی سے بولی ہو سکتا ہے وہ اس لیے خاموش ہوں کہ انہیں بھی کچھ خدشات نے گھیرا ہو......"

"کیسے خدشات......؟" عالی مضطرب انداز میں بولا۔

"میں کیا جانوں یہ تو آپ کو ان سے ہی پوچھنا پڑے گا......

اگر وہ کوئی موقع فراہم کریں گی تو......"

"اس کی آپ فکر نہ کریں......اپ کی یہ چھوٹی بہن کس مرض کی دوا ہے۔"

عالی پیار سے مسکرایا۔

"مجھے اچھا لگا......تمہارا خود کو چھوٹی بہن کہنا......اور یاد ہے اس چھوٹی بہن نے وعدہ بھی کر رکھا ہے مجھ سے زارا کی بات کرانے کا۔"

"صرف بات......؟ میں تو ملاقات کروانا چاہتی تھی......وہ شریر ہوگئی۔

"بات ملاقات میں ہی ہوگی نا......" عالی نے حساب برابر کیا۔

"جی نہیں......فون پہ بھی ہو سکتی ہے......" سارا نے بھی حساب برابر کر دیا۔

عالی محظوظ ہوا لیکن وہ بھی کم نہیں تھا۔

"اچھی بہن ہو......بھائی کی مدد نہیں کر سکتیں......بہنیں تو بھائیوں کے لیے......"

"اوہ......سارا نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی......تو آپ مجھے اموشنل بلیک میل کریں گے......چچ چچ......عالی بھائی یہ تو میں نے اپنی وائلڈسٹ ڈریمز میں بھی نہیں سوچا تھا......آئی ایم سوری لیکن آپ مجھے اتنی پیاری......اتنی اچھی اور اتنی ڈیسنٹ آپی کے لیے ہزبینڈ کے طور پہ قبول نہیں ہیں......"

عالی نے مسکراتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"تم جیتیں میں ہارا اب بتاؤ ملاقات کب ہوگی......"

"سوچ کر بتاؤں گی......" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"دیکھو مجھے زارا سے اہم ترین باتیں کرنی ہیں......وہ باتیں جن پہ میری زندگی کی تمام تر خوشیوں کا دارومدار ہے۔"

"یعنی آپ کو ان سے کچھ سنجیدہ قسم کے سوالات کرنے ہیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں عالی بھائی کہ میں نے آپ کو تنگ کیا......لیکن جانے کی بات ہے کہ آپ کو دیکھ کر میری رگ شرارت اور رگ ظرافت پھڑک اٹھتی ہے۔"

"ڈونٹ وری......آئی انجوائیڈ اٹ ویری مچ۔"

"آپ فکر نہ کریں......آج تو یوں بھی رات ہو چکی ہے......آپ اتنے دنوں کے تھکے ہوئے جلدی سونا چاہیں گے......اور میری طرف سے خواب میں آپی کو دیکھنے اور گفتگو کرنے کی مکمل اجازت ہے......لیکن یاد رکھیے گا......وہ مصنوعی تنبیہ کے طور پہ انگلی اٹھا کر بولی......کوئی گستاخی نہیں ہونی چاہیے......کل میرا یہ زرخیز ذہن کوئی ترکیب ضرور سوچ لے گا......پھر آپ ان سے جو پوچھنا ہو پوچھ لیجیے گا......اور اب اس سے پہلے کہ بابا جی کا بھوک کا پیمانہ لبریز ہو جائے ڈائننگ ٹیبل کی طرف چلیے......

مجھے پورا یقین ہے آپ فریش نہیں ہوئے ہوں گے......اور یہاں کھڑے اپنے خدشات کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے تو میں چلتی ہوں آپ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر آ جائیے۔

"اوہ گاڈ......کس قدر باتونی ہے۔" عالی کے لہجے میں شفقت بھرا پیار تھا۔

"میں نے سن لیا ہے......" باہر سے آواز آئی تو وہ بے اختیار ہنس پڑا اور واش روم کا رخ کیا۔

☆......☆......☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن عالی کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان دور دور تک نظر نہیں آتا تھا......اس کی بے کلی اور بے چینی بڑھتی جا رہی تھی......وہ کبھی لیٹ جاتا......کبھی بستر پر اٹھ کر بیٹھ جاتا اور کبھی اضطراب سے کمرے میں ادھر ادھر چکر لگانے لگتا۔ اس بے تابی کی وجہ زارا تھی......اس کی سنجیدگی اور بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا......رات کھانے کے دوران اور پھر کافی کے دور چلنے تک ایک بار بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی کرن نہیں چمکی تھی......اس نے عالی کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا جبکہ عالی کی نظریں بھٹک بھٹک کر اس کے چہرے پر رک جاتیں......بلکہ مکمل اجنبیت نے عالی کو اندر تک مضطرب کر دیا......کھانا بے حد لذیذ تھا۔ اس کے ٹیسٹ کے عین مطابق......لیکن وہ بھوک ہوتے ہوئے بھی اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکا......اس کے خدشات کو مزید تقویت مل رہی تھی......جہاں خدشات کو تقویت مل رہی تھی وہیں دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ کمزور محسوس ہو رہا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

"تو کیا زارا کے لیے میں جینا کے ساتھ کی گئی ایک رات کی ڈیل سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا؟"

"کیا زارا کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے......؟"

کیا زارا میرے بارے میں اس طرح نہیں سوچتی جس طرح میں اس کے لیے سوچتا ہوں۔

میں نے یہ تین سال صرف اور صرف اس کی یاد میں بسر کیے ہیں اسے اپنے دل کی مسند پر سب سے اونچی جگہ پر بٹھایا ہے۔ اس کے حوالے سے ہزاروں خواب دیکھے ہیں اس کی محبت میں پوری طرح ڈوب چکا ہوں...... وہ میری زندگی بن چکی ہے...... لیکن زارا......؟

اس کے لیے میں کیا حیثیت رکھتا ہوں۔

اگر اس کے دل میں میرے لیے وہ جذبات نہیں جو میرے دل میں اس کے لیے ہیں تو پھر......؟ پھر میرا یہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

کافی کے دوران بھی اس نے اجنبیت اور بے رخی کا مظاہرہ کیا۔ سب کو اپنے ہاتھوں سے کافی پیش کی لیکن اس کے حصے کی کافی سارا کے ہاتھ بھیج دی۔

اس کے پندار محبت کو سخت ٹھیس لگی۔ عزت نفس لہولہان ہوگئی۔

وہ کوشش کے باوجود کافی کا وہ کپ لبوں سے نہ لگا سکا...... وہیں پڑے پڑے ٹھنڈی ہوگئی...... اور جب سارا سارے کپ اٹھا رہی تھی تو حیران رہ گئی۔

"ارے عالی بھائی آپ نے کافی نہیں پی...... اسی طرح پڑے پڑے ٹھنڈی ہوگئی۔" زارا نے چونک کر اسے دیکھا...... وہ ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ شکوہ لیے۔

زارا کی آنکھیں بھیگ گئیں...... اس نے فوراً منہ پھیر لیا۔ یہ منہ پھیر لینا عالی سے برداشت نہ ہوا...... وہ ایک دم اٹھ گیا۔

"میرا خیال ہے سر مجھے صبح صبح یہاں سے رخصت ہوجانا چاہیے۔" زارا کی نظریں عالی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں...... ان نظروں میں بے پناہ اذیت تھی...... کسی بہت نازک آبگینے کو بری طرح ٹھیس لگ گئی تھی...... وہ لاؤنج میں ٹھہر نہ سکی اور برق رفتاری سے باہر نکل گئی۔

"کیوں صاحبزادے...... اتنی جلدی کیوں...... کیا ہم سے کوئی غلطی ہوگئی۔"

"سر پلیز مجھے شرمندہ نہ کریں......"

"تو پھر آرام سے اپنے کمرے میں جا کر سو جائیے...... اس بارے میں صبح بات ہوگی......"

بابا جانی اور امی جان سونے کے لیے چلے گئے تو سارا تیر کی سی تیزی سے اس کے پاس آئی۔

"یہ کیا کر رہے ہیں عالی بھائی...... آپ ایسے ہی...... کوئی بات کیے بنا ہی چلے جائیں گے...... اور میرا خیال تھا آپ محبت کرتے ہیں آپی سے۔"

عالی بے حد سنجیدہ تھا۔

"تم نے دیکھا ہے اس کا رویہ کیسا رہا ساری شام...... اس نے میری طرف دیکھا تک نہیں یہاں تک کہ کافی بھی سب کو خود دی لیکن میرے لیے تمہارے ہاتھ بھجوادی۔"

"تو آپ کو میرے ہاتھ سے کافی لینا اتنا زیادہ برا لگ گیا......" وہ اسے بہلانے کی خاطر بولی

"مذاق نہیں چلے گا سارا...... میں اپنی عزت نفس کے بارے میں انتہائی خود غرض ہوں۔"

"لیکن میں نے تو سنا تھا کہ محبت میں یہ سب نہیں چلتا۔"

"میں یہ نہیں مانتا...... مجھے اپنی خودداری بہت عزیز ہے۔"

"تو کیا آپ ساری عمر کے لیے پچھتانا چاہتے ہیں...... ایک بار ان سے بات تو کیجیے۔ اپنے سوال تو پوچھیے...... ان کے جذبات جاننے کی کوشش تو کیجیے...... ورنہ ساری عمر اسی دکھ اور پچھتاوے میں مبتلا رہیں گے کہ بنا کچھ جانے ہی ہار تسلیم کرلی...... آپ ان کی کیفیت سمجھنے کی کوشش تو کریں...... آپ کیا جانیں ان کے دل میں کیا ہے...... ان کے آپ کے بارے میں کیا جذبات ہیں۔ اتنی جلدی ہمت ہار بیٹھے؟"

عالی خاموش رہا...... کچھ بولنا مناسب نہ سمجھا۔

"مجھے بہن کہا ہے تو پھر میری بات بھی مانیں...... میں نے تو کل کی ملاقات کا سارا پلان بھی تیار کرلیا ہے...... بس رات بھر کی بات ہے...... کسی طرح کاٹ لیجیے...... چاہے سو کر اور چاہے آنکھوں میں...... وہ ان حالات میں بھی شرارت سے باز نہ آئی...... لیکن وہ مسکرا بھی نہ سکا۔

"آپ کمرے میں چلیے...... میرے بہت اچھے بھائی ہیں نا...... کافی تو آپ نے پی نہیں۔ میں آپ کے لیے گرما گرم چائے لاتی ہوں......"

وہ جواب کا انتظار کیے بغیر چلی گئی...... وہ چائے لے کر آئی تو اسے بے اختیار اس پر پیار آ گیا...... اسے ایسا لگا جیسے وہ فری ہو...... اس کی اپنی بہن...... پھر اپنے ہی اندیشوں اور خدشات سے لڑتے لڑتے وہ جانے کب نیند کی مہربان آغوش میں پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

"بابا جانی...... امی جان...... عالی بھائی کچھ خریداری کرنا چاہتے ہیں وہاں امریکہ میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائی کے لیے...... اس کے علاوہ تھوڑا سا اسلام آباد بھی دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کی آرزو ہے کہ ہمیں شاپنگ کے بعد شکرانے کے طور پر کسی اچھے ریسٹوران میں کھانا بھی کھلائیں......"

ناشتے کے بعد سارا نے منصوبہ بندی شروع کردی۔ تو بابا جانی مسکرا دیئے۔

"کب بنایہ پلان......؟"

"پلان......؟" سارا مصنوعی حیرت سے بولی "پلان تو نہیں بنا...... میں تو ان کی خواہش آپ کو بتا رہی تھی......"

"کیوں میاں صاحب زادے...... آپ شاپنگ کرنا چاہتے ہیں؟"

سر اصل میں میرے دونوں چھوٹے بہن بھائیوں نے لمبی لسٹ تھمادی ہے مجھے اب اس میں سے جو جو چیز مل گئی وہ لے لوں گا...... اور باقی کے لیے معذرت کرلوں گا۔"

"تو میں کہہ رہی تھی کہ ہم تینوں ان کو ساتھ لے جاتے ہیں آپ کو معلوم ہے مجھے شاپنگ کا وسیع تجربہ ہے۔ ہر اچھی چیز کہاں ملتی ہے میں جانتی ہوں...... میں عالی بھائی کو ساری چیزیں لے دوں گی اور بعد میں ہم وہاں کھانا بھی کھالیں گے آپ جانتے ہیں مجھے کتنا شوق ہے...... اور آپ تو لے کر جائیں گے نہیں۔ آپ کو باہر کھانا پسند نہیں......"

سارا نے امید بھری نظروں سے بابا جانی کی طرف دیکھا تو وہ سوچ میں ڈوب گئے۔

"بابا جانی فکر کی بات نہیں۔ شہری ہمارے ساتھ ہوگا...... امی جان میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا...... عالی بھائی نے ہماری اتنی مدد کی...... زارا آپی کو ہمارے پاس پہنچایا تو ہمارا بھی حق بنتا ہے کہ ان کی مدد کریں اور وہ بھی بے ضرر سی......"

بابا جانی اور امی جان بھی خاموش تھے جبکہ زارا لاتعلقی سے چائے پی رہی تھی۔

سر اگر آپ مجھے غلط سمجھتے ہیں اور ایسا نہیں چاہتے تو کوئی بات نہیں...... میں خود ہی چلا جاؤں گا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اورلوگوں سے پوچھ پوچھ کرخریداری کرلوں گا......‘‘ عالی انتہائی شرافت اور معصومیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولاتو وہ ایک دم چونک گئے۔

’ابھی ہمارے خون میں شرافت کے جراثیم موجود ہیں برخوردار!اورہم اتنے احسان فراموش بھی نہیں ہیں ......اورتمہاری شرافت پرہمیں پورا اعتبار ہے......ہم تو کچھ اورہی سوچ رہے تھے۔‘‘

’’کیابابا جانی؟‘‘ سارانے پوچھا۔

دراصل ہمیں ہمارے ایک شعر کادوسرامصرع مل گیا اور ہمارا شعر مکمل ہوگیا ہم اس لیے خاموش رہے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔‘‘

’’اوہ بابا جانی...... آپ بھی کمال کرتے ہیں۔میں تو ڈرہی گئی تھی۔‘‘

سارا پر جوش انداز میں اٹھی...... شہری بھی خوش تھا کہ تفریح کا موقع مل رہا ہے۔ساری چیزیں سمیٹ کر وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو زارا کھڑکی میں کھڑی جانے کیا سوچ رہی تھی...... بہت مضطرب اورافسردہ لگ رہی تھی۔

’’آپی جلدی سے تیار ہوجائیں ...... اس سے پہلے کہ باباجانی اورامی جان کاارادہ بدل جائے ......‘‘

’’میں نہیں جارہی سارا ......‘‘ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

’’کیوں ......؟‘‘ سارا کوغصہ آ گیا۔’’ کیوں نہیں جارہیں؟‘‘

زارا خاموش رہی ...... جانے کیوں اس کی آنکھیں بھیگ گئیں......سارا نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کراس کارخ اپنی طرف موڑا۔

’’کس بات کاڈر ہے آپی آپ کو؟عالی بھائی کوئی کھاتو نہیں جائیں گے آپ کو...... یقین کریں ان جیسا پیارانفیس شخص کوئی نہیں ہے اس دنیا میں‘ اور آپ......‘‘

سارا پلیز......‘‘ زارا کرب سے بولی’’وہ جتنا بھی نفیس......شاندار...... ہینڈسم یاڈیشنگ ہو...... وہ میرے لیے نہیں ہے...... میرانصیب نہیں ہے۔‘‘

’’کیا آپ نے اپنا نصیب خودلکھا ہے...... میں تو سنا تھا کہ جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔نصیب بنانے والی ذات خداتعالیٰ کی ہے۔‘‘

زارا خاموش رہی۔ اس بات کا کیا جواب دیتی۔

’’چلیے ایک سیکنڈ کے لیے مان بھی لیتے ہیں کہ وہ آپ کا نصیب نہیں ہے جوکہ آپ نہیں جانتیں لیکن اس بات سے آپ انکارنہیں کرسکتیں کہ آپ عالی بھائی سے بے پناہ محبت کرتی ہیں تو کیا آپ اس کے اس ملک میں آخری دنوں کی یاد خوشگوار بنانے کے لیے......ان کے چہرے پرمسکراہٹ دیکھنے کے لیے ذراسی قربانی نہیں دے سکتیں......صرف چند گھنٹے......زیادہ تونہیں۔‘‘

سارا نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا...... اب اس اسٹیج پر وہ اپنے پلان کوناکام ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔یوں بھی زارااورعالی کی خوشیاں اسے بے حدعزیزتھیں۔

یہ زارا کی محبت ہی تھی کہ وہ جانے کے لیے رضامند ہوگئی......انتہائی سادہ کاٹن کازردلباس جس کی Edge پر زرد ربن لگا تھا پہن کر منہ دھویا اور بالوں میں برش کیا۔اتنی سادگی میں بھی وہ زردلباس میں زرد کلی لگ رہی تھی۔کم ازکم عالی کے دماغ میں اسے دیکھ کر یہی خیال آیا تھا...... لیکن اس کی دل گرفتگی دیکھ کروہ خودبھی بے کل ہوگیا۔زاراڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے لگی توسارانے اسے پیچھے ہٹادیا۔

’’ڈرائیو میں کروں گی کیونکہ مجھے اپنی زندگی عزیز ہے۔‘‘

گاڑی سبک روی سے خراماں خراماں سڑکوں پر دوڑ رہی تھی......سارا تمام راستہ چہکتی رہی۔اپنے نت نئے لطیفوں سے عالی کو ہنساتی رہی جبکہ زارا خاموش بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

پسنجرسیٹ پرسارا کے قریب بیٹھے بھی عالی کا پورادھیان زارا کی طرف تھا۔

تھوڑی دیربعدزاراچونکی۔

’’یہ تم کدھر جارہی ہو سارا...... ادھر تو کوئی شاپنگ مال نہیں ہے......‘‘

’’ہے کیوں نہیں...... یہ سڑک آگے مری روڈ پر مڑ جاتی ہے......‘‘ وہ چپ ہوگئی اور کافی دیر بعد جب گاڑی ائیر پورٹ کے قریب اس ریستوران کے آگے رکی جہاں زارا کی عالی سے پہلی ملاقات ہوئی تھی تو وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

’’تم یہاں کیوں آگئیں......؟‘‘

’’اصل میں مجھے بھوک بہت لگ رہی تھی آپ تو جانتی ہیں میں بھوک کی کتنی کچی ہوں تو سوچا پہلے کچھ کھالیا جائے۔‘‘

’’تواس کے لیے تمہیں اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی؟‘‘ زارا کوغصہ آگیا۔

’’یقین کریں آپی...... ہم جس مال میں جارہے ہیں یہ ریستوران اس کے رستے میں واقع ہے۔اب چلیے جلدی سے باہر آیئے۔‘‘

تماشادکھانے کے بجائے وہ بادل نخواستہ باہر نکل آئی...... ریستوران کے داخلی دروازے پہ کھڑے تین سال پیچھے لوٹ گئی...... جب یہاں کھڑی وہ عالی کوتلاش کررہی تھی ......عالی سارااور شہری کے ساتھ عین اسی ٹیبل پر پہنچ گیا......زارا نے متوحش نظرں سے اسے دیکھا......عالی نے وہی کرسی اس کے بیٹھنے کے لیے باہر کھینچی جس پر وہ تین سال قبل بیٹھی تھی وہ ٹرانس کی حالت میں بیٹھ گئی۔عین سامنے کرسی کھینچ کرعالی بیٹھ گیا۔

’اوکے عالی بھائی یہ لسٹ میں نے اپنے پرس میں رکھ لی ہے...... میں اورشہری وہ چیزیں خریدنے مال جارہے ہیں اورآپی پلیز انجوائے یور لنچ......‘‘

زارا ششدر یہ سب ہوتا دیکھ رہی تھی...... لیکن اعصاب جیسے جواب دے گئے تھے کہ ایک لفظ نہ بولی۔اس کی نظریں کتنی دیر تک ان کا پیچھا کرتی رہیں پھراس نے بے اختیار عالی کی طرف دیکھا ......وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔دونوں کی نظریں ملیں۔ عالی کی آنکھوں میں محبت کے اتنے رنگ تھے کہ چند لمحے تو وہ نظریں نہ ہٹاسکی۔

’’یہ آپ نے میرے ساتھ اچھانہیں کیا۔‘‘ وہ بمشکل بول سکی

’’اچھایابرا......اب تو ہوگیا جو ہونا تھا۔‘‘ وہ مسکرایا

’’لیکن آپ کوایسانہیں کرنا چاہیے تھا۔آپ نے کیا سوچ کرایسا کیا۔‘‘ وہ خفگی سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

’’آپ مجھ سے اتنی ناراض کیوں ہیں آخر میں نے کیا کردیا......‘‘ عالی نے اس کے خفا خفا چہرے کی طرف دیکھا۔زارا نے اپنا سر جھکالیااور کانٹے سے کھیلنے لگی۔

’’کل جب سے میں آیاہوں آپ سنجیدہ ہیں ایک لمحے کومسکراہٹ آپ کے چہرے کوچھونہیں سکی میری طرف دیکھنے سے مسلسل گریز کیا حتیٰ کہ اپنے ہاتھوں سے کافی دینا تک گوارانہیں کیا۔زارا آخر یہ سب کیا ہے ...... آپ ایسے کیوں کررہی ہیں کیا آپ کواپنے گھر میں میرا آنا اتنابرالگا ہے؟‘‘

زارا نے سرنہیں اٹھایا ......آنکھیں بھیگنے لگیں۔ضبط سے چہرہ سرخ ہونے لگا۔عالی کودلی تکلیف ہوئی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

"آپ پلیز روئیے نہیں یہ میری برداشت سے باہر ہے۔ اگر آپ اشارہ کریں تو میں اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا...... لیکن جانے سے پہلے اپنا قصور ضرور جاننا چاہوں گا...... اتنا تو حق ہے نا مجھے...... پلیز میری طرف دیکھیے زارا...... میں تو کل بہت امیدیں لے کر آیا تھا...... لیکن آپ کے منفی رویے نے دل ہی توڑ دیا...... کیا آپ اپنے رویے کی وجہ بتانا پسند کریں گی؟"

زارا نے ایک پل آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا آنسوؤں سے بھری آنکھیں عالی کے دل میں تہلکہ مچا گئیں۔

"ایک سوال کا جواب دیں...... کیا آپ کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں......؟"

زارا کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں تھام لیا۔

"آپ ایک بہت اچھے انسان ہیں...... کون بے وقوف ہوگا جو آپ کو پسند نہ کرے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے...... چلو میں سوال بدل لیتا ہوں۔ کیا آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے......" اس نے براہ راست صاف الفاظ میں پوچھ لیا۔

زارا کے آنسو اب گالوں پر گرنے لگے۔

"مجھے آپ سے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

"حق کی بات بیچ سے نکال دیں...... اور میرے سوال کا جواب دیں۔"

"نہیں دے سکتی جواب۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ میں خود کو بے وقعت نہیں کر سکتی۔ میں جینا کے نصیب کو نہیں چھین سکتی۔ اس کے راستے کو کھوٹا نہیں کر سکتی......"

"یہ جینا کہاں سے آ گئی بیچ میں؟" عالی حیران رہ گیا۔

"جینا ہمیشہ سے ہے درمیان میں...... ہم اسے اگنور نہیں کر سکتے......"

"تو آپ جینا کے لیے خود کو قربان کر دیں گی......؟"

زارا خاموش رہی...... عالی نے غور سے اس کے روئے روئے چہرے کی طرف دیکھا۔

فرض کیجیے اگر جینا درمیان میں نہ ہوتی تو پھر پھر آپ کا کیا جواب ہوتا؟"

اگر مگر کا کیا فائدہ...... جینا ایک حقیقت ہے۔ ایک سچائی ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

"لیکن مجھے جینا سے محبت نہیں ہے۔"

"یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے میں اسے ڈسکس نہیں کرنا چاہتی......" عالی بے اختیار ہنس پڑا...... کس پتھر سے پالا پڑا ہے۔

"جانتی ہیں مجھے ایک شعر یاد آ رہا ہے اور تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ اس سچویشن پہ پورا اترتا ہے:

وہی جگہ ہے وہی رت ہے وہی منظر
ہر ایک چیز وہی ہے نہیں ہو تم وہ مگر

اس رات تم کتنی سوفٹ لگ رہی تھیں...... ہنستی مسکراتی...... باتیں کرتی...... کھلکھلاتی۔ میری ایک ایک بات توجہ سے سنتی ہوئی۔ ہر بات کا شرمیلی مسکراہٹ سے جواب دیتی...... لیکن آج سب کچھ بدلا ہوا ہے...... تم وہ نہیں رہیں......" وہ آپ سے تم پر اتر آیا۔

"اس رات میں جینا کا پارٹ پلے کر رہی تھی۔ اس رات میں زارا نہیں تھی......"

"تو یہ سارا تعلق ایکٹنگ کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جانتی ہو اس رات تمہارے کردار نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ میرا دل میرا نہیں رہا...... میرا کیا قصور ہے صرف یہی کہ میں نے دل کی گہرائیوں اور جذبات کی پوری شدتوں کے ساتھ تم سے محبت کی ہے میں یہاں سے کہاں جاؤں؟ واپس پلٹ نہیں سکتا اور آگے جانے کی تم اجازت نہیں دو گی۔ ٹھیک ہے...... میں ہمیشہ کے لیے تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا لیکن تمہیں ایمانداری سے اس بات کا جواب دینا پڑے گا کہ اگر جینا درمیان میں نہ ہوتی تو کیا تم اقرار کر لیتیں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔"

"میں تمہارے لیے اس رات کے ایکٹ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہوں، پلیز میرے سکون کی خاطر...... میرے دل کے تمام جذبوں کی تسکین کی خاطر...... بولو...... جواب دو اور اس بار کوئی بہانہ نہیں...... سچ اور صرف سچ...... سچ کے سوا کچھ نہیں سننا مجھے...... کیونکہ یہ ہم دونوں کے جذبات کی توہین ہوگی پلیز! سچ سچ سب کہہ دو......"

زارا کے آنسو اور زیادہ تیزی سے بہنے لگے۔

"ہاں مجھے یہ کہنے میں کوئی باق نہیں کہ میں اسی روز سے آپ کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ میں نے اس محبت کا بہت مقابلہ کیا لیکن ہار گئی پہلے تین سال میں کوئی دن کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرا کہ میں نے آپ کے بارے میں نہ سوچا ہو...... وہاں اس ٹیلے پہ بھی کوئی ایسا وقت نہیں آیا جب مجھے آپ کا خیال نہ آیا ہو۔ اب تو خوش ہیں آپ۔ اب سکون آ گیا آپ کو...... مجھے بے وقعت کر کے مطمئن ہو گئے آپ؟"

عالی نے بے اختیار اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے...... تمہیں بے وقعت کرنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن تمہارے منہ سے یہ سننا میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا کیونکہ میں نے بھی پچھلے تین سالوں سے صرف اور صرف تمہیں ہی سوچا ہے جینا کے نام کے ساتھ ہی سوچا ہے...... لیکن سوچا تو تمہیں ہے...... صورت تو تمہاری آنکھوں میں رہی ہے۔ نام میں کیا رکھا ہے جینا نہ سہی زارا سہی...... ویسے بھی تم پہ زارا نام بہت سوٹ کرتا ہے...... اور اب میں تمہیں یہ خوشخبری دینا چاہتا ہوں کہ جینا ہمارے درمیان میں نہیں ہے...... وہ کبھی بھی نہیں تھی کیونکہ اس کی منزل تو وہ شخص ہے جس کی وجہ سے اس نے تمہیں جینا بن کر مجھ سے ملنے پر مجبور کیا...... اس کو نصیب کہتے ہیں زارا۔ خدا کو ہمیں ملانا مقصود تھا اس نے آسمان پہ ہماری جوڑی بنادی تھی کل رات میں بہت دکھی تھا تمہارے رویے نے مجھے بہت دل گرفتہ کر دیا تھا ایسے میں سکون کے لیے میں نے ڈیڈی اور امی کو فون کیا...... انہوں نے بتایا کہ جینا نے باہر پڑھائی کے دوران ہی اس لڑکے سے شادی کر لی تھی اور اب اس کی ایک بیٹی بھی ہے دو سال کی۔ وہ واپس آئیں گے تو دھوم دھام سے تقریب کا اہتمام کیا جائے گا اور سب کو سرپرائز دیں گے کیونکہ ان کے تمام ملنے والے بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

زارا حیرت سے سب سن رہی تھی۔ اس کے کانوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ چہرے سے سارا درد اور اذیت غائب ہو گئے تھے چہرہ آنسوؤں سے دھل کر نکھر گیا تھا۔ آنکھوں میں چاند ستارے اتر آئے تھے...... کیسا دلفریب منظر تھا۔ عالی دیکھتا رہ گیا...... اس کے یوں دیکھنے پر وہ بے ساختہ شرما گئی۔

"بہت برے ہیں آپ...... پہلے کیوں نہیں بتایا۔ خوامخواہ مجھے اتنا پریشان کیا...... آپ کیا جانیں میرا دل کتنا ٹوٹ رہا تھا۔ یہ خیال کہ آپ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے اور یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی مجھے کسی کل چین نہیں لینے دے رہا تھا......"

"ایسا نہ کرتا تو تم سے اقرار محبت کیسے سنتا...... میں واقعی جاننا چاہتا تھا کہ زارا کہ کیا میں بے کار میں ایسی لڑکی سے محبت نہیں کر بیٹھا جس کے میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

صرف ایک رات کا ایکٹ ہوں اور بس ...... کہیں
میں کسی غلط لڑکی کو تو اپنی زندگی نہیں بنا بیٹھا......''
''تو پھر کیا نتیجہ اخذ کیا جناب عالی......''
''کل سے اس کا سنجیدہ اور بے نیاز انداز
آج اس کا خفا خفا دل گیر چہرہ اور آنسوؤں کی
برسات نے ساری کہانی تو سنا دی تھی لیکن میں اس
کے منہ سے سننا چاہتا تھا میرا خیال ہے وہ لڑکی بھی
مجھ سے محبت کرتی ہے۔''
زارا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ تبھی بیرا کھانا لے کر
آ گیا ......زارا نے دیکھا اس نے سب کچھ وہی
آرڈر کیا تھا جو تین سال پہلے زارا نے اس کے لیے
کیا تھا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ عالی نے جیب
سے ایک پیکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔
''یہ تمہارے لیے فری اور زیبی نے بھیجا
ہے۔''
''اچھا...... وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔ وہ
جانتے ہیں مجھے؟''
''ہاں تمہاری بڑی سی تصویر بھی موجود ہے
میرے کمرے میں...... ہر روز اٹھ کر پرنام کرتا ہوں
اور رات کو سوتے ہوئے باتیں کرتا ہوں۔''
''اچھا......'' وہ بے تحاشہ حیران ہوئی ''لیکن
تصویر کہاں سے آئی میں نے تو نہیں بھیجی۔''
''ڈیڈی نے انکل جواد سے کہا انہوں نے
جینا سے کہا اور جینا نے بھیج دی۔ کہاں سے یہ تو علم
نہیں۔''
''ضرور ہمارے کالج کے گروپ فوٹو سے
الگ کروا کر انلارج کروائی ہوگی......''
''ایک اور چیز بھی تمہاری میرے پاس......
وہ بھی ہر رات میرا دل بہلاتی رہی ہے...... میں یوں
ہی تو دیوانہ نہیں بنا...... بہت سی چیزوں نے مدد
کی......'' اس نے مسکراتے ہوئے جیب میں ہاتھ
ڈالا اور پازیب نکال کر اس کے سامنے لہرائی۔
''اوہ تو یہ آپ کے پاس تھی...... وہ خوشی سے
چلائی۔ اور میں سمجھی شاید گم ہوگئی ہے پتہ ہے یہ
ہمارے خاندانی نوادرات میں سے ایک ہے۔ میں
نے تو ڈر کے مارے امی کو بتایا تک نہیں کہ گم ہوگئی
ہے۔ اس نے پازیب پکڑنے کی کوشش کی تو عالی
نے جلدی سے ہاتھ پرے کرلیا۔
''سوری یہ تو تمہیں واپس نہیں ملے گی۔ آنٹی
کو بتاؤں گا کہ یہ زارا نے مجھے تحفے میں دے دی تھی
۔یادگار نشانی کے طور پر۔''
''ہائے نہیں پلیز...... امی سے ایسی کوئی بات
نہ کہیے گا...... وہ پہلے ہی ناراض تھیں جب میں نے
انہیں بتایا کہ میں جینا کی وجہ سے آپ سے ملی
تھی......''
''تم نے انہیں بتایا تھا؟'' عالی حیران ہوا۔
''ہاں میں زیادہ دیر تک ان سے کوئی بات
نہیں چھپا سکتی۔''
''اب میرے ساتھ بھی یہی رویہ رکھنا اور
زیادہ دیر تک مجھ سے کچھ چھپانا نہیں......''
او۔کے باس۔''
''پتہ ہے دو سال قبل جب جینا کی دادی
وفات پاگئی تھیں تو ہم سب لوگ پاکستان آئے تھے
جب جینا کو دیکھا تو پتہ چلا کہ جینا وہ لڑکی نہیں ہے
جس سے میں ملا تھا جینا سے پوچھا تو اس نے بیباکی
سے سب تسلیم کرلیا اور اس کی وجہ بھی بتادی میں اس
وقت گھٹنوں گھٹنوں تمہاری محبت میں ڈوب چکا تھا۔''
عالی مزاحیہ انداز سے بولا ''پھر فری نے تم دونوں کی
کسی مشترکہ دوست فضہ سے تمہارا ایڈریس معلوم کیا
اور میں تمہارا پتہ کرنے تمہارے گھر بھی آیا لیکن
ساتھ والے لڑکے نے بتایا کہ تم لوگ تو چھٹیاں
منانے اپنی نانی کے گاؤں گئے ہو سو میں مایوس لوٹ

آیا۔
''اوہو آئی ایم سو سوری......'' زارا بھی
مزاحیہ انداز میں بولی...... بے چارے عاشق بھی
کتنے مجبور ہوتے ہیں۔''
''میرا مذاق اڑا رہی ہو۔'' وہ مصنوعی غصے
سے بولا۔
''سوری سر......'' اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ
کرتے ہوئے کان پکڑ لیے۔ عالی نے اسی انداز پہ
بے حد محبت سے اس کی طرف دیکھا زارا ایک دم
جھینپ گئی اس کا انداز اتنا دلکش تھا کہ عالی دل تھام کر
رہ گیا۔
''اگر آپ اسی طرح مجھے دیکھتے رہیں گے تو
میں کھا نہیں سکوں گی اور پلیز آپ بھی کھائیے
نا......''
تبھی سارا اور شہری ڈھیروں لفافے اٹھائے
اندر آ گئے...... سارا اتنی تھکی ہوئی تھی کہ دھم سے کرسی
پر بیٹھ گئی اور غور سے دونوں کی شکلیں دیکھنے لگی۔
''لگتا ہے مطلع ابر آلود نہیں رہا......'' اس کی
آنکھوں میں بے پناہ شرارت تھی زارا محجوب سی ہوگئی
جبکہ عالی بے انتہا مسرت سے بولا ''تمہارا خیال
بالکل غلط ہے سسٹر۔''
''سسٹر!'' زارا حیران ہوئی لیکن کسی نے
نوٹس نہ لیا۔
سارا معنی خیز انداز میں مسکرائی عالی نے بھی
ساتھ دیا پھر زارا، عالی اور شہری بھوک کی وجہ سے
کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔
آنکھوں میں محبت کے بہت سارے دیے
جلائے ان تینوں کو کھاتا ہوا دیکھنے لگی۔
آج کا دن کتنا مبارک تھا۔ زندگی کی سب
سے بڑی خوشی ملی تھی۔

☆......☆......☆

عالی نے اسی رات اپنے والدین سے بات
کی۔ انہیں زارا کے بارے میں تفصیل سے بتایا اس
کے خاندان اور خاندان کے افراد کے بارے میں
بتایا اور آخر میں پوچھا:
''ڈیڈی کیا آپ سب ایمرجنسی میں ایک دو
ہفتوں کے لیے پاکستان آسکتے ہیں......؟''
''وہ کیوں بیٹا...... اتنی ایمرجنسی کیا ہے؟''
''ڈیڈی اصل میں ایک ہفتے کی چھٹی بڑھا
چکا ہوں۔ مجھے زارا والا مسئلہ یقینی طور پر حل کرنا تھا
...... اتنی جلدی دوبارہ چھٹی نہیں مل سکتی اور میں
چاہتا تھا کہ آپ زارا سے اور اس کے خاندان والوں
سے مل لیں۔ سب کچھ او کے کردیں اور...... اور
درمیان میں احترام مانع تھا اس لیے وہ بات
مکمل نہ کر سکا۔
''کھل کر کہو یار...... ہم دوست ہیں......
تمہارے دل میں جو بات بھی ہے بلا جھجک کہہ سکتے
ہو......''
''میں چاہتا تھا کہ ہمارا نکاح ہوجائے کیونکہ
امیگریشن میں کم سے کم چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ
ایک سال تو لگ جاتا ہے اور اب میں بات کو زیادہ
طول نہیں دینا چاہتا۔''
''تمہارا مطلب ہے تم اب زیادہ انتظار نہیں
کرسکتے...... زارا کو جلد از جلد اپنے گھر لانا چاہتے ہو
یہی بات ہے نا۔''
''یس ڈیڈی آپ ٹھیک سمجھے...... آپ
زارا کے والد صاحب سے بات کریجیے اور اپنا مدعا
بیان کردیجیے تاکہ بات ان تک پہنچ تو جائے۔ کیا
آپ آسکتے ہیں ڈیڈی...... امی اور فری زیبی
سمیت...... کیونکہ میں اپنی زندگی کے اس اہم موقع
پر سب کی موجودگی چاہتا ہوں۔''
''کیوں نہیں بیٹا ہمارے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نہیں ہے کہ ہم انکار کریں۔ نہ تو میں جاب کرتا ہوں اور نہ ہی روپے پیسے کا کوئی مسئلہ ہے میں ابھی جیفری کو فون کر کے قریب ترین فلائٹ بک کرواتا ہوں۔''

پھر عالی نے فرداً فرداً گھر کے ہر فرد سے بات کی سب بے انتہا خوش اور پرجوش تھے خاص طور پر فری اور زیبی کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔

''بھائی کیا ہم بھابھی بات کر سکتے ہیں؟''

''ابھی نہیں...... پہلے ڈیڈی اور امی تمہاری بھابی کے پیرنٹس سے بات کرلیں، اگر وہ او۔ کے کردیں گے تو پھر میں تم دونوں سے بات کرادوں گا۔''

''بھائی آپ نے ہمارا گفٹ بھابھی کو دے دیا؟''

''ہاں وہ بہت خوش ہوئی اسے پسند بھی بہت آیا۔ تھینکس کہہ رہی تھی۔''

عالی کے ڈیڈی نے زارا کے بابا جانی سے بات کی اور زارا کا ہاتھ باقاعدہ طور پر طلب کیا۔

بابا جانی نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ عالی کے ڈیڈی نے درخواست کی کہ چونکہ عالی کی چھٹیاں کم ہیں دوبارہ جلدی نہیں ملیں گی اور امیگریشن کے کام میں چونکہ دیر لگتی ہے اس لیے عالی کی خواہش ہے کہ ان دو ہفتوں کے اندر اندر نکاح کردیا جائے۔

ادھر سارا نے امی جان کے کان میں ڈرتے ڈرتے ہی سہی یہ اطلاع پہنچادی کہ زارا آپی بھی یہی چاہتی ہیں۔ بابا جانی اور امی جان کو عالی بہت پسند آیا تھا وہ اس کی شرافت اور خوبصورت شخصیت کے گرویدہ ہوچکے تھے۔ اس کی بول چال، شائستگی اور حس مزاح کو بھی پسند کرتے تھے دل سے وہ اس رشتے کو قبول کرچکے تھے اور جب عالی کے والدین سے ملاقات ہوئی تو قبولیت پر مہر لگادی گئی جہانگیر اور عذرا کو زارا بے حد پسند آئی تھی اس کا خاندان بہت پسند آیا تھا خاص طور پر ان کی گفتگو اور رکھ رکھاؤ ان کی نجابت کا گواہ تھا...... دونوں خاندان ہی خوش تھے۔ عذرا نے زارا کو اپنے پاس بٹھا کر پیار کیا۔

''آج شام کو میرے ساتھ چلنا تمہاری پسند کا جوڑا منتخب کرلیں گے۔''

''بہن اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں کچھ عرض کروں۔'' امی جان نے انکساری سے کہا۔

''کہیے!'' عذرا خوش دلی سے بولیں۔

''اصل میں زارا کی دادی چاہتی تھیں کہ ان کی پوتی نکاح اور شادی کے موقع پر ان کے خاندانی ملبوسات میں سے کچھ زیب تن کرے، میں نے وہ سب چیزیں سنبھال کر اسی مقصد کے لیے رکھی ہیں۔ زارا کے علاوہ عالی بیٹے کے لیے بھی خاص شیروانی ہے جو زارا کے دادا نے اپنی شادی پر پہنی تھی اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ہم وہ چیزیں استعمال کرسکتے ہیں......''

''ارے نہیں اس میں مائنڈ کرنے والی کون سی بات ہے یہ تو ہماری عین خوش نصیبی ہوگی لیکن ہمارے بھی بہت سے ارمان ہیں۔ ہمارے گھر کی بھی یہ پہلی شادی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ زارا کو ساتھ لے جاکر اس کے لیے خاص ملبوسات تیار کروائے جائیں......''

''کیوں نہیں یہ تو آپ کا حق ہے...... ہم آپ کو آپ کے حق سے محروم کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''چلیے پھر یہ تو طے ہوگیا کھانا لگ چکا ہے۔ ڈائننگ روم میں تشریف لے آیئے۔''

☆......☆......☆

جواد اور جینا کے خاندان کی عزت بچانے کے لیے شاہ زیب کے بابا نے ہی یہ ترکیب سوچی تھی۔ جواد کے سب ملنے والوں کے مطابق جینا دو سال سے بیرون ملک پڑھائی کے لیے مقیم تھی شاہ

زیب بھی پچھلے دو سال سے وہیں تھا سب کو یہی بتایا گیا کہ دونوں کی وہاں ملاقات ہوئی دونوں کو آپس میں محبت ہوگئی اور دونوں نے شادی کا پروگرام بنالیا جینا نے اپنے والدین کو اطلاع دی دونوں وہاں پہنچے اور شادی میں شرکت کی یہاں کسی کو نہیں بتایا تاکہ جب وہ آئیں تو ایک گرینڈ تقریب میں سب کو سرپرائز دیا جائے، ہوسکتا ہے کچھ لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہ کریں، باتیں بنائیں، سوالات کریں لیکن اب دنیا کی پرواہ میں اپنی بیٹی کو کھونا منظور نہیں اب جبکہ سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا۔ شاہ زیب مل گیا تھا اس کے غائب رہنے اور کال نہ کرنے کی وجہ بھی اس کی شرافت اور اصول پسندی ہی تھی وہ انہیں داماد کے طور پر پسند آیا تھا اس کا خاندان پسند ایا تھا تو اب دنیا کی پروا کرنے کی کیا ضرورت تھی دنیا تو کبھی چپ نہیں رہتی کچھ بھی ہو کچھ نہ بھی ہو تو کچھ کہنے سے باز نہیں آتی۔

فواد کو بھی سب کچھ بتادیا گیا وہ یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ اس کی ایک پیاری سی بھانجی بھی ہے...... اسے ملنے کو بیقرار تھا اور اب انتظار کے دن تھوڑے ہی تھے۔

☆......☆......☆

جواد صاحب اور جہانگیر کی ملاقات ہوئی وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اور جب جہانگیر کے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا اور زارا اور عالی کے بارے میں بتایا تو انہیں بس ایک لمحے کو افسوس ہوا صرف اپنے دیرینہ خواب کے ٹوٹ جانے پہ...... ورنہ خدا نے انہیں جو عطا کردیا تھا وہ بھی کسی لحاظ سے کم نہیں تھا۔

''میں زارا کو جانتا ہوں بہت پیاری اور پروقار بچی ہے۔ جینا کی اس نے اکثر مدد کی ہے پڑھائی کے سلسلے میں۔ بہت اچھا خاندان ہے اس کے دادا تقسیم کے وقت ہندوستان کی کسی ریاست کے نواب تھے لیکن پاکستان کی محبت میں سب کچھ چھوڑ کر آگئے یہاں ان کے ساتھ انصاف تو نہیں ہوا لیکن انہوں نے اپنی روایات اور رکھ رکھاؤ کو برقرار رکھا تم خوش قسمت ہو یار کہ اتنے اچھے خاندان سے رشتہ جڑ رہا ہے......''

''یار ایک دو روز میں جینا اور شاہ زیب آنے والے ہیں کیوں نہ ہم یہ تقریب ایک ساتھ منعقد کرلیں دونوں ایک دوسرے کو جانتی ہیں اس طرح مزہ دوبالا ہوجائے گا۔''

مجھے تو اعتراض نہیں ہے تم نواب صاحب سے مشورہ کرلو بلکہ جینا اور زارا کی پسند ناپسند پہ بھی اس بات کا انحصار ہے جینا آتی ہے تو اس کی زارا سے بات کروادیتے ہیں۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔''

دونوں مطمئن ہوکر شطرنج کی بازی کی طرف متوجہ ہوگئے۔

مگ چائے کے دو کپ اور لوازمات ساتھ رکھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

''ارے جینا باجی آپ؟'' سارا حیرت سے کھڑی رہ گئی اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''ارے سارا تم تو ایسے ری ایکٹ کررہی ہو جیسے کوئی گھوسٹ دیکھ لیا ہو...... یہ میں ہی ہوں جینا ......ہٹو راستہ دو......''

''اوہ آئی ایم سوری...... آیئے۔'' جینا اجالا کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئی تو سامنے پھولوں کے پودوں کے پاس کرسی پر بیٹھی زارا بھی حیران رہ گئی ایک دم کھڑی ہوئی اور تقریباً بھاگتے ہوئے اس کی طرف آئی...... دوسرے ہی لمحے وہ ایک دوسرے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے گلے لگی ہوئی تھیں۔

''ماما یہ کون ہیں؟'' اجالا کی پیاری آواز نے سب کو اس کی طرف متوجہ کرلیا۔

''یہ تمہاری خالہ ہیں جانو......'' جینا نے اسے گود میں اٹھا کر سامنے کیا۔

''خالہ کو پاری کرو بیٹا......'' اجالا نے جلدی سے منہ آگے بڑھا کر اسے پیار کیا زارا بے اختیار مسکرا اٹھی۔

''اب آپ بھی پاری کریں نا مجھے......'' زارا نے مسکراتے ہوئے اسے پیار کیا اور محبت سے اسے جینا کی گود سے لے لیا۔

''ہیلو جینا......'' پیچھے سے آواز آئی...... جینا بے اختیار مڑی۔ عالی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جینا بھی معنی خیز انداز سے بولی۔

''تو آخر تم نے ڈھونڈ ہی لیا اسے؟''

''کیسے نہ ڈھونڈتا...... زندگی کی ڈور جڑی تھی میری اس سے......'' وہ دلکشی سے مسکرایا۔

اس کے لیے تمہیں میرا بھی شکر گزار ہونا چاہیے اگر میں اس دن اسے وہاں نہ بھیجتی تو تم اس سے کبھی نہ مل پاتے۔

''یہاں تم غلط ہو جینا خدا نے آسمان پہ ہماری جوڑی بنادی تھی تم نہ ملاتیں تو کوئی اور وسیلہ بن جاتا بہر حال پھر بھی میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

عالی پورے وقار اور سنجیدگی سے بولا

''او کے اگر تم مائنڈ نہ کرو تو زارا کو اس کے کمرے میں لے جاؤں مجھے اس سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

''تم اجازت مانگ رہی ہو...... کمال ہے؟'' عالی خوش دلی سے مسکرایا اور پھر بولا ''ہاں مائنڈ تو کروں گا دل بھی بہت شور مچائے گا لیکن تم بھی کیا یاد کرو گی میری طرف سے اجازت ہے......'' وہ بڑے شاہانہ انداز میں بولا۔ زارا کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ کی کلیاں کھل اٹھیں دل میں محبت کا طوفان سا اٹھا...... خود پہ فخر محسوس ہوا اور عالی پہ غرور۔

کمرے میں آکر دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ زارا نے محسوس کیا کہ جینا بہت بدل گئی ہے وہ غرور اور طنطنہ اب اس کے مزاج کا حصہ نہیں رہا تھا۔

''کیسی ہو جینا؟''

''اب تو بہت خوش ہوں جو چاہا تھا مل گیا من پسند ساتھی بھی اور اتنی پیاری جان سے پیاری بیٹی بھی۔''

''اب سے کیا مطلب ہے تمہارا...... اور یہ ساتھی کیا وہی ہے جس سے ملنے اس شب تمہیں جانا تھا؟''

''ہاں بالکل وہی ہے...... اب سے مراد یہ ہے کہ پچھلے تین سال میں نے جس اذیت میں کاٹے ہیں خدا ہی بہتر جانتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' زارا پریشان ہوگئی۔

''اس رات کے بعد جب میں اس سے ملی بس میری خوشیوں کی وہ آخری رات ثابت ہوئی۔'' جینا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے اپنی ساری کہانی زارا کو سنادی۔ وہ زارا کو جانتی تھی اسے علم تھا کہ اس کے منہ سے اس کے بارے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا جوں جوں زارا سنتی جارہی تھی اس پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور جب اس کی کہانی ختم ہوئی تو زارا نے بے اختیار اسے گلے لگالیا۔

''اوہ جینا...... تم نے اتنی اذیتیں برداشت کیں اور وہ بھی تنہا۔ شاہ زیب بھائی کے بغیر لیکن تمہیں خدا نے تکالیف کی بھٹی میں ڈال کر کندن

بنادیا۔ تمہاری ماں کو تم سے ملادیا...... اتنی پیاری بیٹی عطا کی...... تمہاری شخصیت کو جلا بخشی۔ اب تم ایک بدلی ہوئی جینا ہو...... اور میں تمہیں پسند کرنے لگی ہوں۔''

''پہلے نہیں کرتی تھیں؟''

''سچ کہوں تو کبھی نہیں...... میں تمہیں ایک بگڑی ہوئی مغرور اور بدتمیز امیر زادی سمجھتی تھی کبھی تمہیں پسند نہیں کیا......''

''چلو...... مجھے تمہارے سچ بولنے پر اعتراض نہیں......'' وہ نرمی سے بولی لیکن مجھے خوشی ہے کہ اب میرے بارے میں تمہارے خیالات بدل گئے ہیں اور تم مجھے پسند کرنے لگی ہو......''

''اب تم بدل جو گئی ہو......'' زارا مسکرائی۔

''لیکن اتنا تو مانتی ہو نا کہ ہمیں ایک دوسرے کی وجہ سے اپنی منزلیں مل گئیں خدا کے کام بھی نرالے ہیں نا اس روز اگر تم میری جگہ نہ لیتیں تو عالی سے نہ مل پاتیں۔ اس میں بھی خدا کی حکمت تھی۔ اس نے کسی طرح تم دونوں کو ملوانا تھا تو مجھے وسیلہ بنادیا مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے غصہ میں آکر عالی کو بتایا کہ تم نے اس کام کے بدلے دس ہزار روپے لیے ہیں۔ اس وقت میں بہت اذیت میں تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ جب میں اپنی محبت سے محروم ہوگئی ہوں تو اسے اس کی محبت مل جائے۔''

''مجھے پتہ ہے...... لیکن ایسا ہو جاتا ہے...... تم نے اسے میرا نام نہیں بتایا تو اسے فضہ کے ذریعہ معلوم ہوگیا...... رہی دس ہزار والی بات تو میں نے وہ کلیئر کردی تھی کہ میرا ارادہ تو تھا دس ہزار لینے کا لیکن میں عالی سے اتنی متاثر ہوئی کہ اسی ملاقات میں اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی ایسی صورت میں وہ پیسے لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا...... تو شاہ زیب بھائی سے کب ملاقات کروا رہی ہو۔''

''لو جس بات کے لیے آئی تھی وہ تو بھول ہی گئی۔ چونکہ ہمیں ایک دوسرے کی وجہ سے اپنی محبتیں اور منزلیں ملی ہیں اس لیے میں چاہتی تھی کہ ہماری تقریبات اکٹھی منعقد کی جائیں۔ ایک ہی اسٹیج پر دو دولہا دلہن بیٹھے ہوں۔ ڈیڈی اور انکل جہانگیر تو راضی ہیں انہیں کوئی اعتراض نہیں...... تم بتاؤ کیا کہتی ہو؟''

''انکل جہانگیر کو اس سلسلے میں بابا جانی کی بات کرلینی چاہیے...... مجھے تو کوئی اعتراض نہیں......'' جینا مسکرادی۔

''ایک اور بات ہال کی تمام ڈیکوریشن کا ذمہ میرا ہے کھانا بھی میری طرف سے ہوگا اور یہ تم میری طرف سے شادی کا تحفہ سمجھو۔''

''اس سلسلے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتی یہ بابا جانی اور انکل جہانگیر طے کریں گے لیکن ایک بات سوچ لینا......'' زارا شرارت سے بولی۔

''وہ کیا؟''

سارے لوگ اس دلہن کو ہی دیکھتے جائیں گے۔ تمہاری طرف کوئی توجہ نہیں دے گا۔''

''اچھا یہ بات ہے!'' جینا زارا کی شرارت پر مسکرائی۔

''ایسا ہوا بھی تو تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب میں پہلے والی جینا نہیں رہی...... اتنے بڑے ہجوم میں کم از کم دو آنکھیں تو ہوں گی جو صرف اور صرف مجھے دیکھیں گی...... میرے شاہ زیب کی آنکھیں...... اور مجھے صرف ان کا فرق پڑتا ہے باقی لوگوں کی پروا کسے ہے؟''

''اچھا اتنی محبت کرتی ہو اس سے؟''

''اس سے بھی زیادہ...... تمہارے تصور سے بھی زیادہ...... میں اس کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہوں اور میری کہانی سن کر اس کا اندازہ تو تمہیں ہوگیا ہوگا۔''

''بہت خوش قسمت ہیں شاہ زیب بھائی۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''نہیں میں زیادہ خوش قسمت ہوں!'' جینا مسکرائی اور اب ہمیں چھوڑو اور اپنے عالی کی باتیں کرو...... عالی کا نام سنتے ہی زارا کے چہرے پر خوبصورت شفق کے رنگ پھیل گئے۔ اسی وقت سارا چائے کی ٹرالی گھسیٹتی اندر داخل ہوئی ساتھ میں اجالا بھی تھی جو مسلسل باتوں میں مصروف تھی۔

''جینا باجی آپ کی بیٹی بہت باتونی ہے۔''

''شاید اپنی خالہ پر چلی گئی ہے۔''

''ارے ہاں مجھے پہلے کیوں خیال نہیں آیا اب تو ہم دونوں کی خوب بنے گی کیوں اجالا۔ ہاتھ ملاؤ۔ سارا نے ہاتھ آگے کیا تو اجالا نے اپنا ننھا سا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا تینوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں

☆......☆......☆

ہال کی سجاوٹ قابل دید تھی۔ روشنیوں کا امتزاج پھولوں کی ارینجمنٹس کلاسک تھیں اور اسٹیج پر تو جیسے دنیا جہاں کی رعنائیاں سمٹ کر جلوہ گر ہو گئی تھیں۔ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے اعلیٰ انتظام تھا ظاہر ہے اس پائے کے ہوٹل میں جہاں جواد خاقانی نے اپنی لاڈلی بیٹی اور اپنے عزیز ترین دوست کے بیٹے کے لیے تقریب منعقد کرنی ہو وہ ہر لحاظ سے لاجواب ہی ہوگا۔ سارے مہمانوں کی نظریں اس وقت اسٹیج پر بیٹھے دونوں جوڑوں پر تھیں زارا نے قیمتی کمخواب کے چوڑی دار پاجامے کے ساتھ اصلی ریشم کی نہایت خوبصورت اسٹائل کی فراک زیب تن کی ہوئی تھی۔ فراک پر سونے کے تاروں اور اصلی نوادرات اور موتیوں کا انتہائی نفیس کام تھا...... زارا کے لباس سے ملتی جلتی شیروانی عالی کے جسم پر بالکل فٹ بیٹھی تھی۔ پاجامے اور سلیم شاہی جوتیوں میں اس کی وجاہت ہمیشہ سے زیادہ نمایاں تھی۔ زارا نے زندگی میں پہلی بار میک اپ کیا تھا وہ تو عالی کے دل پر قیامت ڈھا رہی تھی اسے دیکھنے کے بہانے بار بار وہ اس کی طرف جھک کر اس کے کان میں کوئی ایسی بات کہہ دیتا جس سے اس کے چہرے پر شفق سی اتر آتی...... اور مسکراہٹ سے اس کے ڈمپل نمایاں ہو جاتے آج تو دونوں کی خوشیوں کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

دوسری طرف بہترین ڈیزائنر کے تیارہ کردہ خوبصورت کام سے مزین لہنگے سوٹ میں جینا کی خوشیاں اس کے چہرے سے جھلک رہی تھیں۔ شاہ زیب کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ جینا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ دو آنکھیں ایسی ہوں گی جو صرف اور صرف مجھے دیکھیں گی تو اسے کسی اور کی موجودگی کا کوئی فرق نہیں پڑے گا...... اور شاہ زیب کے لیے اس ہال میں جیسے اور کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ ہاں گاہے گاہے وہ نظریں اٹھا کر اپنی پیاری بیٹی اجالا کی طرف ضرور دیکھتا جو اپنے دادا کی گود میں بیٹھی اپنی پیاری پیاری باتوں اور حرکتوں سے سب کا دل موہ رہی تھی۔ دادا کا سیروں خون بڑھ رہا تھا۔ چہرے پہ سکون اور طمانیت کی جھلک تھی کہ آج برسوں پرانی حسرت پوری ہوئی تھی...... شاہ زیب کی بھابیاں بھائی اور بھتیجے موجود تھے وہ گاہے گاہے اسٹیج پر آ کر دونوں کو چھیڑنے سے باز نہ آتے جبکہ بھتیجے تو اس ننھی پری کے اردگرد منڈلا رہے تھے جوان کے خاندان کا نیا اور منفرد اضافہ تھی۔ فری اور زیبی بھی بار بار زارا کے پاس آ کر اپنی خوشی کے اظہار کے طور پر خوب باتیں کر رہے تھے۔ اپنے بھائی کی بیقراریوں کی داستان سنانے سے بھی گریز نہیں کر رہے تھے۔ عالی نے انہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ زارا بہت پیار سے فری اور زیبی سے باتیں کرتی رہی۔ شہری اور زیبی کی دوستی ہوگئی تھی سارا خود بھی بے حد خوبصورت لباس میں تھی۔ جو کہ اس کی دادی کی ملکیت تھا اور جس پر عرصے سے اس کی نظریں تھیں۔ امی جان سے زبردستی نکلوا ہی لیا۔ وہ بھی بار بار آ کر قریب رکھی خوبصورت سجی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جاتی اور شرارتی فقرے چست کرنے سے باز نہیں آ رہی تھی......

نکاح ہو چکا تھا۔ عذرا نے ہیرے کی خوبصورت انگوٹھی زارا کی انگلی میں پہنا دی...... عالی نے خاص طور پر اس انگوٹھی کی فرمائش کی تھی اور بیٹے کی فرمائش وہ کیسے ٹال سکتی تھیں۔ بلال مرزا نے بھی اپنی خاندانی انگوٹھی عالی کو پہنا دی۔

جواد اور ماہا مہمانوں میں گھل مل کر ان کی مہمان نوازی میں مصروف تھے۔ بار ہا ماہا کو اپنے ملنے والیوں کے چبھتے ہوئے فقروں کا سامنا کرنا پڑا جسے انہوں نے خندہ پیشانی سے نظر انداز کر دیا کیونکہ تقریب سے پہلے ہی جواد خاقانی نے سب کو وہ قصہ بتا چکے تھے جو انہوں نے سوچ رکھا تھا اور اب انہیں پروا نہیں تھی کہ کوئی اس پر یقین کرتا ہے یا نہیں انہیں اپنی بیٹی کی خوشیاں چاہیے تھیں جو انہوں نے حاصل کر لی تھیں۔ فواد بھی باپ کے ساتھ ساتھ مہمان نواز ہونے کا ثبوت دے رہا تھا اور جواد بھی اسے بڑے فخر سے اپنے ساتھ ساتھ رکھ رہے تھے کہ وہ کا اپنا لخت جگر ہے...... کبھی مناسب وقت آنے پر سب کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا...... کھانا سرو ہوا...... بہترین سیٹنگ میں بہترین کھانا تھا۔ سب نے ڈٹ کر کھایا اور پھر کافی دیر فوٹو سیشن مکمل ہونے میں گزر گئی۔ آخر سب تھکے ہارے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

سب گھر کے مین دروازے سے اندر داخل ہوئے تو عالی نے زارا کے دوپٹے کا کونا پکڑ کر روک لیا...... اس نے مڑ کر شرمیلی نظروں سے زارا کو دیکھا۔

''تھوڑی دیر لان میں بیٹھیں۔''

''کیوں؟'' وہ آہستہ سے سرگوشی کے انداز میں بولی۔

''تمہیں جی بھر کر اس روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں...... اس من موہنی صورت کو تصور میں ہمیشہ کے لیے سجا لینا چاہتا ہوں......''

وہ جذباتی انداز میں بولا۔ دل تو زارا کا بھی چاہ رہا تھا لیکن بڑوں کی موجودگی کا حجاب تھا کہ وہ کیا سوچیں گے۔

ایسے میں سارا کام آئی۔

''آپ تھوڑی دیر لان میں بیٹھیں میں اندر سب کو سنبھال لوں گی۔ جب تک میں چائے تیار کرتی ہوں۔ سب سمجھیں گے آپ لوگ اندر لباس تبدیل کر رہے ہیں اور یقین کریں میں چائے بنانے میں بہت دیر لگاؤں گی......''

عالی نے تشکر آمیز نظروں سے سارا کی طرف دیکھا۔ وہ اندر کو مڑی تو نہایت محبت سے زارا کا ہاتھ تھام لیا۔

''چلیں؟''

وہ خاموشی سے چل پڑی۔ اس کے ہاتھ کے لمس سے دل دھڑک دھڑک کر دیوانہ ہو رہا تھا۔ دھڑکنوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ آج اس نے وہ پا لیا تھا جس کی خواہش شدت سے دل میں پل رہی تھی۔ اور اس محبوب ہستی کے ساتھ چلتے ہوئے وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھ رہی تھی۔

لان میں بینچ کے پاس کھڑے ہو کر عالی نے تو اسے دونوں کندھوں سے تھام کر عین اپنے سامنے کھڑا کیا۔ اور آنکھوں میں بے پناہ محبت لیے اس کے دلنشیں روپ کو دل میں اتارنے لگا۔ چھوٹی سی بندیا سے اس کی چاندسی پیشانی دمک رہی تھی۔ عالی نے بے اختیار ہی اس کی پیشانی چوم لی...... زارا ساری جان سے کانپ گئی بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''کیا ہوا؟'' عالی محظوظ ہو کر بولا۔

''عالی صرف باتیں کریں...... زبان سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

عمل سے نہیں'' وہ متانت سے بولی تو وہ ہنس دیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج کی رات کتنی حسین کتنی خوبصورت لگ رہی ہے اور ہم کتنے خوش قسمت ہیں کہ خدا نے ہماری خواہشات کو پورا کر دیا ......'' دونوں بینچ پر بیٹھ گئے۔

زارا نے عالی کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں موندلیں۔ عالی بے اختیار ہی بیخود ہو کر مسکرایا۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں اندر جانا چاہیے۔ سب ہمارے منتظر ہوں گے۔''

''اچھا...... میرا خیال تھا تم میرے کندھے پر سونے کا ارادہ کر رہی ہو......''

''نہیں، میں تو خود کو محسوس کر رہی تھی ...... آپ کو محسوس کر رہی تھی کہ کہیں یہ خواب تو نہیں......''

''نہیں زارا ...... یہ ہماری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے...... تین روز بعد ہمیں چلے جانا ہے ...... وعدہ کرو روزانہ یہاں مجھ سے ملو گی ...... اکیلے میں......''

''نہیں میں تو سب کو ساتھ لے کر آؤں گی ......'' زارا شوخی سے بولی......

''اب چلیے ہمیں جلدی سو جانا چاہیے۔ کل زارا اور شاہ زیب کی دعوت ولیمہ میں شرکت کے لیے مری بھی جانا ہے۔''

''اچھا پھر وہی ڈریس پہننا جو میں نے تمہارے لیے خریدا ہے۔''

''جو حکم سرکار...... اب چلیے۔''

''تم نے وعدہ تو نہیں کیا روز یہاں ملنے کا۔''

''او کے ...... وعدہ رہا ...... روز ملوں گی ...... اکیلے میں!'' اس نے اضافہ کیا تو دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دل میں محبت کے دیے جلائے اندر کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆

نوٹ بک میں سانس لیتی خواہش

اک دھواں اسرار کی خوشبو لیے
رات بھر لوبان سے اٹھتا رہا
چل پڑی بادِ بہاری بجھ گئے
ایک ٹوٹی قبر پر کیکر کے پھول

....

دور تک پھیلی پپیہوں کی پکار
ہو کے بادِ صبح کے رتھ پر سوار
نکہتوں کے قافلے چلنے لگے
کوئلوں کی کوک سن کر رو دیے
بادلوں کے جب پرے تو یوں ہُوا
آم کے باغوں میں جھولے پڑ گئے
نگھیوں پر گھر سے نکلے شام کو
دل میں یادوں کا دیا روشن کیے
کیسے کیسے لوگ باغوں کی طرف

....

اور میں تاریک کمرے میں کہیں
لکھ رہا ہوں تنگ آ کر زیست سے
نوٹ بک میں سانس لیتی خواہشیں

○○

شاعر
عطاالرحمٰن قاضی

افسانہ

نتھیا گلی میں گرم کافی

سرد موسموں میں
سرد رویوں کو محسوس کرتی جذبوں کی گرماہٹ لیے ایک خوبصورت تحریر......

آسمان پر اودے اودے بادلوں کا رقص سرسبز خوبصورت لمبے لمبے درخت مسحور کن ہوا قدرت کی

اپنی خوشبو ہوتی ہے وہ انسان کو بہت اپنی محسوس ہوتی ہے قدرت کی یہ خوشبو دھیرے دھیرے برستی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کرنوں میں سمو کر جب محسوس ہوتی ہے تو انسان قدرت کی اس خوبصورتی میں جذب ہوجاتا ہے۔ اس کو ہر طرف قدرت کی نیرنگی محسوس ہوتی ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ میں کیا؟ میری ہستی کہاں! میرے مولا تیرے ہی رنگ ہیں یہ سب۔

شاید اسی سوچ کو میں محسوس کررہی تھی اور اللہ تعالیٰ کا شکرادا کررہی تھی جس نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ میں فطرت کی خوبصورتی اس کے حسن کو محسوس کرسکوں ہر درخت ایک دوسرے سے مختلف۔ کوئی بھی کسی سے نہ ملتا تھا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی اس رنگا رنگ دنیا میں ہر انسان کی شکل عادت سب کچھ ہی علیحدہ ہی پہچان رکھتا ہے پلاسٹک کی سفید کرسی ر بیٹھی ہاتھ میں گرم کافی کا کپ۔ میں سوچتی ہی جارہی تھی۔ میری روح بادلوں کے سنگ رقصاں تھی انجانی سی خوشی نے مجھے جکڑ رکھا تھا اور میں دیوانہ وار رقص کررہی تھی۔ اپنی روح کو اتنا خوش دیکھ کر میں بہت مسرور تھی۔

''میڈم کافی کیسی ہے؟''

میں چونک اٹھی نیلی آنکھوں والا گورا سا گول مٹول دس سال کا بچہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ یہ بچہ...... یہ بچہ...... یہ اسکول کیوں نہیں گیا؟

''ہاں کافی اچھی ہے تم اسکول کیوں نہیں جاتے ہو۔'' میرے سوال پر اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھا میں شرمندہ سی ہوگئی مجھے لگا کہ میں دنیا کی بیوقوف ترین خاتون ہوں۔

''ایک کپ گرما گرم کافی اور لا دو۔''

میں نے شرمندگی سے بچنا چاہا۔ وہ کیفے کی طرف چلا گیا۔ میری نظر اس راستے پر تھی جہاں میرے اپنے لوگ نیچے اتر کر قدرت کی خوبصورتی اور پانی کے جھرنے کی موسیقی سننے گئے تھے۔ ننھیا گلی کی خوبصورتی قدم قدم پر بکھری پڑی تھی میں نے معذرت کرلی اور کیفے کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ کر اب ان کا انتظار کررہی تھی۔

''دھپ'' کی آواز آئی۔ میری ساتھ ہی ہنسی چھوٹ گئی۔ میز پر رکھا میری پوتی کا بسکٹ کا پیکٹ بندر اٹھا کر بھاگ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے ماشاءاللہ فیملی کے سارے بچوں کے ساتھ عامر نے ڈھیروں پھلیاں خرید کر بندر کے پورے خاندان کی طرف پھینک دیں اور خوب انجوائے کیا۔ چھوٹے چھوٹے بندر کے بچے بہت پیارے لگ رہ تھے جو اچھل کر مکئی کے دانوں کی تھیلی کیچ کرتے تھے۔

''میڈم کافی گرم گرم۔''

''بیٹھو۔'' میں نے اس سے کہا وہ زمین پر ہی بیٹھ گیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''نام میں کیا رکھا ہے میڈم......'' میں چونک اٹھی۔

''ارے واہ باتیں بہت اچھی کرتے ہو۔''

میں ہنس پڑی۔

''نام تو بادشاہ خان ہے' میڈم کام نوکروں والا۔''

''بھئی مجھے تو خوشی ہے کہ تم اس عمر میں کما رہے ہو۔ بڑے بہادر ہو بیٹا۔ میں نے اس کی تعریف کی میں نے اسے سو کا نوٹ دیا۔ اس نے واپس کردیا۔

''رکھ لو کام آئے گا۔''

''ہم بھیک نہیں لیتا'' وہ بولا۔

''یہ بھیک نہیں ہے...... میں خوشی سے دے رہی ہوں۔''

''تمہیں پتہ ہے آج کی بڑی خبر کیا ہے؟''

''جی ہاں۔ ایک چور چلا گیا دوسرا چور آجائے گا۔'' وہ بولا

''ارے واہ تم تو بہت سمجھدار ہو۔'' میں نے اسے مانوس کرنے کی مزید کوشش کی۔

''میڈم آپ نے پوچھا تھا میں اسکول کیوں نہیں جاتا تو یہ دنیا بھی ایک اسکول ہے۔ بابا مرگیا۔ چاچا نے گھر سے نکال دیا۔ ہم نے جھونپڑی ڈال لی۔ بڑی بہن کو بڑا خان اپنے گھر لے گیا۔ ماں' میں اور میری دو بہنیں۔ ماں دوپٹوں پر کڑھائی کرتی ہے۔ میں کافی شاپ پر ہوتا ہوں۔ مالک بہت اچھا ہے۔ شام کو ہم کو پڑھاتا ہے اور میں مالک کا ٹی وی بھی دیکھتا ہوں۔ کون آتا ہے' کون جاتا ہے؟ ہم کو کیا ہم نے تو کام کرنا ہے ہمارے لیے اسکول تھوڑی ہیں۔ کیا یہ جانے والا چور اور آنے والا چور۔ میری ایک بہن کو واپس دلا سکتا ہے۔ نہیں نا۔''

''تم چور کیوں کہہ رہے ہو۔'' میں نے پوچھا

''اگر وہ چور نہ ہوتے تو ملک کو اچھا بنا دیتے۔ میرا بابا خون تھوک تھوک کر نہ مرتا۔ اس کا علاج ہوتا۔ میں اور میری بہنیں اسکول جارہی ہوتیں۔ ماں محنت نہ کرتی۔ بولو۔ میڈم ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کب تک ہوگا۔''

میں چپ ہوگئی۔ گرم گرم کافی ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ میرے اپنوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اوپر آرہے تھے۔ نیچے خوبصورت مسجد بھی تھی اس کو بھی دیکھ کر آرہے تھے۔ میں اس بچے کو کیا جواب دیتی۔ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کاش اتنے خوبصورت موسم کے اس دیس میں ہسپتال اور اسکول ہوتے۔ انسان، انسان ہوتا۔ انصاف ہوتا۔ کاش!

''سنو۔'' میں نے اس بچے کو اپنے ساتھ لگالیا۔ ''انشاءاللہ رات کے بعد دن ضرور آتا ہے۔ یہاں کے حالات بھی بدل جائیں گے۔ یہاں اسکول بنیں گے تم نہ سہی تمہارے بچے انشاءاللہ ضرور اسکول جائیں گے۔ تمہاری ماں کا بھی علاج ہوگا، جب انصاف کا سورج طلوع ہوتا ہے تو ہر چیز پر نور چھا جاتا ہے۔''

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ حیران پریشان مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے زبردستی پیسے اس کے ہاتھ میں رکھے۔

''اپنی ماں سے کہنا آپ کی بہن نے دیئے ہیں۔'' جلدی سے بیگ اٹھا کر میں اپنوں کے ساتھ آ کھڑی ہوئی جن کی گاڑیاں اپنے اپنے مسافروں کو ساتھ لے جانے کے لیے تیار کررہی تھیں۔ میں سوچ رہی تھی کہ ہم سب مسافر ہیں۔ کب کوچ کا وقت آجائے؟ کون جانے۔ کاش! انصاف کا سورج......؟؟؟ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا میری نظر اس بچے پر ٹھہر گئی۔

اس کے چہرے پر بہت خوبصورت مسکراہٹ تھی میرا دل خوش ہوگیا اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے سلام کا جواب دے رہا تھا۔ اس نے وہ بند مٹھی مجھے دکھائی جس میں میں نے کچھ رقم زبردستی اسے تھما دی تھی، وہ مٹھی ہوا میں لہرائی اور پھر اس نے نیچے کھائی کی طرف کھول دی۔ اپنے ہاتھ جھاڑے اور مسکراتا ہوا اپنے کیفے کی طرف بڑھ گیا۔

میرے دل پر انجان سا بوجھ سوار ہوگیا ننھیا گلی کی ساری خوبصورتی غائب ہوگئی، بادلوں کا رقص تھم گیا اور میری آنکھ میں آیا ہوا آنسو میری پلکوں کی دہلیز پر بیٹھا مجھ سے پوچھ رہا ہے:

تمہارے دل پر بوجھ کیوں ہے
تمہارے دل پر بوجھ کیوں ہے

☆☆☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

عزت دار

نگی نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ جب کمائی اپنی ہی کھانی ہے تو کسی بے غیرت کو حصے دار کیوں بناؤں...

نگی کا رشتہ کیا آیا اماں کو لگا کہ ان کے سارے مسائل ہی حل ہو گئے حالانکہ دادی نے انہیں سمجھایا بھی:

''شیدہ! ابھی کون سی نگی کی عمر نکلی جا رہی

ہے۔ اٹھارہ ہی کی تو ہوئی ہے۔'' دادی نے کہا۔

''ہاں، ہاں اٹھارہ ہی کی ہوئی ہے اور اس کی عمر کی لڑکیاں چار چار بچوں کی مائیں بن چکی ہیں۔'' اماں نے طنز کیا۔

''ہاں، لڑکیاں نہ ہوئیں کتیاں، بلیاں ہو گئیں کہ چار چار سالوں میں چار، چار بچوں کی مائیں بن گئیں۔'' دادی نے ان کے طنز کا جواب طنز سے ہی دیا۔

''اماں! تو مجھے اپنا مسئلہ بتا دے تیرا مسئلہ کیا ہے۔ کیا شادی نہیں کرنی ہے اس کی۔ گھر بٹھا کر رکھنا ہے۔'' اماں نے جل کر کہا۔

''کوئی مسئلہ نہیں ہے میرا شیدہ! نگی کی شادی کرنی ہے اسے کنویں میں دھکا نہیں دینا۔''

''صلو کی شہرت کچھ اچھی نہیں ہے۔ اب سے کچھ دن پہلے تک ہر دوسری لڑکی اس کی بغل میں نظر آتی تھی اور جن جن لڑکیوں کو بھی اس نے چھوڑا وہ آج اسے گالیاں ہی دیتی ہیں۔ اب عمر بڑھ گئی ہے اور شہرت بھی خراب ہے۔ تو کوئی لڑکی گھاس نہیں ڈالتی اس لیے اسے شادی کی سوجھی ہے۔ ذریعہ معاش بھی کچھ نہیں ہے مگر پیسہ پھر بھی ہر وقت ہوتا ہے اس کے پلے۔ شیدہ! پتہ نہیں کیوں میرا دل نہیں ٹھکتا...... تو نہ کردے صلو کو......'' دادی نے اماں کو سمجھایا۔

''ہاں منع کردوں اور تیری پوتری کے لیے کسی شہزادے کا انتظار کروں...... نا اماں مجھے تجھے یہ سب اپنی پوتری کی واری کیوں یاد آرہا ہے۔ میری واری کیوں یاد نہ آیا؟ اس لیے کہ میں یتیم تھی میرے ماں پیو مر کھپ گئے تھے۔ میرے پیچھے کوئی رونے والا نہ تھا اس لیے اپنا نکھٹو نکما نشئی بیٹا میرے پلے باندھ دیا کہ تیرے در پر تو پڑی رہوں تیرے بیٹے کا پہلو بھی آباد کردوں۔ حالانکہ مفت میں نہیں پڑی تھی تیرے در پر۔ تیرے ساتھ گھر گھر جا کر اپنی ہڈیاں گھساتی تھی تو دو وقت کی روٹی کھاتی تھی۔''

اماں نے سارا الزام دادی پر ڈال دیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں دادی کی بولتی بند ہو جاتی تھی کہ کپڑا ہٹاتیں تو اپنا ہی پیر ننگا ہوتا تھا۔ ورنہ یہ تو نگی بھی جانتی تھی کہ ابا سے شادی دادی کی نہیں خود اماں کی خواہش پر ہوئی تھی۔ کہ اماں کی عمر کی عورتیں آج تک ابا کو نہیں بھولی تھیں، ابا تھا بھی تو رج کے سوہنا۔ اور وہ خود بھی ابا کا پر تو تھی۔ رج کے سوہنی۔ اور رہ گئی اماں تو وہ تو قبول صورتی سے بھی کم شکل تھی اماں کی عمر کی خالہ چاچی ٹائپ عورتیں آج بھی اماں کو کوسنے دیتی تھیں کہ اس کے گھر میں رہی تو ڈائن جیسی شکل کے باوجود اسے کہیں دیکھنے نہ دیا۔ اور یہ سچ بھی تھا۔ دادی بہر حال بہو بیٹے کی ٹکر کی لانی چاہتی تھیں مگر بھانجی نے یہاں انہیں منہ کے بل گرا دیا اور آج سارا الزام بھی انہیں کے کھاتے میں آتا تھا۔

''ہاں مگر اس نے تیرے سوا کسی کڑی کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔'' دادی کا لہجہ کمزور تھا۔

''ہاں مگر کما کر بھی نہیں کھایا اور اماں آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی تو نے خوب کہی۔ ہیروئن کے نشے نے اسے کسی طرف آنکھ اٹھانے جوگا چھوڑا ہی کب تھا۔ مجھے بھی اپنی ضرورت کے وقت ہی دیکھتا تھا۔''

اماں ایسے وقتوں میں اتنی بدلحاظ ہو جاتی تھی کہ نگی اور دادی کا دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں نہ اپنے اور دادی کی عمر اور رتبے کا خیال کرتی نہ نگی کی عمر کا۔ بقول دادی ان کے منہ کے آگے خندق تھی۔ انہیں بس بولنے سے مطلب تھا سامنے کون ہے انہیں فکر نہیں ہوتی تھی۔

☆......☆

اماں بھی کیا کرتیں بچپن سے کمار ہی تھیں۔ ماں باپ بچپن میں ہی گذر گئے۔ خالہ نے آغوش

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

محبت میں سمیٹ تو لیا مگر ان کے حالات تلے تھے سو وہ بھی خالہ کی مدد کو کمر بستہ ہوگئیں محبت ہوئی تو وہ بھی ابا جیسے بندے سے جو تھے تو رج کے سوہنے مگر تھے نکھٹو کاہل اور نشئی۔

اماں نے اپنی محبت میں ابا کی ضروریات پوری کرنی شروع کیں تو ابا نے بھی اپنی غرض کے لیے اس محبت کو قبول کرلیا۔ اماں اسی میں خوش ہوگئی۔ پھر ابا اماں کو نگی کا تحفہ دے کر اپنے نشے کے ہاتھوں ختم ہوگیا۔

اماں کو اس بات کا بھی قلق تھا کہ جب اتنی جلدی ہی ابا کو جانا تھا تو نگی کیوں دنیا میں آئی۔ کم از کم اگر وہ اکیلی ہوتی تو دوبارہ گھر بسا لیتی۔ اماں کو اپنی کم صورتی کا احساس تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کوئی بھی مرد کم صورت کماتی ہوئی بیوہ کو تو گھر بسا سکتا ہے مگر کسی دوسرے مرد کے بچوں کی ماں کو نہیں اور ان کے طبقے میں تو یہ ناممکنات میں سے تھا۔ سو اماں دادی تو اسے پالنے کے لیے کماتی رہی اب وہ تھک چکی تھی چڑچڑی ہوگئی تھی بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ نگی کی خوبصورتی سے بھی خائف تھی۔ کام پر لے جانے سے بھی ڈرا کرتی تھی۔ بیگموں کی اترنیں پہن کر شہزادی لگا کرتی تھی۔

اور وہ ان مردوں کی نظروں سے بچپن سے باخبر تھی۔ وہ اس کی کم صورتی کے باوجود جب اسے نظروں سے نگلنے کی کوشش کرتے تھے تو نگی تو بس اس سے آگے وہ سوچ ہی نہ پاتی تھی اور نگی کو اپنے پروں میں چھپا رکھا تھا۔

اب تک کئی رشتے آئے مگر وہ سب کو منع کرتی رہی اب صلو پر اس کا دل ٹھکا کہ نگی کی طرح نہ سہی مگر خوبصورت گھبرو جوان تھا۔ اور پیسے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اب تک آنے والے کسی بھی رشتے پر دادی کو اعتراض نہیں تھا مگر اس رشتے پر انہیں اعتراض تھا۔ اماں اور دادی کی روز بحث ہوتی تھی مگر نگی جانتی تھی کہ اماں وہی کرے گی جو اس نے سوچ لیا ہے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔

☆......☆

صلاح الدین عرف صلو کا کردار کچھ مشکوک سا تھا۔ اسے اس کے چچا نے پالا تھا بچپن ہی سے انہوں نے اسے مار پیٹ کر انسان بنانے کی کوشش کی تھی اب بنا، یا نہیں یہ اللہ جانے۔ ہاں کچھ عرصے پہلے تک علاقے کی ہر لڑکی سے اس کا افیئر چل چکا تھا جو کچھ ہی عرصے میں ختم ہوجاتا تھا اور ہر سابقہ لڑکی اسے بددعائیں اور کوسنے دے رہی ہوتی تھی۔

دادی کو یہ بھی ڈر تھا۔

''شیدہ! یہ بھی تو سوچ صلو کتنی بددعاؤں میں ہے۔ کیا پتہ کب کسی کی بددعا لگ جائے۔'' دادی نے سمجھایا۔

''اری اماں! جن کے لیے انگور کھٹے ہوں وہ ایسے ہی بددعاؤں پر اتر آتی ہیں اور چکر چلانا اور بات ہے۔ شادی کرنا اور بات۔ راجو کو بھی تو علاقے کی ساری لڑکیاں کوسنے بددعائیں دیتی تھیں جب وہ مجھ سے شادی کر رہا تھا تو کیا وہ برا تھا؟ اماں نے بات ہوا میں اڑائی۔

''وہ بات اور تھی یہ بات اور ہے۔ شیدہ تو دونوں کا فرق سمجھ۔ اور اگر لڑکیاں بددعائیں دیتی تھیں تو وہ زیادہ جیا بھی کب؟'' دادی نے کہا تو اماں کی زبان لمحے بھر کو رک گئی تھی۔

''اسے بددعائیں نہیں نشہ چاٹ گیا تھا اماں۔'' اماں کا لہجہ سپاٹ تھا اور دادی چپ ہوگئیں۔

''بہرحال اماں اب تو کچھ بھی ہے میں نے اگلے جمعہ کی تریخ دے دی ہے۔'' مبارک دن ہے مبارک ہی ثابت ہوگا۔''

اماں نے دوٹوک لہجے میں کہا تو دادی چپ کر گئی اور پھر اماں نے جو چاہا وہ کرلیا۔

☆......☆

اس کی شادی صلو سے ہوگئی۔ صلو اس سے عمر میں تقریباً ڈبل تھا مگر وہ شادی کے بعد خوش تھی گو کہ اس نے کبھی خواہشات پالی نہیں تھیں مگر یہاں تو بن کہے ہی سب مل رہا تھا۔ وہ جو بچپن سے پتلی دال اور سبزی کی عادی تھی اسے صلو ہوٹلوں میں کھانا کھلاتا خوب شہر بھر کی سیر بھی کراتا۔ وہ تو دنوں میں اتنی حسین ہوگئی کہ اماں اور دادی تو حیران رہ گئیں اور ایسے ہی میں اماں تو تفاخر سے گردن اکڑا لیتی مگر دادی سوچ میں پڑجاتیں۔

☆......☆

اسی طرح خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے جھولتے ڈیڑھ مہینہ گذر گیا۔ ایک دن نگی نے لگاوٹ سے پوچھا۔

''تم کماتے نہیں ہو پھر یہ پیسہ کہاں سے آتا ہے صلاح!'' وہ اور لوگوں کی نسبت صلو کے بجائے اسے صلاح کہتی تھی۔

''اور ہماری شادی کو ڈیڑھ ماہ ہوگیا ہے تمہارے پیسے ختم نہیں ہوئے کیا کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگا ہوا ہے۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''ہاں پہلے نہیں تھا اب تو قارون کا خزانہ ہی ہاتھ میں سمجھ۔'' وہ لاپروائی سے بولا۔

''مطلب؟'' وہ حیران ہوئی۔

''مطلب وطلب کو چھوڑو۔ کل تیار رہنا میرے ایک دوست کے گھر دعوت ہے۔'' اس نے بغور نگی کے حسین و معصوم چہرے کو دیکھا۔

''ضرورت ہو تو بیوٹی پارلر کا چکر لگالو۔'' صلو نے کہہ تو دیا مگر نہ یہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور نہ ہی نگی نے کوئی رسپانس دیا۔

''اچھا کس دوست کے گھر دعوت ہے۔''
اس کے لہجے میں بلا کا اشتیاق تھا۔

''خود ہی دیکھ لینا کل......'' صلو کی لاپروائی عروج پر تھی۔

''میں کپڑے کون سے پہنوں۔'' وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کپڑے صلو کی پسند کے ہی پہنتی تھی۔

''کپڑے میں کل تجھے نئے لاکر دوں گا۔''
اس نے یہ کہہ کر جیب سے اپنا وائلٹ نکالا اور رقم چیک کرنے لگا۔

''مگر کیوں ابھی شادی کے سارے ہی کپڑے نئے ہیں۔'' وہ حیرت سے صلو کو دیکھنے لگی۔

''ہاں مگر ان کے اسٹینڈرڈ کے مطابق نہیں ہیں۔'' وہ اکتا کر بولا۔

''کن کے......؟ ایسے کون سے دوست ہیں صلاح! تیرے دوست ہیں...... تیرے ہی جیسے ہوں گے۔'' وہ اب بھی حیرت کے جھٹکے سے باہر نہیں نکلی تھی۔

''چہ! تو کس بحث میں پڑ گئی کہا تو ہے کل مل لینا۔'' صلو نے باقاعدہ چڑ کر کہا۔

''چل اب جلدی سے اٹھ حلیہ درست کر گول گپے کھانے چلتے ہیں۔'' صلو نے کہا تو وہ سوچتی ہوئی تیار ہونے چل دی۔

سب سے پہلے صلو اسے ایک پارلر لے گیا جہاں صرف اپر لپس، آئی بروز، فیشل اور ہیر کٹنگ نے اسے اپسرا روپ دے دیا۔ صلو نے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

''ارے! تو تو بالکل میم دکھتی ہے۔ سچ بتا شیدہ خالہ نے تجھے گود تو نہیں لیا تھا تو ان کی بیٹی تو لگتی ہی نہیں ہے۔'' اور وہ بے طرح شرما گئی۔

''صلاح! میرا ابا بہت خوبصورت تھا میں اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کے جیسی دکھتی ہوں۔'' وہ شرما کر بولی۔

''تیرا ابا اتنا ہی خوبصورت تھا تو شیدہ خالہ سے کیسے شادی کرلی اس نے؟'' اس کے لہجے میں تمسخر تھا اور وہ برامان گئی۔

''صلاح! شکل سے کیا ہوتا ہے۔ عورت کی محبت اور وفا دیکھی جاتی ہے۔'' اس کا لہجہ برہم تھا جسے صلو نے محسوس کرلیا۔

''ارے ارے ناراض کیوں ہوتی ہو۔ میں تو مذاق کررہا تھا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا تو وہ بھی مسکرادی۔

اس دن صلو نے اسے گول گپے اور چپلی کباب کھلائے۔ سمندر پر لے گیا، بن قاسم پارک کی سیر کرائی۔

☆......☆

اگلے دن وہ صبح سے ہی پرجوش تھی اس نے گھر کا سارا کام صبح ہی صبح میں کرلیا۔ دوپہر کے لیے کھانا بھی پکالیا۔ صلو صبح سے ہی کہیں نکلا ہوا تھا ابھی تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

دوپہر میں اس نے بہت انتظار کے بعد کھانا کھایا اور کچھ دیر کے لیے سوگئی۔ صلو کی واپسی شام میں ہوئی۔ وہ اس کے لیے ریڈ اور گرے کمبینیشن کی ہلکے کام والی بہت خوبصورت ساڑھی لایا تھا۔ ساتھ ہی میچنگ جیولری اور سینڈلز بھی تھے اور موتیے کے گجرے اور کنگن بھی۔

''ارے یہ تو خوبصورت ہے۔ بہت بہت بہت زیادہ۔'' وہ ساڑھی کی ملائمت کو ہاتھ سے محسوس کرتے ہوئے بولی جس پر ہلکا سا کام تھا۔ ''کتنے کی ہے؟'' وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

''تو آم کھا پیڑ کیوں گن رہی ہے۔ بس اچھی طرح تیار ہونا رات دس بجے چلنا ہے۔'' وہ بول کر بستر پر دراز ہوگیا۔

''دس بجے زیادہ ٹائم نہیں ہوجائے گا۔'' وہ بولی۔

''نگی تو بحث بہت کرتی ہے۔ اگلے نے دس بجے بلایا ہے تو میں تجھے پہلے سے لے جا کر بٹھا دوں۔'' وہ چڑ گیا تو نگی خاموش ہوگئی اور کمرے سے باہر نکل کر چلی گئی۔

صلو نے اسی کو غنیمت جانا اور چادر اوڑھ کر سر پر تکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ ساتھ ہی آواز لگانا نہیں بھولا۔

''نگی! مجھے نو بجے اٹھا دینا اور تو بھی ساڑھے نو بجے تک ریڈی رہنا۔'' نگی نے مڑ کر دیکھے بنا سر ہلایا۔

☆......☆

نگی خود بھی اس تقریب میں جانے کے لیے بے چین تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کیسے لوگ ہیں جہاں جانے کے لیے صلو نے اتنا اہتمام کیا ہے۔ بیوٹی پارلرز تو اس نے کبھی باہر سے بھی نہیں دیکھے تھے ان کے علاقے میں پارلر کا کیا کام اور صلو نے آرام سے لے جا کر اسے پارلر میں بٹھا دیا تھا اور پھر مٹھی بھر پیسے بھی دیے تھے۔

اور اب بھی جو خریداری وہ کر کے آیا تھا۔ وہ بھی دس سے پندرہ ہزار تک کی تو ضرور تھی۔ ساڑھی پر ہلکا اور نفیس کام ہوا تھا نازک سنڈریلا سے جوتے اور نفیس نازک سی جیولری۔ گجرے البتہ بہت گچھے ہوئے بنے ہوئے تھے۔

اپنی تیاری کا سوچ سوچ کر اسے گدگدی سی ہونے لگی تھی۔ آج تو صلاح کی خیر نہیں وہ من ہی من میں سوچ کر مسکرا رہی تھی۔ اور کل سے پارلر سے آ کر تو وہ خود بھی حیران تھی کہ کیا واقعی وہ اس قدر حسین ہے۔

ایک تو پارلر میں آئنوں اور لائٹس کی ارینجمنٹ اتنی شاندار تھی کہ وہ تو آئینے میں نظر آتے

اپنے ہی عکس کو دیکھ کر مبہوت ہوگئی تھی اور باہر آئی تھی تو صلاح کتنی ہی دیر کچھ کہے بنا اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا اور وہ تفاخر سے مسکرادی تھی۔ اور صلاح بہت عجیب سے پراسرار سے انداز میں مسکرایا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے یہ مسکراہٹ بڑی شیطانی سی لگی تھی۔

☆......☆

صلاح الدین عرف صلو کا باپ ٹی بی کا مریض تھا۔ جب وہ مرا تو صلو صرف پانچ سال کا تھا مگر اس کا باپ جاتے جاتے بھی اس کی ماں کو بھی ٹی بی کا تحفہ دے گیا اور وہ سال بھر کے اندر ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئی۔

تب اسے اس کے چچا نے سنبھالا۔ چچا کے بیٹے کی خواہش میں پانچ بیٹیاں تھیں۔ چچا چچی نے یہ سوچ کر کہ چلو ایک بیٹی تو ٹھکانے لگے گی۔ صلو کو انسان بنانے کی ٹھانی مگر صلو انسان بن کر نہ دیا۔ نہ تو اس نے پڑھ کر دیا حالانکہ چچا نے اپنی کسی بیٹی کو اسکول کی شکل بھی نہ دکھائی تھی مگر وہ چاہتے تھے کہ صلو کم از کم میٹرک کرلے تو کوئی اچھی سی لکھا پڑھی والی جاب کرلے گا مگر نہ جی کوئی ہنر بھی سیکھ کر نہ دیا کہ طبیعت سے کاہل، ہڈحرام، نکما اور کام چور تھا۔

چچی ان کی پانچوں بیٹیاں اور چچا چیخ چیخ کر مرجاتے مگر وہ کوئی معمولی سا کام بھی نہ کرتا۔ چچا چچی اپنی غرض کے لیے اسے برداشت کررہے تھے اور پانچوں لڑکیاں اس کی مردانہ وجاہت پر فدا تھیں سو کام چل رہا تھا۔

مسئلہ تو جب کھڑا ہوا چچا کی بڑی لڑکی نے چودھویں سال میں قدم رکھا۔ اور چچا نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور اسے صفاچٹ انکار کردیا۔

''نہیں چاچا! مجھے نہیں کرنی سونی سے شادی۔ وہ تو میری بہن ہے۔'' جسے اشاروں کنائیوں سے سیٹ کررکھا تھا وہ اچانک ہی آج بہن بن گئی تھی۔

''کوئی بات نہیں سونی نہ سہی کوئی اور سہی۔ تو پانچوں میں سے جس سے چاہے شادی کرسکتا ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' چاچا نے فراخدلی تے سونی کے دل کو دونیم کیا۔

''اوہو! چاچا تو سمجھتا کیوں نہیں ہے۔ یہ سب میری بہنیں ہیں۔'' وہ چڑ کر بولا۔

''او پتر! نہیں نہیں چچیری بہنیں ہیں ان سے شادی جیز (جائز) ہے۔'' چچا نے سمجھا شاید اس کے ذہن میں مذہبی گتھی غلط پھنس گئی ہے۔ سو اسے سلجھایا۔

''او چاچا! جائز ناجائز کا مجھے نہیں پتہ۔ پر مجھے تیری کسی کڑی سے شادی نہیں کرنی۔'' وہ بیزاری سے بولا تھا۔

''کیوں؟'' یہ کیوں چچی کی طرف سے آیا تھا اور خاصا تلخ تھا اس کا اندازہ تو اسے فوراً ہوگیا تھا۔

''چاچی! کبھی اپنی کڑیوں کی شکل دیکھی ہے۔ چجتی ہیں وہ میرے ساتھ۔'' اسے اپنی شکل، صورت و شخصیت کا بڑا گھمنڈ تھا اور اس زعم میں تھا کہ چچا، چچی جو اس کے ناز اٹھاتے ہیں، کزنز جو اس کے گرد گھومتی ہیں وہ اس کی شکل و صورت کی بنا پر ہے مگر اگلے ہی لمحے وہ جان گیا کہ وہ غلط ہے۔ چچی نے اٹھ کر دو زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر مارے۔

''چل اٹھ نکل یہاں سے۔ میں نے کوئی یتیم خانہ نہیں کھول رکھا ہے۔ میری بیٹیوں کا حق کھا کر نوکرانیوں کی طرح کام لے کر کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چجتی نہیں۔ سہی کہتا ہے تیرے جیسے ہڈحرام کے ساتھ بھی کوئی عورت جچے گی۔ اب نکل یہاں سے کما کر لائے گا تو دو وقت کی روٹی ملے گی ورنہ کہیں اور ٹھکانہ کرلے۔''

چچی نے اسے دھکے مار مار کر باہر نکال دیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

اس نے گلہ آمیز نظروں سے چچا کو دیکھا جس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

اور پھر اس کی زندگی کا مشکل ترین دور شروع ہوگیا۔ پڑھا لکھا تو تھا نہیں کہ کوئی لکھا پڑھی کی کم محنت والی جاب مل جاتی۔ ایک دکان پر مکینک لگ گیا وہ بھی کیونکہ کام سیکھ رہا تھا تو پیسے اور بھی کم تھے۔ دن بھر گاڑیوں پر جھکے جھکے اور ان کے نیچے لیٹے لیٹے کمر دکھنے لگتی تھی۔ کپڑے تیل، مٹی، گریس اور کالک سے لتھڑ ہوتے تھے۔ صبح سے شام تک کام کرتے کرتے اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہوتا تھا اور گھر آ کر صرف آرام کی طلب ہوتی تھی۔

مگر اب آرام اس کے نصیبوں سے رخصت ہوگیا تھا۔ پہلے چاچا کے گھر میں جو دامادوں والا پروٹوکول ملا کرتا تھا وہ تو اب خواب وخیال ہو چکا تھا۔ پہلے اس کی ایک آواز پر چاچا کی کم از کم تین بیٹیاں بھاگی چلی آتی تھیں۔ اب وہ کتنا ہی پکارتا ایک بھی نہیں آتی تھی۔ وہ تو اس کی بات سننے کی بھی روادار نہیں تھیں کام کیا کرتیں۔ صبح میں ایک سوکھی روٹے کالی چائے کے ساتھ۔ دن کا کھانا بھی نہ ہونے کے برابر ملتا تھا۔ دکان پر اور رات میں ناکافی کھانا جو اس کے لیے بچایا جاتا تھا اور اسے خود نکالنا اور برتن دھونے پڑتے تھے کہ اس کے آتے ہی چاچی کا حکم نامہ شروع ہوجاتا تھا۔

''خود کھانا نکال کر کھالے اور ہاں برتن دھو دینا۔'' اور وہ بے دلی سے روکھا سوکھا کھا کر برتن دھودیتا۔ اس ناکافی خوراک سے جو کہ اسے خود ہی محنت کر کے کھانے کو مل رہی تھی وہ دنوں میں گھلنے لگا کبھی کبھی اسے خود پر ترس آتا اور کبھی بہت شدید غصہ کہ کیا ضرورت تھی اچھی بھلی آرام دہ زندگی کو ٹھوکر مارنے کی۔ اچھی بھلی زندگی تھی آرام دہ۔ چاچا کی کسی بھی بیٹی سے شادی کرلیتا تو آج یوں خوار نہ ہورہا ہوتا۔ بیوی محبت کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ بیوی تو ضرورت ہے۔

اسی دوران چاچا نے سونی کو نپٹا دیا۔ اپنے ہی جیسے لوگوں میں اور سونی گلہ آمیز روتی نگاہوں سے سسرال سدھاری۔ چاچا کی بیٹیاں بدصورت یا بری شکلوں کی نہیں تھیں۔ وہ قبول صورتی سے بھی آگے کی چیز تھیں مگر وہ بیوی خود سے زیادہ حسین چاہتا تھا۔

چاچا کی جوہی کو صلو نے اپنے ساتھ کام کرنے والے فرحان کے گھر والوں کو دکھایا تو وہاں بات بن گئی اور یوں جوہی بھی ٹھکانے لگی۔ اب اس کی سزائیں تخفیف ہوگئی تھی۔ مراعات مکمل طور پر تو نہ ملیں، سختی کچھ کم ہوگئی تھی۔

کپڑے اب بھی اسے چھٹی والے دن خود ہی دھونے پڑتے تھے ہاں اب برتن دھونے کا آرڈر نہیں ملتا تھا۔ کسی کسی پکار پر کوئی نہ کوئی آ ہی جاتا تھا۔ کھانے میں بھی کچھ بہتری آ گئی تھی اور جبکہ وہ کام سیکھ چکا تھا تو اب تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی۔

☆......☆

وہ روزانہ جس وقت دکان پر جانے کو نکلتا تھا اسی وقت پڑوس کی عاشی بھی نکلا کرتی تھی وہ کسی دواؤں کی کمپنی میں پیکنگ گرل تھی۔ اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔ اور جاب کی وجہ سے اس علاقے کی لڑکیوں سے کچھ الگ بھی دکھائی دیتی تھی اور اکثر وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرادیا کرتے تھے۔ یہ مسکراہٹوں کے تبادلے کب پسندیدگی میں ڈھلے ان کو اندازہ نہ ہوسکا مگر اب کچھ ٹائم وہ دونوں ایک ساتھ گزارنے لگے تھے کبھی کسی پارک یا تفریحی مقام پر۔ صلو کو تو سارے پیسے حساب کتاب کے ساتھ چاچی کے ہاتھ پر رکھنے ہوتے تھے مگر عاشی کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اوور ٹائم لگا کر زائد

پیسوں سے کبھی باہر کچھ کھلانے اور صلو کو چھوٹے موٹے تحفے دینے کی عیاشی کرلیا کرتی تھی۔

عاشی سے صلو نے بہت بٹورا تھا اور پھر اسے لڑکیوں سے بٹورنے کی عادت پڑ گئی۔ اس کے بیک وقت کئی کئی لڑکیوں سے افیئر ز چلنے لگے اور یہ افیئر ز اپنے علاقے اور علاقے سے باہر اچھی فیملیز کی لڑکیوں سے بھی تھے۔

اب کسے فکر تھی نوکری کی۔ وہ لڑکیوں کو اپنی مجبوریوں کے دردناک قصے سنا کر رقمیں وصول کرنے لگا جو کہ بڑی تو نہ ہوتی تھیں ہاں اس کی ضروریات پوری کرنے کا کافی تھیں اس نے صحیح معنوں میں اپنی صورت کو کیش کروانا شروع کردیا تھا اب وہ گھر کو بھی سرائے سمجھتا جب جی چاہتا آتا جب جی چاہتا چلا جاتا۔ چاچا' چاچی کو اس کی ذات سے صرف اس سے ملنے والے پیسے کی حد تک مطلب رہ گیا تھا۔ اب تو وہ نالی کو بھی بیاہ چکے تھے صرف نوشی اور عرشی بچی تھیں۔ سو صلو سے ان کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہی رہ گئی تھی۔

وہ بھی ایک عام سا دن تھا۔ اس دن عاشی سے اس کی بڑے دن بعد ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اس سے اس کی بے وفائی کا گلہ کررہی تھی اس کے کم ملنے پر اس سے لڑ رہی تھی۔ شہر کے حالات آج کچھ خراب تھے صبح سے کشیدگی تھی اور اب تو شام رات سے گلے مل رہی تھی۔ ٹرانسپورٹ دوپہر سے ہی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور جب وہ دونوں بات چیت کر کے سڑک پر آئے تو ہو حق تھا۔ پرائیویٹ کے علاوہ سڑکوں پر کوئی ٹرانسپورٹ نہیں تھی اور وہ بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور وہ دونوں گھر سے خاصی دور تھے۔ یہ سب دیکھ کر عاشی گھبرا گئی۔

''صلو آج تو بے بے مجھے قتل ہی کر ڈالے گی۔ وہ پہلے میری طرف سے مشکوک ہے۔'' عاشی نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

''تو خوامخواہ ڈر رہی ہے۔ آج تو بہانہ بھی مضبوط ہے۔ حالات کی خرابی کا۔'' صلو نے اسے تسلی دی۔

وہ دونوں مستقل چل رہے تھے کہ اگر کوئی مدد مل جائے تو گھر جاسکیں۔

☆......☆

اچانک ایک کار ان کے پاس آ کر رکی جس میں تین لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ کار اور ان تینوں کے لباس ان کی امارت اور اچھی فیملیز سے تعلق کا اعلان کررہے تھے۔

''سنیے مسٹر آپ کو کہاں جانا ہے، آیئے ہم چھوڑ دیتے ہیں۔ آج ویسے بھی حالات ٹھیک نہیں ہیں...... آپ کو ٹرانسپورٹ تو ملے گی نہیں۔'' ان میں سے ایک نے عاشی کو نظرانداز کر کے صلو سے پوچھا۔

''ہاں جی! ٹرانسپورٹ نہ ملنے کی ہی وجہ سے ہم پیدل چل رہے ہیں جبکہ گھر ہمارا خاصا دور ہے۔'' صلو نے لجاجت سے کہا۔

''آیئے ہم آپ کو ڈراپ کردیتے ہیں۔''

اسی لڑکے نے دوبارہ کہا اور عاشی نے صلو کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش کی مگر وہ تو گھر پہنچ کر آرام کرنے کے خیال سے مدہوش ہوا جارہا تھا۔ پیدل چل چل کے یوں بھی اس کے پیروں میں درد ہونے لگا تھا یوں بھی اس کی ہڈحرامی کی پرانی عادت تھی اور اب تو وہ اور بھی ہڈحرام ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً سے پیشتر دروازہ کھولا اور سیاہ چمچماتی ہوئی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ گیا مجبوراً عاشی کو بھی بیٹھنا پڑا۔

''آپ نے بتایا نہیں کہاں جانا ہے؟''

ڈرائیونگ کرنے والے لڑکے نے پوچھا۔

''ہمیں موسیٰ کالونی جانا ہے......'' صلو نے بتایا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

قحط بری بلا ہے، چاہے وہ کسی قسم کا ہو۔ انسانوں کا بھی قحط ہوتا ہے یعنی بڑے لوگوں کا، کام کے لوگوں کا، اسے قحط الرجال کہتے ہیں۔ بعض لوگ اس کا درست مفہوم نہیں سمجھتے۔ مثلاً ایک صاحب نے جنہیں ثقیل الفاظ استعمال کرکے اپنی قابلیت جتانے کا بڑا شوق تھا، بقرعید کے دنوں میں فرمایا کہ ''بھئی اس مرتبہ جانور بڑے مہنگے ہیں، گائے پھر بھی مل جاتی ہے لیکن بکروں کا تو ''قحط الرّجال'' ہے۔'' بعض لوگ اسے عام قسم کا قحط سمجھتے ہیں، جیسا صومالیہ وغیرہ میں پڑتا رہتا ہے۔ ان کے خیال میں صومالیہ کا قحط کیونکہ بہت سخت ہوتا ہے لہٰذا ہو نہ ہو، یہی قحط الرجال ہوگا لیکن یہ غلط ہے، ہمارے خیال میں صومالیہ کا قحط اس وقت ''قحط الرجال'' بنے گا جب وہاں کوئی مقامی آدمی باقی نہیں رہے گا، صرف امریکی فوجی رہ جائیں گے۔ (نعیم ابرار کی کتاب ''داؤ پیچ'' سے اقتباس)

''اوہ! وہ تو یہاں سے خاصی دور ہے اور آج تو ایک سیاسی جماعت نے اسٹرائیک کال لی ہے اور ان کا شہر پر خاصا ہولڈ ہے۔ پورا شہر بند پڑا ہے جگہ جگہ ٹائروں میں آگ لگا کر راستہ بند کیا ہوا ہے اور آپ لوگوں کے علاقے میں تو بہت ٹینشن ہے آپ لوگ ہمارے ساتھ چلیں اور اپنے گھر فون کردیں۔'' اسی لڑکے نے تاسف سے کہا۔

''نہیں مجھے گھر جانا ہے۔ بھائی میرے ٹوٹے کردے گا اگر میں وقت پر نہیں گئی۔'' عاشی خاصی گھبرا گئی تھی۔

''ٹھیک ہے تو پھر آپ یہیں اتر جائیں ہم آپ کے علاقے میں جانے کا رسک نہیں لے سکتے۔'' صلو کے برابر بیٹھے ہوئے لڑکے نے کہا۔ باہر گہرے ہوتے اندھیرے' سناٹے اور انسانی آبادی سے دور علاقے میں اترنے کے خوف نے دونوں کو جما دیا۔

''نہیں' نہیں صاحب چلیں اسے بولنے دیں۔ میری تو خیر ہے۔ یہ فون کرلے گی گھر۔'' صلو نے جلدی سے کہا اور عاشی نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''یہ آپ کی بہن ہیں۔'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''اوہ نہیں جی! میری منگیتر ہے۔'' صلو نے جھوٹ بولا اور عاشی شرما گئی۔ سرشاری اس کے اندر تک اتر گئی۔

اور بے فکری سی ہوئی کہ میرا محافظ میرے ہمراہ ہے۔ کچھ دیر چلنے کے بعد گاڑی ایک بڑے بنگلے کے دروازے پر آ کر رکی۔ چوکیدار کے دروازہ کھولنے پر گاڑی اندر چلی گئی۔

عاشی نے گھر فون کردیا کہ وہ اپنی سہیلی کے گر آ گئی ہے حالات کی خرابی کی وجہ سے۔''

ان لوگوں نے ان دونوں کو پرتکلف کھانا کھلایا اور پھر عاشی کو آرام کے لیے ایک الگ کمرہ دیا اور تینوں صلو کے پاس بیٹھ گئے اور ام الخبائث اس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔ اب ان میں سے ایک ایک اٹھ کر جاتا اور واپس آنے کے بعد اگلا چلا جاتا۔ وہ رات صلو نے مدہوشی میں گزاری اور عاشی پر وہ رات بڑی بھاری تھی اور بہت تاریک۔

صبح میں عاشی صلو کے سامنے آئی تو بہت مضمحل اور تھکی سی تھی۔ صلو نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ تو اس پرتکلف ناشتے پر ٹوٹا پڑ رہا تھا جو ان کے سامنے سرو کیا گیا تھا۔

واپسی پر ان میں سے ایک نے پانچ ہزار کے مٹھی بھر نوٹ صلو کو تھما دیے۔

''اگر تم ایسے ہی ہمارے کام آتے رہو تو یہ تمہاری مستقل آمدنی اور مشکلات کا حل نکل سکتا ہے۔'' اس وقت تو وہ نہیں سمجھا تھا۔

مگر باہر نکل کر جب عاشی نے رو رو کر اسے رات کی روداد بتائی تو اسے سمجھ آئی...... اور پھر اس کے منہ کو پیسہ لگ گیا۔ کتنی ہی لڑکیاں اس نے ان امیر زادوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیں۔ اب اس کی جیب بھری رہتی تھی۔ اب اسے چاچا' چاچی کی ضرورت نہیں تھی مگر کب تک پہلے اس کی علاقے میں شہرت خراب ہوئی اور اب تو عمر بھی بڑھنے لگی تھی علاقے سے باہر کی نوعمر لڑکیوں نے اسے گھاس ڈالنی چھوڑ دی تھی تب اس نے شادی کا سوچا اور تبھی اس نے ایک دن خالہ شیدہ کے گھر سے نگی کو نکلتے دیکھا اور اس کی رال ٹپکنے لگی کہ ''اگر یہ حسینہ اس کی زندگی میں آجائے تو زندگی سنور جائے۔ پیسے کی بارش ہونے لگے۔'' اور اس نے فوراً ہی اس پر عملدرآمد بھی کر ڈالا۔ اور خالہ شیدہ کو ایسا شیشے میں اتارا کہ دادی کے تحفظات کے باوجود اماں نے اس کی شادی صلو سے کروادی اور اب آج وہ اسے بھی اسی کام سے لگا رہا تھا جس میں وہ کئی لڑکیوں کو قربان کرچکا تھا

☆......☆

نگی تو اس بنگلے کی شان وشوکت دیکھ کر حیران ہی رہ گئی۔ اس کے خیال میں تو صلاح کے دوست اسی کی طرح کے ہوں گے مگر یہاں آ کر تو وہ گنگ ہوگئی تھی۔ اب اسے سمجھ آیا تھا کہ صلو اس کے لیے لباس وغیرہ کے سلسلے میں اتنا پریشان کیوں تھا جبکہ صلو نے ایک بار اسے پھر ناقدانہ نظروں سے دیکھا اور مطمئن ہو کر سیٹی بجائی۔

اس بنگلے میں نگی کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نہایت پرتکلف کھانا سرو کیا گیا اس سے ایسا سلوک کیا جارہا تھا جیسے کہ وہ نازک کانچ کی گڑیا ہو مگر جو بات اسے بری طرح چبھ رہی تھی وہ یہاں پر کسی بھی عورت کی غیر موجودگی تھی۔ یہ صلاح کے چاروں دوست تھے خاصے مہذب اور تمیز دار۔

لیکن رات گہری ہوتے ہی ان کی تمام تہذیب' تمیز پر سے نقاب اتر گیا۔ وہ رات نگی پر بہت بھاری تھی۔ اس کی چیخیں عرش کو ہلا رہی تھیں مگر صلو شراب کے نشے میں مدہوش پڑا تھا۔

صبح اس کی جیبیں پیسوں سے لبالب بھری ہوئی تھیں مگر نگی کا رنگ وروپ اجڑ چکا تھا وہ اس کے سامنے آئی تو بہت مضمحل اور پژمردہ تھی۔ ساڑی اس کے جسم پر کسی تھان کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل خالی تھیں۔ ان میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی اور پتہ نہیں کیوں پہلی بار صلو کے دل میں شرمندگی کا احساس جاگا۔

''تو تو بھول جا سب نگی! تو میرے لیے آج بھی ویسی ہے۔ میں تجھے خود سے جدا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا مجھے کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ ہکلا ہکلا کر بول رہا تھا۔ نگی جھٹکے سے مڑی اور نوٹوں سے بھری اس کی جیبوں کو دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی...... جو ہنسی نہیں نوحہ تھا اور اس نے جما کر ایک تھپڑ صلو کے مارا اور پھر اس کے منہ پر تھوک دیا۔

''تو مجھے خود سے جدا کرنے کا کیوں سوچے گا بے غیرت؟ میں تو تیرا لکی ڈرا ہوں، تیرا بمپر پرائز۔ مجھے تو خود سے کیوں جدا کرے گا' تجھے اعتراض نہ ہو مجھے اعتراض ہے تجھ جیسے بے غیرت کے ساتھ رہنے میں۔ جس کی موجودگی اور غیر موجودگی میرے لیے برابر ہو' جس کی موجودگی میں بھی میری عزت کو لیر لیر کردیا جائے اور وہ جیب میں پیسے ٹھونسے شراب کے نشے میں دھت پڑا رہے اور اس بے غیرتی کی کمائی کو فخر سے اڑائے' تو تو وہ بے غیرت ہے جو رشتوں کی بھی عزت نہیں کرتا۔''

نگی سخت وسپاٹ لہجے میں کہتی چلی گئی آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے چہرے کو بھگوتے رہے مگر نہ اس نے انہیں روکا نہ صاف کیا اور اس کے بعد اپنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بے جان لاشے کو گھسیٹتی ہوئی پہلے لاؤنج سے اور پھر گھر سے باہر نکل گئی۔

اور صلّو وہیں صوفے پر گر سا گیا۔ نگی نے تھپڑ تو صرف اس کے منہ پر مارا تھا۔ اس کی روح پر تو وہ کوڑے برسا کر گئی تھی۔

☆......☆

اور جب وہ لٹی پٹی گھر میں داخل ہوئی تو اماں نے تو دل پر ہاتھ رکھا مگر دادی تو کھڑے قدموں سے بیٹھ ہی گئی۔ اس کے اوپر گزری قیامت اس کے حال سے عیاں تھی۔ اس کی گردن چہرے اور ہاتھوں پر پڑے نیل خاموشی میں بھی زبان بنے ہوئے تھے۔ اس نے طنزیہ ماں کو دیکھا۔

''اماں شوہر کی کمائی نہ تیرے نصیب میں تھی نہ میرے نصیب میں ہے۔'' اس نے حقارت سے زمین پر تھوکا۔

''تیرا میاں بھی بے غیرت تھا کہ عورت کی کمائی کھاتا تھا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکا۔

''لیکن اللہ کی قسم! میرے میاں جتنا نہیں جو بیوی کو بھیڑیوں کے آگے ڈال کر عیش کر رہا ہے۔'' اس بار وہ بڑی زور سے سسکی تھی۔

''جب کمائی اپنی ہی کھانی ہے تو اس میں اس بے غیرت کو حصے دار کیوں بناؤں۔ عزت سے کیوں نہ کماؤں۔'' اس نے ماں کو دیکھا جو کہ بے آواز رو رہی تھی۔ دادی کو دیکھا جو کہ بس کسی لاشے کی طرح دیوار کے سہارے بیٹھی تھی۔

''چل اماں! اب بین ڈالنے بند کر۔ میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔ دادی تو توے کی کالک اتار۔ میں آ کر لگاؤں گی پھر چلیں گے۔ اماں میں تیرے ساتھ کام کروں گی۔ عزت سے۔''

یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

غزل

میری بربادیوں کا سبب ہوگیا
سچ کو سچ کہہ دیا تھا ، غضب ہوگیا!

جو بھی وہم و گماں میں کسی کے نہ تھا
دیکھیے! آج وہ سب کا سب ہوگیا

رفتہ رفتہ میں خود میں پگھلتا رہا
عارضہ عشق کا جانے کب ہوگیا!

چھوڑیے اب تغافل ، مسیحا بنیں
کہ مریضِ وفا جاں بلب ہوگیا

غیرتِ قوم پاؤں میں روندی گئی
اپنا پیکر جو دستِ طلب ہوگیا

جھوٹ، ایماں فروشی و مکر و فریب
جمالؔ! اب تو جینے کا ڈھب ہوگیا

شاعر
مصطفیٰ جمال

سچی کہانیاں کا ''پُر اسرار کہانی نمبر'' شائع ہوگیا ہے

سچی کہانیاں شمارہ اکتوبر 2017ء کے اس یادگار پُر اسرار نمبر میں نامور لکھاریوں کی ایسی کہانیاں شامل ہیں، جنہیں آپ عرصہ دراز تک فراموش نہیں کر سکیں گے۔

جناتی کہانیاں، ارواح کہانیاں، خوف اور دہشت سے بھری ڈراؤنی کہانیاں ہی اس پُر اسرار نمبر کا حصہ ہیں، روحانیت کے اسرار اور تصوف سے جڑی نہایت ہی اعلیٰ خصوصی کہانیاں بھی اِس کا حصہ ہیں۔

آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال یا اپنے ہاکر سے طلب کریں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ناول

ابھی امکان باقی ہے

قسط 14

ان کرداروں کی جو معاشرے میں بکھرے پڑے ہیں مگر جب یہ کردار امر ہو جائیں تو مزید کا بھی امکان باقی رہتا ہے...

''تم بتا نہیں رہیں۔ کہاں...... گئی تھیں؟ بی بی جان کے پاس کون ہے۔''

ثمن نے قدرے تشویش سے پوچھا۔ نیلم کی پشت پر ذرا فاصلے سے کھڑا شخص ثمن کو ہی نہیں ضیغم کو بھی مشکوک سا لگا۔ عامر اسد پل بھر میں معاملہ بھانپ کر رُخ موڑ کر پلٹا۔ نیلم کے لیے نازک صورتحال تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہے۔ ابھی ضیغم بھائی عامر اسد کے بارے میں اس سے سوال کریں گے اور اس کے آگے کی سوچ ہی تو اس کی روح فنا کر رہی تھی۔ عامر اسد پیچھے سے گھوم کر نیلم کی نظروں کے سامنے سے گزرتا آگے بڑھتا چلا گیا۔ نیلم کو لگا کہ اس کی سانس بحال ہوئی ہے۔

''وہ...... میں نرس کو...... چائے پینے کیلئے......'' گھبراہٹ سے بولنا ابھی بھی دشوار ہو رہا تھا۔

''اچھا اب راستہ بلاک مت کرو...... آگے چلو۔''

لوگوں کی آمد و رفت سے متاثر ہو کر ضیغم نے بیوی اور بہن کو قدرے جھنجلا کر کہا۔ ثمن کو بھی ماحول کا احساس ہوا۔ وہ راستہ چھوڑتی ضیغم کے پیچھے لپکی۔ آگے بڑھنے سے پہلے نیلم نے بھی گہری سانس کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر مڑ کے اس طرف دیکھا بھی جدھر عامر اسد گیا تھا۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ خود کو سنبھالتے اس نے بھی اگلی پکار سے پہلے تیزی سے قدم بڑھا دیے۔

☆......☆

گاڑی میں گونجتی راحت فتح علی خان کی آواز فائق کے خوشگوار موڈ کا اعلان کر رہی تھی۔ ساتھ بیٹھی شہرینہ خوبصورت احساسات و جذبات کے ساتھ اس کے ہمراہ گزرے وقت کو زندگی کا حاصل محسوس کر رہی تھی۔ آج اسے پہلی بار یہ لگا تھا جیسے فائق کی توجہ اسی پر مرکوز رہی ہے۔ آج ایک بار بھی انعم کا ذکر نہیں ہوا تھا۔

''فائق! ایک بات پوچھوں؟'' اچانک ہی شہرینہ کے دل میں ایک خیال آیا تھا جسے وہ فوراً ظاہر کرنا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چاہتی تھی۔ فائق بھی گاڑی چلاتے چلاتے ایک نظر اس کی جانب دیکھ کر قدرے حیرت سے بولا۔ ”ہاں پوچھو۔ کیا بات ہے؟“

”انعم تمہاری زندگی میں آئی تھی تو...... ہماری دوستی بالکل ختم ہوگئی تھی۔ اب اگر وہ واپس آجائے گی تو کیا......؟ پھر تم!......“

شہرینہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ فائق بے ساختہ متوجہ ہوا۔ اتفاق سے ٹریفک سگنل آ گیا تھا اس لیے گاڑی کو روک بھی لیا تھا۔

”ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟“

”پہلے بھی تو ہوا تھا فائق۔“ شہرینہ نے یاد دلانے کی کوشش کی۔

”پہلے بھی تم ناراض ہوئی تھیں۔ میں نے دوستی ختم نہیں کی تھی۔ اور رہی انعم کی واپسی کی بات تو اس کے بارے میں میں بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔“ فائق کے خوشگوار موڈ پر ذرا سی گرم ہوا نے جیسے اثر ڈالا تھا۔

”کل کو اگر تم پھر مجبور ہوگئے تو۔ اب دیکھو فائق۔ تم بات کرو نہ کرو۔ اس کی واپسی کا امکان تو ہے نا۔“ شہرینہ نے کھل کر اپنے خدشوں کا اظہار کیا۔

”شہری کیا تم میرے خوبصورت موڈ کو اس طرح خراب کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔“ سگنل گرین ہوتے ہی فائق نے قدرے خفگی سے دیکھ کر کہا۔ شہرینہ اتنا تو جانتی تھی کہ فائق کا موڈ ٹھیک کرنا مشکل ہوتا ہے فوراً بات پلٹتے ہوئے بولی۔

”جی نہیں جناب اس خوبصورت موڈ سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں۔ پلیز آئسکریم تو کھلا دو۔“ شہرینہ کا فرمائشی انداز دلبرانہ تھا۔

”اور وہ تمہارا ڈائننگ پلان۔“

”تم پر سب قربان۔“ شہرینہ کے انداز تخاطب پر فائق پھر حیرت سے متوجہ ہوا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ شہرینہ کی آنکھوں میں شرارت بھی تھی اور خواہش بھی۔ اس کی حیرت دیکھتے ہوئے شہرینہ بے ساختہ کھلکھلائی۔

”Just Kiding تمہارا موڈ بدلنا چاہتی تھی۔“ اس کی مسکراہٹ پر فائق بھی ہنس دیا۔ شہرینہ کو لگا۔ اس کے اردگرد پھول کھل گئے ہوں۔

☆......☆

شام کا ملگجا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ معمول کے مطابق بجلی گئی ہوئی تھی۔ احمد حسن ابھی آفس سے آ کر بیٹھے تھے۔ آپا سکینہ جیسے انہی کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ زہرا سے تو تمام گلے شکوے ہوگئے تھے اب بھائی کے سامنے بھڑاس نکالنی تھی۔ یو پی ایس کے ذریعے چلتا ایک پنکھا اور جلتا بلب گرمی اور حبس میں ناکافی محسوس ہورہا تھا۔ اس پر سکینہ آپا کی باتوں کی کاٹ نے زہرا کو تو پہلے ہی بلبلا دیا تھا۔ اسی لیے وہ آپا کو اٹھتے دیکھ کر کمرے سے چلی گئیں، وردہ پہلے سے بیزار سی صحن میں بیٹھی تھی۔ پھوپھو کی باتیں ناقابل برداشت تھیں۔

”لو بھائی مجھے تو زینت کے گھر چھڑوا دو۔“ سکینہ آپا پاؤں میں سلیپر اڑستے ہوئے بولیں۔ احمد حسن جو بستر پر نیم دراز سے تھے یکدم اٹھ بیٹھے اور حیرت سے پوچھنے لگے۔

”آپا!...... ابھی؟“ ”میرا مطلب ہے ابھی تو میں آیا ہوں اور......“

”بس بھیا! تمہیں دیکھنا تھا، دیکھ لیا۔ یہ تو میری محبت ہی جوش مارتی رہتی ہے۔ تم لوگوں کو تو اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ ایک فون ہی کر کے حال چال پوچھ لیں۔“

”کیا ہوگیا آپا۔ کسی نے کچھ کہہ دیا ہے۔ کوئی ناراضگی ہے۔“

احمد حسن کو آپا سکینہ کا رویہ سمجھ کر بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

”ہونہہ...... ناراضگی کیسی؟ بھیا۔ ناراضگی تو اپنوں سے ہوتی ہے، تم نے تو ثابت کر دیا کہ میں تم لوگوں کے لیے غیر ہوں۔“

آپا نے نخوت سے ہنکارا بھرا۔ گھٹنوں پر اس طرح ہاتھ رکھے تھے جیسے ابھی اٹھ کر چل ہی دیں گی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپا۔ آپ تو ہماری بڑی ہیں، بزرگ ہیں ہماری۔ میں نے ہمیشہ آپ کو اماں کی جگہ پر رکھا ہے۔“ احمد حسن کو سکینہ آپا کی ناراضگی کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

”بس!!...... رہنے دو احمد حسن منہ دیکھے کی محبت نہ جتاؤ۔ تمہاری نظر میں اگر میری کوئی وقعت ہوتی تو اس طرح اپنی خوشیاں مجھ سے چھپاتے۔“ سکینہ آپا کی آواز باہر بیٹھی زہرا کے کانوں تک بھی جا رہی تھی۔ اس کے بھی کان کھڑے ہوئے۔ زہرا سے تو وہ اروی کے سسرال میں نہ لے جانے پر جھگڑ چکی تھیں۔ اب کس خوشی کو چھپانے کی بات کر رہی تھیں۔ وردہ نے بھی استفہامیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ لاعلمی کا اشارہ ہاتھ سے کرتی اٹھ کر کمرے میں داخل ہوگئیں۔

”خوشیاں؟...... کس خوشی کی بات کر رہی ہیں آپا آپ۔ میں سمجھا نہیں۔“ احمد حسن نے خاصی ناسمجھی سے دیکھا۔

”اے لو...... اب اتنے انجان تو نہ بنو۔“ آپا نے زہرا کو دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بات بڑھائی۔ سارے زمانے کو خبر ہے۔“ احمد حسن بھی زہرا کی طرف متوجہ ہوئے۔

”کیا خبر ہے آپا آپ کھل کر بتائیں۔“ زہرا بھی سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ آپا کے واویلا مچانے کی عادت سے خائف ہو کر زہرا نے بڑے ضبط سے کام لیا۔

”سارے زمانے میں دھوم مچی ہے کہ تم نے زہیر کے لیے زرین کو مانگ لیا ہے۔ نہ کسی سے مشورہ نہ رائے۔ بھائی کی بچیاں تو تمہیں نظر ہی نہیں آئیں۔“ آپا نے بھی آخر بلی تھیلے سے نکال ہی دی۔ زہرا کے تو تن بدن میں جیسے آگ ہی لگ گئی۔ احمد حسن بھی متعجب سے بیٹھے دیکھے گئے۔

”آپا یہ ہیں کون جو پرائی بچی کا نام یوں اچھالتے پھر رہے ہیں۔ ذرا مجھے بھی تو پتہ چلے۔ یہ خبریں پھیلانے والے اور دھوم مچانے والے ہیں کون؟“ زہرا کا لہجہ خود بخود تیز اور گرم ہوگیا۔

”کوئی بھی ہوں۔ بات سچی ہے نا۔ تمہیں اپنے بھائی کی بیٹیوں کا ذرا خیال نہیں آیا احمد حسن......“ وہ بھائی سے ہی مخاطب تھیں۔ احمد حسن نے نظروں ہی نظروں میں بیوی کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ زہرا پہلو بدل کر رہ گئیں۔

”آپا...... جس کسی نے بھی آپ تک یہ بات پہنچائی ہے سراسر غلط بیانی کی ہے۔ ہماری تو ابھی تک زہیر کے لیے ایسی کوئی سوچ نہیں ہے نہ ہی وہ ابھی ان جھمیلوں میں پڑنا چاہتا ہے۔ ابھی تو وہ پڑھ رہا ہے۔ اس کی کوئی نوکری ہے نہ ہماری اتنی حیثیت...... ہم کیسے اس کی شادی منگنی کا سوچ سکتے ہیں۔“ احمد حسن نے وضاحت

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سے بہن کی تسلی کرانی چاہی۔

''یہی تو میں نے بھی زینت سے کہا تھا کہ ہمارا احمد حسن ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ ارے ابھی تک اروٰی اور داماد اس حادثے سے نہیں سنبھلے۔ ہمیں کوئی پوچھے نہ پوچھے بیٹی داماد کے بغیر تو اتنا بڑا کام نہیں ہوسکتا نا۔'' سکینہ آپا نے فوراً پینترا بدلا۔

''اوہ..... تو یہ شوشہ زینت بھابھی نے چھوڑا ہے۔ آپا ان سے کہیے گا۔ دوسروں کی بیٹیوں کے لیے خبریں اُڑانے سے پہلے اپنی بیٹیوں کے بارے میں بھی سوچ لیا کریں۔''

زہرا کہے بغیر نہ رہ سکی مگر اس نے لہجہ بمشکل بالکل آہستہ رکھا تھا۔

''زہرا تمہیں کیوں برا لگ رہا ہے۔ لوگ تو وہی کہیں گے جو دیکھتے ہیں۔'' سکینہ آپا کو زہرا کی بے بسی نے مزا دیا۔

''کیا دیکھتے ہیں لوگ۔ لوگوں کو خدا کا خوف نہیں ہے۔''

''آپا! زہرا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس بچی کا بچپن سے ہمارے گھر آنا جانا ہے۔ اروٰی کی سہیلی ہی نہیں بہنوں جیسی ہے۔ بیٹی ہے وہ ہماری۔'' احمد حسن نے بیوی کی تائید میں صفائی سی دی۔

''تو بھائی میں نے کیا کہہ دیا۔ میں تو تمہیں لوگوں کی سوچ سے آگاہ کرنے آئی تھی کہ اس لڑکی کا تمہارے گھر وقت بے وقت آنا کیا معنی رکھتا ہے۔'' بھائی کی سنجیدگی پر سکینہ آپا نے بے نیازی دکھائی۔

''خیر تم جانو اور تمہاری اولاد۔ میں کون ہوتی ہوں۔'' آپا کی بے نیازی میں بھی خفگی تھی لیکن زہرا اور احمد حسن اس وقت انہیں منانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے کیونکہ وہ جس مقصد کے تحت آئی تھیں انہیں سمجھ آ رہا تھا۔ وہ زینت اور آپا کی سیاست پر اپنے بیٹے کی ساری زندگی کا سکھ اور مرضی قربان نہیں کر سکتے تھے سو دونوں ہی چپ ہو گئے تھے۔

☆.....☆

نیلم کالج کینٹن میں اپنی سہیلیوں سارہ اور فضہ کے ساتھ بیٹھی عامر اسد کی محبت کے گن گا رہی تھی۔ سارہ تو درمیان میں کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنی اہمیت بھی جتا رہی تھی کیونکہ عامر اسد اس کا کزن تھا اور نیلم سے متعارف بھی اسی نے کرایا تھا جبکہ فضہ شیرازی صرف سن رہی تھی۔

''یار..... میں بتا نہیں سکتی کہ میں ہاسپٹل میں خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ اچانک عامر نے آ کر میری پریشانی دور کر دی۔'' نیلم اس دن کو تصور میں لا کر بولی۔

''پھر بھی تم مجھ پر ناراض ہو رہی تھیں کہ میں نے عامر بھائی کو کیوں پتہ بتایا۔'' سارہ نے مصنوعی خفگی جتائی۔

''ہاں تو..... میں پکڑی جاتی تو میرا کیا حشر ہوتا۔ سوچو ذرا۔'' نیلم نے توجیہہ دی۔ تصور میں وہ منظر آیا تو اسے جھرجھری آ گئی۔

''پکڑی تو نہیں گئیں نا، اور پھر میری جان۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا۔'' سارا نے باقاعدہ لہک کر کہا۔ فضہ نے اسے سنجیدگی سے گھور کر پہلی بار مداخلت کی۔

''ڈرنا تو پڑتا ہے سارہ! ہمارے والدین اس مقصد کے لیے تو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتے

کہ ہم چھپ چھپ کر غیر لڑکوں سے ملیں۔''

''بس فضہ رہنے دو اس بحث میں ہماری پھر لڑائی ہو جائے گی۔ سوشل میڈیا پر سینکڑوں دوستیاں گانٹھنے سے پیرنٹس کا ٹرسٹ نہیں ٹوٹتا۔ ایک شخص سے عمر بھر کی کمٹمنٹ سے ناک کٹ جاتی ہے۔'' سارہ نے فضہ کو فوراً ہی چپ کرا دیا۔ اس نے برملا اس کی ذات پر تنقید کی تھی۔ نیلم بھی نئے سرور میں تھی سارہ کی تائید میں بولی۔

''یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی کہ سب لوگ محبت کے خلاف کیوں ہیں۔ کوئی ہماری فیلنگز سمجھتا ہی نہیں۔''

''میں محبت کے خلاف نہیں ہوں اس عمل کے خلاف ہوں جو والدین کے بھروسے کو ٹھیس پہنچاتا ہے۔ ذرا سوچو اس روز تمہارا بھائی، بھابھی عامر اسد کو تمہارے ساتھ دیکھ کر تم سے باز پرس کرتے تو تم کیا سچ بولنے کا حوصلہ رکھتی تھیں؟ خیر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے مجھے واقعی دخل نہیں دینا چاہیے۔'' فضہ نے پہلے سنجیدگی سے جتایا پھر دونوں کے بگڑتے مزاج دیکھ کر وہاں سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ اس کے حصے کے سموسے اور کوک سامنے ہی دھرے رہ گئے۔

''اونہہ جل ککڑی۔ اسے کوئی گھاس نہیں ڈالتا نا اس لیے جیلس ہو رہی ہے تم سے۔'' سارہ نے فوراً تبصرہ کیا۔ ہاں..... شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو مجھے تو فون پر نصیحتیں کرتی رہتی ہے کہ باہر نہ ملنا۔ زیادہ فون کالز نہ کرنا۔ اسے کہو تمہارے لیے رشتہ بھیجے۔''

''اچھا؟ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' سارہ چونکی ہوئی۔

''مجھے لگتا تھا وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' نیلم نے منہ بنا کر کہا۔

''خاک ٹھیک کہتی ہے۔ میں تمہیں بتا رہی ہوں نیلی فضہ تم سے جلتی ہے۔ تم اس کی باتوں پر غور مت کرنا۔ بھئی ہماری لائف ہے ہم جیسے چاہیں جئیں۔'' سارہ نے اس کے خیالات بدلنے کی کوشش کی اور فضہ کے حصے کے سموسے اور کوک اپنے سامنے رکھ کر کھانا شروع کر دیے۔ نیلم بھی اس سے متفق نظر آ رہی تھی۔

☆.....☆

صالحہ کشمکش میں تھیں کہ زبدہ کی عیادت کو جائیں یا نہ جائیں کیونکہ وہ بیٹے کا رجحان اور بدلا ہوا رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھیں۔ ان کے کہنے کے باوجود وہ زبدہ خان کو دیکھنے ہاسپٹل نہیں گیا تھا جبکہ زیب کا بڑھتا ربط و تعلق اور شہرینہ کی محبت میں ڈوبی فون کالز انہیں نئی فکروں میں مبتلا کر رہی تھیں وہ چاہ کر بھی نہ بیٹے کو سرزنش کر پا رہی تھیں اور نہ ہی زیب اور شہرینہ کو روک سکتی تھیں۔ وقت اور حالات نے انہیں عجیب ہی مخمصے میں پھنسا دیا تھا۔ وہ اس مسئلے کو لے کر کافی مضطرب تھیں۔ باجی نذیراں ان کی حالت زار سے آگاہ تھی۔ ان کے لیے چائے لے کر آئی تو ہمدردی سے مشورہ دینے لگی۔

''بیگم جی! کیوں اپنی صحت خراب کر رہی ہیں۔ آپ کے جلنے کڑھنے سے ان لوگوں کا کج نئیں جانا۔''

صالحہ اس کی مداخلت پر یکدم چونکی پھر ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں ''کیا کروں نذیراں؟ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ کیا کروں تم تو گواہ ہو میں نے کتنی چاہت سے فائق کی شادی کی تھی۔ کتنے ارمان تھے مگر اس لڑکی نے ایک دن بھی قدر نہیں کی۔''

''او چھڈ دو بیگم جی! مقدراں والے چاہتوں کی قدر کرتے ہیں۔ ہمارے فائق صاب نے کم نخرے چکے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہیں اس کے پر پتہ نہیں اس کے دل میں کیا ہے۔''

''صحیح کہتی ہو نذیراں سب مقدر کے کھیل ہیں۔ اس کا ہم سے دل ہی نہیں ملا۔ تبھی تو فائق کا بھی اس کی طرف سے دل پھرتا جارہا ہے۔''

''سیدھی سی گل ہے بیگم جی!'' عورت کی زبان نکل آئے تو مرد کا دل تو پھرنا ای ہے۔ کیر آپ بوہتا پریشان نہ ہوں اللہ سوہنا سب بہتر کرے گا۔ آپ چائے پیو۔'' نذیراں نے توجہ بٹائی۔

''ہاں اللہ سے تو امید ہے تم بھی دعا کرنا نذیراں انعم کو عقل آجائے اپنے ہونے والے بچے کا ہی احساس کرلے۔''

''آمین، آپ دل پر بوجھ نہ لیں آپ ہو آئیں ہسپتال ان کی بیٹی کے منہ کو تھوڑی جانا ہے آپ نے وہ خود تو بھلی مانس ہیں بڑی عزت کرتی ہیں آپ کی۔'' نذیراں نے انہیں کشمکش سے نکال دیا

''ہاں تم بھی ٹھیک ہی کہتی ہو وقت سے پہلے رابطے اور تعلق توڑنا بھی عقلمندی نہیں ہے تم ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے میں تیار ہو کر آتی ہوں۔'' صالحہ کو نئی توانائی ملی تھی۔ وہ چائے کا کپ رکھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئیں اور نذیراں لاؤنج سے باہر چلی گئی۔

☆......☆

زہرا کی خیر خیریت کے لیے اروی نے کافی دنوں بعد خود رابطہ کیا تھا اصم کے پاس فیصل آیا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انہیں چائے وغیرہ سرو کر کے اصم سے اجازت لے کر ساتھ والے کمرے میں آ گئی تھی۔ خیر خیریت کے بعد زہرا نے جو خبر دی وہ اس کے لیے بھی حیران کن تھی۔

''یہ پھپھو سکینہ کو سوجھی کیا؟ زہیر بھائی نے تو خوب ہنگامہ کیا ہوگا۔ آئے دن زہیر بھائی کے ساتھ کسی نہ کسی کا افیئر چلا دیتی ہیں۔'' اروی کو بھی سن کر غصہ آیا۔ آپا کچھ اپنی فطرت سے مجبور ہیں اور کچھ زینت انہیں بھڑکاتی رہتی ہے۔ خیر زہیر کو ابھی ہم نے کچھ نہیں بتایا۔ شکر ہے کہ وہ اس وقت اپنے دوست فراز کے گھر اس کے بھتیجے کو پڑھانے گیا ہوا تھا۔ تم بھی ابھی کوئی ذکر نہ کرنا۔'' زہرا نے بیٹی کو تلقین کی۔ ''وہ تو ٹھیک ہے امی۔ مگر ان کے اوچھے ہتھکنڈوں کا تو مطلب یہی ہے نہ کہ کسی طرح زینت چچی کی کوئی ایک بیٹی زہیر بھائی کے ساتھ باندھ دیں۔'' اروی بھی جل کر بولی ''بیٹا لاکھ کوشش کرلیں مقدر کو اپنی مرضی سے باندھنا انسان کے بس کی بات کہاں۔ اچھا تم بھی زیادہ اثر مت لو اور مجھے بتاؤ تمہاری ساس اب کیسی ہیں۔ گھر آ گئیں یا نہیں۔'' زہرا نے موضوع بدل کر بیٹی کا دھیان بدلا۔

''بہتر ہیں۔ شاید کل تک وہ ڈسچارج ہو کر گھر آ جائیں۔''

''اروی ان کی خدمت کرنا بڑوں کی خدمت کا بڑا صلہ ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔'' زہرا نے ہمیشہ کی طرح نصیحت کی۔

''امی میں تو ان کی روز عیادت کے لیے بھی نہیں جا سکی۔ اصم کی روٹین ایسی ہے کہ زیادہ وقت کے لیے ادھر سے ادھر ہو ہی نہیں سکتی پھر بھی میں کوشش کرتی ہوں کہ......'' اروی جیسے اپنی صفائی میں بولتی مجبوری بتانے لگی۔

''وہ تو تمہارا فرض ہے اروی اپنے شوہر کو تو تم ہی سنبھال سکتی ہو۔ خیر پھر بھی کچھ وقت اپنے گھر کے

معمولات کے لیے بھی نکالا کرو۔ تمہاری دونوں جٹھانیاں ساس سے زیادہ قریب دکھائی دیتی ہیں۔ تمہیں بھی اپنی جگہ بنانی چاہیے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات۔'' زہرا نے بہت نرمی سے اروی کو سمجھایا۔ وہ ہر بار ہی بیٹی کو کوئی نہ کوئی نصیحت کرتی رہتی تھیں۔

''جی امی میں سمجھتی ہوں اصم کی ٹانگ کا پلاسٹر اتر جائے پھر میں بھی ضرور گھر کے کاموں کی ذمے داری اٹھاؤں گی۔ ابھی تو ثمن بھابی اور بی بی جان نے منع کر رکھا ہے۔'' اروی نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔

''ٹھیک ہے بیٹا میرا فرض تو تمہیں سمجھانا تھا اصم کو میرا پیار اور دعائیں دینا۔'' زہرا کو بیٹی کی سمجھداری پر اعتماد تھا۔

''جی ضرور امی۔ ابھی ان کے دوست ان کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں ورنہ میں آپ کی بات کروا دیتی۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا۔ پھر بات ہو جائے گی اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ امی۔'' اروی نے رابطہ منقطع کر کے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اصم کی دوا کا وقت ہو رہا تھا۔

☆......☆

فیصل کی آمد پر اصم کا موڈ عموماً خوشگوار ہو جاتا تھا۔ دونوں کے درمیان پہلے کی طرح نوک جھونک جاری رہتی تھی۔ باتوں کے دوران اچانک اروی کا ذکر چھڑ گیا تھا فیصل اس کی سادگی اور معصومیت کا معترف تھا۔ اور کئی بار اصم کو اس کی خوش قسمتی جتا چکا تھا۔

''اصم تم سچ سچ بتاؤ تم نے کبھی سوچا تھا کہ بھابی جیسی Shy, Innocent, Simple لڑکی تمہاری لائف پارٹنر بنے گی۔'' اب بھی وہ کسی شرارت کے تحت پوچھ رہا تھا۔

''نہیں سوچا تو نہیں تھا مگر...... اوئے تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' اپنی رو میں بولتے بولتے اچانک اصم کو اس کی شرارت سمجھ میں آئی۔

''یہی کہ کالج اور یونیورسٹی میں اور ملک سے باہر بھی ایک سے ایک ماڈ سکاڈ لڑکی تمہارے آگے پیچھے ہوتی تھی اور تمہاری دوستی بھی تھی ان سے۔ ہمیں تو یہی لگتا تھا کہ تمہاری لائف پارٹنر انہی میں سے ایک ہوگی۔''

فیصل جو بات پہلے دن سے پوچھنا چاہتا تھا اس کا موقع آج ملا تا ''ہو بھی سکتی تھی لیکن......'' اصم نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

''لیکن کیا؟ تم مجبور ہو گئے؟ کون تھی وہ' تم نے تو یار ہوا بھی نہیں لگنے دی؟''

فیصل تجسس و حیرانی کے مارے بے ساختہ سوال پر سوال کیے گا۔

''ایک منٹ یار...... صبر تو کرلو بات تو پوری ہونے دیتے۔'' اصم نے اس کی حیرانی و بے صبرے پن سے حظ اٹھایا۔

''ابھی بھی صبر کروں؟'' فیصل حیرانی و چڑچڑاہٹ سے بولا ''تو نہ کرو'' اصم بے ساختہ کہہ کر ہنسا۔

''تم بتاؤ گے یا بھابی کو بلا کر تمہارے سارے افیئرز کی پول کھول دوں۔'' فیصل نے مصنوعی سنجیدگی سے دھمکایا ''بکواس نہ کرو۔ وہ واقعی تمہارے جھوٹے افسانوں کو سچ سمجھ لے گی اور اسٹوپڈ تمہیں نہیں معلوم ہے کہ ہماری فیملی ویلیوز ہمیں کسی افیر کی اجازت نہیں دیتیں وہ دوستیاں صرف کالج اور یونیورسٹی تک ہی تھیں۔''

اصم بھی اس کی دھمکی سے قدرے پریشان ہو کر بولا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''یار مجھے نہیں معلوم تھا کہ بندہ شادی کے بعد بیویوں سے اتنا ڈرنے لگ جاتا ہے۔'' فیصل نے اس بار حظ اٹھا کر اسے چھیڑا تھا۔

''تمہاری شادی ہو جائے گی نا تو پھر معلوم ہو جائے گا کہ بیویوں سے شوہر حضرات کیوں ڈرتے ہیں۔ ویل! مذاق ایک طرف اسے ڈرنا نہیں اپنی وفا اور کمٹمنٹ کو بچانا کہتے ہیں جس کا عہد شوہر اور بیوی کے نکاح کے اقرار کے وقت کرتے ہیں۔''

''ہاں تبھی ہماری مشرقی عورت مغربی خواتین کی بہ نسبت زیادہ باوقار اور مطمئن زندگی گزارتی ہیں کیونکہ انہیں مرد کی وفا پر اعتبار ہوتا ہے۔'' فیصل نے تائیداً بات آگے بڑھائی تو اصم کو اس کی سنجیدگی پر کچھ حیرت ہوئی۔

''خیریت ہے یار آج کیا کوئی فکشن سوشل اشو پڑھ لیا ہے۔'' اصم نے اسے پھر چھیڑنے کی کوشش کی۔

''تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔'' فیصل نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''نہیں ڈیئر تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو یہ اعتبار یہی بھروسہ تو ریلیشن شپ کو اسٹرونگ کرتا ہے۔ ویل یہ ڈسکشن پھر کبھی کرلیں گے ابھی تم میرا ایک کام کردو۔'' اصم نے اپنی ٹانگ ایک ہاتھ سے دوسری ٹانگ کے قریب کرنے کی کوشش کی۔ اصم کو حرکت کرتے دیکھ کر فیصل نے اپنی نشست سے اٹھنے کی کوشش کی تو اصم نے اسے اشارے سے روک کر کہا۔

''نہیں یار یہ میں خود کروں گا۔ تم ذرا اپنی بھابھی کو بلا دو۔ ساتھ والے روم میں ہوں گی۔'' فیصل اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا اسی وقت اروی اندر چلی آئی۔

''اصم آپ کی میڈیسن کا ٹائم ہو گیا ہے۔'' وہ کارنر ٹیبل سے اس کی میڈیسن کٹ لے کر قریب آ گئی۔

''ہاں اسی لیے میں فیصل سے کہہ رہا تھا کہ تمہیں بلا دے۔ پلیز میڈیسن دے کر ہمارے لیے اچھی سی چائے بنوا دو۔'' اصم نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر کہا۔ اروی نے کیپسول اور گولیاں اپنے ہاتھ سے اس کے منہ میں رکھیں شروع شروع میں وہ جھجک جاتی تھی لیکن اب وہ سہولت سے اپنے فرائض انجام دینے لگی تھی۔ ''میں خود بنا لاتی ہوں۔'' فیصل کی ستائشی نظریں اس کے پیچھے تھیں۔ وہ اپنے شوہر سے غافل جو نہ تھی۔

☆......☆

بی بی جان کو روم میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ایک نرس مستقل طور پر ان کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ ویسے بھی وہ بہتر محسوس کر رہی تھیں۔ ان کی سنبھلتی حالت پر ہی ڈاکٹر نے انہیں ڈسچارج کرنے کا اذن دیا تھا لہٰذا وہ بھی مطمئن تھیں کہ اگلے روز انہیں گھر جانا تھا۔ یہ احساس ہی بڑا سکون آور تھا کہ اپنا گھر اپنے لوگوں میں رہنا پھر سے نصیب ہو رہا تھا۔ وہ اس احساس کے ساتھ ہی شام کے وقت چہل قدمی کے لیے اسپتال کے کمپاؤنڈ میں آ گئی تھیں۔ گھر سے کوئی نہیں آیا تھا۔ سہ پہر میں ثمن واپس گئی تھی وہ ابھی چند قدم ہی چلی تھیں کہ اسپتال کے عملے سے کسی نے آ کر اطلاع دی کہ ان سے کوئی ملنے آیا ہے وہ اسی وقت نرس کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئیں۔ انہیں گمان بھی نہ تھا کہ ان سے ملنے والی ہستی صالحہ درانی ہوں گی انہیں دیکھ کر صالحہ بے اختیار ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھیں۔ ''السلام علیکم' زبدہ بھابھی شکر ہے آپ کو میں نے بستر پر نہیں دیکھا۔'' صالحہ کی بے تکلفی معمول کی سی تھی۔

''وعلیکم السلام' آپ سبھی کی دعائیں ہیں جو اللہ نے کرم کیا۔''

''بیٹھیے بھابی! کھڑی کیوں ہیں؟'' زبدہ نے بھی کسی گلے شکوے کو پس پشت ڈال کر ایسے ظاہر کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ صالحہ کے چہرے پر ندامت جھلکی

''میری خود بھی صحت آج کل ٹھیک نہیں رہتی۔ اس لیے آپ کی عیادت کو آ ہی نہیں سکی۔'' صالحہ نے اپنے نہ آنے کا عذر دیا تو زبدہ بھی ان کے قریب مگر کچھ فاصلے پر بیٹھ کر بولیں ''ہماری صحتیں بھی اب تو ہمارے لیے مسئلہ بن گئی ہیں خیر چھوڑیں، آپ فائق کے ساتھ آئی ہیں یا......'' زبدہ نے کسی امید کے تحت پوچھا تھا حالانکہ وہ آتا تو وہاں موجود بھی ہوتا۔ ان کی ادھوری بات پر صالحہ ایک بار پھر شرمندگی کے احساس میں ڈوب کر ابھریں۔

''نہ...... نہیں میں ڈرائیور کے ساتھ آئی ہوں بھابھی۔ وہ کچھ مصروف تھا۔ آئے گا وہ بھی۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''فکریں تو جان چھوڑتی نہیں لگتیں میں جانتی ہوں فائق انعم کے رویے سے بدظن ہو چکا ہے۔'' زبدہ نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنے احساسات بھی باہر نکالے۔

''میں تو بہت دعائیں کرتی ہوں بھابھی اللہ دونوں کو اپنے رشتے بچانے کی سمجھ بوجھ دے۔'' صالحہ کا لہجہ بھی ان کی کیفیت پر نم ہوا ''دعاؤں کے لیے میرا ابھی رواں رواں لرزتا ہے۔ اب تو اللہ کو ہی اختیار ہے کہ ان کے دل پھیر دے۔''

زبدہ خان کے لہجے میں وہ یقین نہیں تھا جو ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ صالحہ کو ان کی بے بسی اندر ہی اندر تڑپا رہی تھی لیکن اپنی اولاد کے ہاتھوں بے بس تو وہ بھی ہو رہی تھیں پھر بھی انہیں تسلی دینے کی خاطر بولیں ''زبدہ بھابھی' آپ بالکل بھی ٹینشن نہیں لیں۔ آنے والے وقت سے اچھی امیدیں رکھیں اللہ بہتر کرے گا۔'' اپنے طور پر انہوں نے تسلی دے تو دی تھی لیکن اپنے کہے لفظ انہیں خود بھی بہت ہلکے محسوس ہو رہے تھے۔ زبدہ کے پاس بھی اس موضوع پر سوائے خاموشی کے کچھ نہ تھا۔ صالحہ نے بھی باتوں کا رخ اصم کی طرف مبذول کر کے ان کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔

☆......☆

بی بی جان اسپتال سے گھر واپس آئیں تو ان کی عیادت کے لیے دوست احباب، رشتے دار آس پڑوس سے تقریباً سبھی باری باری ملنے آ رہے تھے آنے والوں کو منع کرتے ہوئے بھی بی بی جان چائے کھانے کے بغیر واپس نہ جانے دیتیں۔ گھریلو ذمے داریوں کے ساتھ اضافی خاطر داریوں سے سبرینہ عاجز آئی ہوئی تھی حالانکہ ثمن بھی برابر کی ذمے داری نبھا رہی تھی اور کسی کسی وقت اروی بھی چائے پانی کا انتظام کر دیتی تھی اس کے باوجود سبرینہ کا موڈ خراب سا رہنے لگا تھا اس وقت بھی بی بی جان کے دور کے کوئی رشتے دار آئے ہوئے تھے اور انہیں رات کے کھانے کے لیے زبردستی بابا جان نے روک لیا تھا۔ رات کے کھانے کی تیاری ہو چکی تھی اب مزید چھ لوگوں کے لیے ڈنر کا انتظام نئے سرے سے کرنا تھا۔ یہ ذمے داری سبرینہ کے سر پر آ پڑی تھی۔ جسے وہ بحالت مجبوری نبھا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ چیزیں اٹھاتی پٹختی اپنی چڑچڑاہٹ کا اظہار بھی کر رہی تھی۔

''کتنے سال ہو گئے ہیں شادی کو ابھی تک ہماری آزمائش ہی ہو رہی ہے۔ آخر ایک کک رکھنے میں حرج ہی کیا ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''کیا مطلب آزمائش؟ اور کک کیوں رکھ لیں؟ کچن سنبھالنا تو گھر کی خواتین کا ہی ذمہ ہوتا ہے۔'' ثمن کو اس کے انداز اور رویے پر حیرت ہوئی تھی۔

''اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس گھر کی چھوٹی بہو بھی خواتین کی صف میں شامل ہیں اسے بھی اس کی ذمے داریوں کا احساس دلانا چاہیے' آخر وہ کب تک آئیں گی' کھائیں پئیں گی اور جا کر سو جائیں گی۔'' سبرینہ بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی اس دوران انعم بھی کچھ لینے کے لیے کچن میں داخل ہوئی تھی۔

''ٹھیک تو کہہ رہی ہیں سبرینہ بھابھی شادی کو اتنا ٹائم گزر گیا۔ بی بی جان نے چھوٹی بہو کو کوئی ذمہ داری نہیں دی۔''

''اصم کو سنبھالنا، چھوٹی ذمہ داری نہیں ہے۔ وقت بے وقت اٹھانا بٹھانا، اس کا ہر کام کرنا۔ وہ بغیر کسی کی مدد لیے کرتی ہے بی بی جان نے خود اسے منع کیا ہے کچن کی ذمہ داری لینے سے۔'' ثمن نے ارویٰ کا بھرپور دفاع کیا تھا۔ سبرینہ نے جتاتی نظروں سے انعم کو دیکھا۔

''ہاں تو پھر جب اس پر ذمہ داری نہیں ڈالنی تو کک رکھوا دیں بی بی جان۔ اب ایک بندہ تو سارے گھر کی فرمائشیں پوری نہیں کرسکتا۔'' سبرینہ آج جیسے کک رکھوا کر ہی دم لینے والی تھی۔

''تمہیں معلوم ہے سبرینہ بی بی جان گھر کا کچن کسی کک وغیرہ کے حوالے کرنے کے حق میں نہیں ہیں اور پھر چند دنوں کا یہ اضافی بردن ہے آ جائے گا سب کچھ روٹین پر تم کیوں اتنی ٹینس ہو رہی ہو۔'' ثمن نے مصلحت آمیزی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''میں ٹینس اس لیے ہو رہی ہوں کہ گزشتہ کئی مہینوں سے اپنے میکے جا کر نہیں رہ سکی، اپنے بچوں کو وقت نہیں دے پا رہی' اور تو اور شارم کے ساتھ ٹائم Spend کرنے کا موقع نہیں مل رہا۔ میری اپنی بھی تو کوئی لائف ہے یا نہیں۔''

سبرینہ کھل کر بولی تو ثمن کو مزید حیرت ہوئی۔ یہ سوچ اس کے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھیں وہ بھی تو انہی حالات سے گزر رہی تھی لیکن اس کے لیے یہ گھر اور اس سے وابستہ ہر فرد اہم تھا ان کی خوشیاں' دکھ درد سانجھے تھے۔

''سبرینہ بھابھی یہ تو واقعی آپ کے ساتھ زیادتی ہے۔ بی بی جان نہیں کہتیں تو آپ خود اروی بھابی سے کہہ دیں کہ وہ بھی گھر کی ذمے داریوں کو اٹھائے۔ آخر پتہ تو چلے کہ موصوفہ میں کتنی قابلیت ہے۔'' انعم کے دل میں اروی کے لیے جو کدورت تھی وہ ایک بار پھر واضح تھی ''میں کہہ دوں؟ غضب ہو جائے گا اگر میں کچھ کہہ دیا۔'' سبرینہ نے شوشہ چھوڑ کر پہلو بچایا۔

''چلیں۔ میں کہہ دوں گی بلکہ میں تو ڈائریکٹ اروی بھابھی سے ہی کہوں گی کہ وہ کھیر شیر کی رسم کریں اور اپنی ذمے داری اٹھائیں۔'' انعم نے سبرینہ کی دلی مراد پوری کر دی ''ہاں تم کہو گی تو کسی کو برا نہیں لگے گا تم بیٹی ہو اور میں بہو...... اور دیکھو مجھے تو ثمن بھابھی کا بھی احساس رہتا ہے رات تک یہ بھی مصروف رہتی ہیں۔'' ثمن نے دونوں کی باتوں کے درمیان خود کو بے بس محسوس کیا۔ وہ خاموشی سے کچن سے نکل گئی۔

☆......☆

نیلم اصم کے آئی فون کا چارجر لے کر آئی تھی۔ اس کا فون چارجر جل گیا تھا اروی وہی لینے آئی تھی۔ نیلم اپنے کمرے میں نہیں تھی یا پھر واش روم میں تھی وہ دستک دے کر اندر گئی تو اس کے بستر پر اس کا لیپ ٹاپ کھلا ہوا

تھا سامنے ہی کسی لڑکے کی تصویر آ رہی تھی۔ وہ کچھ بول بھی رہا تھا مگر شاید کسی سسٹم کے تحت آن کر کے ہیڈ سیٹ کے ذریعے اس کی آواز سنی جاتی۔ اروی نے کچھ آگے ہو کر جھانکا۔ پھر یکدم گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ اسی دم نیلم بھی واش روم کا دروازہ کھول کر برآمد ہوئی اس کا حلیہ چونکا دینے والا تھا۔ گہری لپ اسٹک، کھلے بال، ٹراوزر پر ٹی شرٹ پہنے وہ ہمیشہ سے مختلف نظر آ رہی تھی اس سے پہلے اروی نے اسے شلوار قمیص اور دوپٹے میں ہی دیکھا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں ''بھا...... بھی...... آپ؟'' نیلم کا رنگ بھی متغیر ہوا تھا۔ اروی جہاں کھڑی تھی لگتا تھا ابھی کمرے میں داخل ہوئی ہے۔ ''ہاں...... وہ...... میں...... چارجر لینے آئی تھی۔ اصم رات کو نیند نہ آئے تو اپنے دوستوں سے بات کر لیتے ہیں تم نے ابھی چارج نہیں کیا اپنا فون؟'' اروی نے بھی یکدم خود کو سنبھال لیا۔

''ہاں...... نہیں وہ چارج کر لیا ہے، آپ لے جائیں'' نیلم کی گھبراہٹ واضح ہو رہی تھی۔ وہ بیڈ کی طرف بڑھی اور چارجر پلگ سے اتار کر دے دیا۔ اروی اسے بات کرنا چاہتی تھی کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن کسی ہنگامہ آرائی کے ڈر سے واپس پلٹنے لگی تھی ''اروی بھا...... بھی رکیں۔''

نیلم نے اسے پکار کر روکا اور جلدی سے اپنے لیپ ٹاپ کا سوئچ آف کیا۔ اروی رخ موڑ کر پلٹ آئی۔ نیلم کے چہرے پر کشمکش تھی۔

''ہوں بولو کچھ چاہیے میرا مطلب ہے اگر چارجر چاہیے تو میں اصم کا فون چارج کر کے دے جاؤں گی۔'' اروی کو اس کی کشمکش محسوس ہو گئی تھی۔

''نن...... نہیں بھابھی...... چارجر نہیں چاہیے مجھے۔ وہ...... آپ......'' نیلم میں ابھی اتنی جرات نہیں تھی۔

''ہاں بولو...... نیلم...... کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔'' اروی نے خاصی نرمی سے استفسار کیا۔

''بھابھی پلیز...... آپ کسی سے کچھ مت کہیے گا۔'' نیلم کو یکدم بہت سے خدشات محسوس ہوئے تھے۔ اسے لگ رہا تھا کہ اروی اصم اور بی بی جان کو جا کر ضرور بتا دے گی۔

''کس بارے میں نہ بتاؤں؟'' اروی کو لگا تھا اسے ٹوکنے کا یہی مناسب وقت ہے جبکہ نیلم مزید گھبرا گئی تھی۔

''بھا...... بھی...... وہ'' نیلم سے بولا ہی نہیں گیا۔

''سنو نیلم! جس عمل کو کرنے کی جرات ہم اپنے بڑوں کے سامنے نہیں رکھتے اسے چھپ کر کرنے کی تسکین وقتی ہوتی ہے مگر اس کے نقصانات زندگی کو دور تک متاثر کر جاتے ہیں تم سمجھدار ذہین لڑکی ہو میری بات پر غور ضرور کرنا۔'' وہ ندامت سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ندامت وقتی تھی یا زود اثر تھی۔

اروی اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر کمرے سے نکل آئی۔ کہنے سمجھانے کے لیے بہت کچھ تھا مگر وہ اپنی کم مائیگی کے زیر اثر بے حوصلہ ہو کر پلٹ آئی تھی۔

☆......☆

بی بی جان کی زیادہ تر ذمے داری ثمن نے ہی اٹھا رکھی تھی گو کہ اب وہ کافی بہتر تھیں۔ پھر بھی ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وقت پر دوائیں' جوس' کھانا وغیرہ دینا چہل قدمی کے لیے لان میں لے آنا۔ ثمن کا کام تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کبھی کبھار نیلم ان کے ساتھ ٹہل لیتی تھی۔ انعم تو جب بھی ان کے پاس بیٹھتی تھی بی بی جان کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا تھا۔ اب بھی انعم ان کے پاس سے گئی تھی تو انہوں نے ثمن کو بلالیا تھا۔ ''ثمن...... اس کو کوئی منع کیوں نہیں کرتا یہ آخر کیا چاہتی ہے۔ میں اصم کا گھر برباد کردوں۔'' وہ ماں ہوکر انعم کی باتوں سے عاجز آئی ہوئی تھیں۔ سبرینہ کی ہمدردی میں بی بی جان کی کوتاہی جتا کر گئی تھی کہ اپنی چھوٹی بہو کو بھی ذمہ داریوں کا احساس دلائیں۔ ان سے اچھی خاصی بحث کر کے گئی تھی۔

''بی بی جان آپ کی طبیعت کی وجہ سے میں نے آپ سے ذکر نہیں کیا۔ انعم تو ارویٰ پر پہلے دن سے ہی تنقید کرتی چلی آرہی ہے شاید اسی کی وجہ سے سبرینہ کو بھی حوصلہ ملا ہے۔ وہ بھی روایتی انداز میں سوچنے لگی ہے۔'' ثمن بہت جھجک کر بول رہی تھی۔

بی بی جان کے چہرے پر واضح حیرت ابھر آئی تھی۔

''کیا مطلب سبرینہ کو کیا اعتراض ہے' اروی سے اسے کیا تکلیف ہے؟'' بی بی جان خاصی سنجیدگی سے استفسار کررہی تھیں۔

''بی بی جان میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' ثمن کی جھجک واضح تھی۔

''ثمن تم کھل کر کہو گھریلو مسائل سنبھالنے مجھے آتے ہیں۔''

''بی بی جان انعم آپ کو بتا تو گئی ہے۔ وہ بھی یہی چاہتی ہے کہ اروی باقاعدہ سے کچن وغیرہ کو سنبھالنے میں مدد دے۔''

''سبھی دیکھ رہے ہیں کہ وہ کس طرح اصم کو سنبھال رہی ہے۔ اصم اس وقت کسی بچے کی طرح ہے۔ اس کی ضد اس کی چڑچڑاہٹ صرف وہی برداشت کررہی ہے اس پر مزید کوئی ذمہ داری ڈالنا مناسب ہوگا؟'' بی بی جان کے دل میں بھی اروی کے لیے قدر ومنزلت تھی تبھی وہ اس کے احساس میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''بی بی جان میں تو سمجھتی ہوں لیکن نہ جانے سبرینہ کو کیا ہوتا جارہا ہے آئے دن کسی نہ کسی کام پر جھنجلانے لگتی ہے۔ اس کا میکے آنا جانا بھی کم ہوا ہے تو شاید اس لیے چڑچڑی ہورہی ہے۔ آپ شارم سے کہیں کہ اسے کچھ دن کے لیے میکے جانے دے۔ میں سنبھال لوں گی سب۔'' ثمن نے مصلحانہ حل پیش کیا۔

''تم کیسے سنبھال لوگی اکیلی۔ گھر میں دو، دو مریض ہیں۔ مہمانداری ہے اور بھی ذمے داریاں ہیں تم پر۔'' بی بی جان اس سے متفق نہیں تھیں۔

''بی بی جان میری مدد کے لیے شادو اور شمو ہیں۔ اروی بھی کچھ نہ کچھ تو کرہی لیتی ہے اور سچ پوچھیں تو اصم کا ناشتہ پانی جوس وغیرہ وہ خود ہی کرتی ہے کسی کو بھی زحمت نہیں دیتی'' ثمن نے صاف گوئی اپنائی۔

''پھر...... پھر سبرینہ کی چڑچڑاہٹ کا مقصد۔'' انہیں ذرا غصہ بھی آیا۔ ثمن کھل کر کچھ نہیں کہہ رہی تھی' انہیں پھر بھی اندازہ ہورہا تھا کہ صورت حال سنگین ہے۔ انعم کی ہٹ دھرمی ضد اور دوبدو ہونے والے رویے سے ان کے گھر کا ماحول اور بہوؤں کے مزاج متاثر ہورہے تھے انہیں کچھ تو سدباب کرنا تھا۔ کچھ توقف کے بعد قدرے سوچ کر بولیں۔

''چلو ٹھیک ہے میں شارم سے کہتی ہوں کہ سبرینہ کو کچھ دن کے لیے اس کی ماں کے پاس چھوڑ دے خواہمخواہ گھر کا ماحول خراب کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔''

''جی بی بی جان آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ سبرینہ کا چند دن کے لیے ماحول بدلنا ضروری ہے۔'' ثمن نے ان کی تائید کی تو وہ اسے معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگیں۔ وہ اٹھ کر ان کے لیے فروٹ لے آئی تھی۔

''سبرینہ کے بعد تم بھی رہ آنا اپنے میکے۔ تمہیں بھی کچھ آرام مل جائے گا۔'' بی بی جان نے پوری چاہت سے کہا۔

''نہیں بی بی جان میرا تو اب دل اپنے گھر کے سوا کہیں نہیں لگتا صبح سے شام گزارنی مشکل ہوجاتی ہے آپ بےفکر رہیں، فون پر خیر خیریت معلوم کرلیتی ہوں سب کی۔'' وہ مسکرا کر بولتی ان کے لیے سیب چھیلنے لگی۔ بی بی جان کو اس کی یہی خوبی تو گرویدہ کرگئی تھی کہ وہ سسرال کے ہر رشتے کے لیے محبت خلوص اور رواداری رکھتی تھی انہیں یکدم انعم کی خامیوں کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ صرف اپنی ایک ساس سے ہی اپنائیت نہیں برت سکی تھی۔ اسے صرف اپنی ذات سے محبت تھی اور باقی سب کو بھی اپنی محبت میں مبتلا دیکھنا چاہتی تھی۔ انہوں نے بےدلی سے ایک ٹکڑا سیب کا کھا کر باقی کھانے سے انکار کردیا۔

☆......☆

اروی اصم کے لیے سوپ بنا کر کمرے میں آئی تو خلاف توقع انعم اصم کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ جب سے انعم نے اس کے میکے والوں پر روبرو اعتراض کیا تھا وہ انعم سے کترانے لگی تھی ویسے بھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے حوالے سے اصم کے دل میں کوئی بدگمانی پیدا ہو اندر داخل ہوتے ہی اروی نے باقاعدہ سلام کیا۔

''السلام علیکم کیسی ہیں آپ۔''

''کیسی ہوں کا کیا مطلب؟ اللہ کا شکر ہے ٹھیک ٹھاک ہوں نظر نہیں آرہا کیا؟'' انعم کا انداز لٹھ مار تھا۔ اصم اس وقت نیم غنودگی میں تھا۔ یکدم چونک کر پوچھنے لگا کہ کیا ہوا۔

''ہونا کیا ہے آپ کی بیگم آپ کے لیے سو...... پ لائی ہیں......'' انعم نے کچھ بیزاری سے کہا۔ اروی جو خاموشی سے اصم کو تکیے لگا کر بیٹھنے میں مدد دے رہی تھی اس کی بیزاری محسوس کیے بغیر بولی ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ یہاں ہیں ورنہ میں آپ کے لیے بھی لے آتی اگر آپ کہیں گی تو میں لے آتی ہوں۔''

''اللہ نہ کرے جو مجھے ایسا بدمزہ یخنی ٹائپ سوپ زہر مار کرنا پڑے۔ اصم بھائی آپ سے یہ سوپ پیا جاتا ہے؟'' انعم کے رویے میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ اصم کو رویہ محسوس نہیں ہورہا تھا۔ آہ بھر کر مصنوعی سنجیدگی سے بولا ''کیا کروں میری بیگم کو یہی یخنی ٹائپ سوپ ہی بنانا آتا ہے۔'' اروی کو معلوم تھا وہ مذاق کررہا ہے لیکن انعم نے اسی کی بات کو پکڑ لیا۔

''واقعی...... ؟ ہاں صحیح ہے انہیں تو یخنی شوربہ' دال' سبزی ہی بنانی آتی ہوگی۔ بھائی آپ کا گزارا کیسے ہوگا؟ آپ تو تھائی، میکسیکو' اٹالینز' چائینز کھانوں کے شوقین ہیں آپ کی بیگم نے تو کبھی ان ڈشز کے نام سنے ہوں گے نہ ٹیسٹ کیا ہوگا۔'' انعم کے لہجے میں نمایاں طنز تھا۔ اروی کو سبکی سی محسوس ہوئی اس کے چہرے کا رنگ یکدم بدل گیا تھا۔ اصم بھی بہن کے انداز و لہجے سے تغافل برت رہا تھا۔ ''ہاں یہ تو ہے چلو آدھی زندگی مزے میں گزاری ہے اب باقی دیسی کھانوں پر گزارا ہو ہی جائے گا۔'' اصم نے اروی کو براہ راست شرارت بھری نظروں سے دیکھا۔ ''اصم سیکھنے سے سبھی کچھ آجاتا ہے میں سیکھ لوں گی آپ کو جو بھی پسند ہوگا۔'' اروی نے اپنی طرف سے مصالحانہ کوشش کی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''سیکھنے کے لیے بھی ٹیسٹ ڈیولپ کرنا ضروری ہوتا ہے بھابھی' ساگ' میتھی اور پارسلے' لیمن گراس میں بہت فرق ہوتا ہے۔'' انعم کا لہجہ مسلسل طنزیہ تھا اروی کی برداشت جواب دینے لگی۔''میں جاہل گنوار تو نہیں ہوں کہ مجھے فرق معلوم نہ ہو۔'' اروی نے سنجیدگی سے اپنا دفاع کیا۔اس کا کہنا غضب ہوگیا حسب معمول انعم کا پارہ چڑھ گیا۔

''دیکھ رہے ہیں اصم بھائی کیا میں نے انہیں جاہل گنوار کہا ہے' انہیں بات کرنے کا طریقہ ہی نہیں ہے۔''

''میں نے آپ سے کیا کہا ہے انعم؟ بلکہ آپ ہی مسلسل مجھے جتاتی رہتی ہیں کہ میں آپ لوگوں سے وابستہ ہونے کے لائق نہیں تھی۔ میرے گھر والے یہاں آنے کے قابل نہیں ہیں۔'' اروی کو بھی خود پر اختیار نہ رہا۔سوپ باؤل سے آخری چمچ بھرا ہوا اس کے ہاتھ سے دوبارہ پیالے میں گر گیا۔

''اروی...... انعم کے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا۔''

اصم کو سمجھ ہی نہیں آئی کہ اچانک مذاق سنجیدگی میں کیوں بدل گیا۔''انعم کا شروع دن سے یہی مقصد ہے مجھے ذلیل کرنا آپ کو میری تذلیل محسوس نہیں ہوتی یہ اور بات ہے۔''

اروی جھٹکے سے اٹھی۔''اروی مذاق کی بات کو اشو نہ بناؤ۔'' اصم کو اروی پر غصہ آیا۔اس کا لہجہ سنجیدہ ہوگیا

''میں ایشو بنا رہی ہوں؟'' اروی نے افسوس وملال سے دیکھا اور سوپ کے برتن اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

اصم نے پکار کر روکا بھی مگر وہ رکی نہیں۔

''آپ کی بیگم کو صرف اپنی سنائی آتی ہے کسی کی سنتی ہیں۔ سمجھا لیں اسے میرے ساتھ الجھنے کی کوشش نہ کرے۔''

انعم کو بھی کب کسی کا لحاظ تھا۔ اصم کو سمجھ نہیں آئی کہ کیا کرے جھنجلا کر انعم کو مخاطب کیا''انعم تمہیں بھی کیا ضرورت تھی یہ سب جتانے کی۔''

''ہاں تو میں نے کیا غلط کہا تھا۔اور دیکھا ہے آپ نے اس کا ایٹیٹیوڈ میں آپ کی بہن ہوں اپنے بھائی سے ہنسی مذاق بھی نہیں کر سکتی۔'' وہ اپنی بات پر اثر رکھنے کے لیے رونے لگی۔

''انعم اب تم بھی۔ میری بات کا غلط مطلب نہ لو۔'' اصم پریشان ہوگیا۔اسے اروی پر غصہ آنے لگا۔

''صحیح کہتے ہیں لوگ بھائی شادیوں کے بعد بدل جاتے ہیں۔'' انعم بھی جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔'' بیوی کے بہکاوے میں آ جاتے ہیں۔''

''ایسا کیوں سوچتی ہو انعم۔ایسا کبھی ہو سکتا ہے۔اور اروی کی جرات بھی نہیں ہے کہ وہ کسی کے خلاف میرے پاس بات کر سکے۔'' اصم نے دلجوئی کرنے کی کوشش کی۔

''سب جانتی ہوں کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ میرے بھائیوں کو دیکھو اپنی بیویوں کے لیے کیسے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جبکہ میرا شوہر...... اس نے تو مجھے دھتکار کر نکال دیا تھا گھر سے۔ آپ کو کچھ پتہ نہیں ہے اصم بھائی، فائق اور اس کی ماں نے مجھ پر کیسے ظلم کیے ہیں۔'' انعم اصم کو خود پر ہونے والے مظالم کی داستان سنا رہی تھی اور وہ پے در پے صدمے سے گزر رہا تھا اس کی بہن اتنی اذیت سے گزری تھی۔ اس کے اندر اشتعال سا اٹھنے لگا تھا۔

☆......☆

اروی کچن میں برتن رکھنے آئی تو اس کی آنکھیں ضبط گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ثمن بھی اچانک کسی کام سے کچن میں آ گئی تھی۔

''اروی انعم تمہارے روم میں ہے نا جاؤ گی تو پلیز اسے کہنا بی جان اسے بلا رہی ہیں۔'' اروی نے ثمن کی موجودگی میں فوراً اپنا رخ سنک کی طرف موڑ لیا۔

''ثمن بھابھی آپ شمو کو بھیج کر پیغام دے دیں ابھی میں نہیں جا رہی۔'' کوشش کے باوجود اس کی آواز لرز کر بھاری ہوگئی۔

''کہ...... کیا ہوا؟'' ثمن بھی چونک کر متوجہ ہوئی'' کچھ نہیں۔ ابھی مجھے کچن میں کام ہے تو......'' وہ نل کھول کر برتن دھونے لگی۔

''انعم نے کچھ کہا ہے؟'' ثمن کے لہجے میں تشویش تھی۔

''وہ کب کچھ نہیں کہتیں۔ اچھا ہے آج اپنے بھائی کو بھی قائل کر لیں گی کہ میں ان کے قابل نہیں ہوں۔'' اروی یکدم روہانسی ہوگئی بلکہ آنسو چھلک بھی پڑے۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اور انعم اتنی بے وقوف تو نہیں تھی پتہ نہیں اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔'' ثمن نے بڑھ کر اس کا رخ موڑا'' بھابھی آخر میں نے انہیں کیا تکلیف دی ہے جو وہ میرے ساتھ اس طرح کرتی ہیں۔ میں تو ہمیشہ ان کی بھی عزت کرتی ہوں۔'' اروی رونے لگی۔

''وہ شاید...اپ سیٹ ہے۔اس لیے وہ ٹھیک ہو جائے گی فکر نہیں کرو۔بس تم اپنا دل خراب مت کرو میں سمجھاؤں گی۔'' ثمن بھی جانتی تھی کہ یہ محض بہلاوا ہے انعم سمجھے سمجھانے کی حد سے گزر چکی تھی اروی سے اسے ضد یا چڑ تھی جو دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی اروی بھی رو دھو کر چپ ہوگئی اس کے پاس فی الحال کوئی حل نہیں تھا سوائے مصلحت آمیز خاموشی کے اسے دکھ تھا تو صرف اصم کے رویے کا وہ اس کے خلوص ومحبت کو سمجھتا ہی نہیں تھا۔ وہ اپنے لیے اصم کو کسی کے خلاف کھڑا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کے خلاف بولے تو تھوڑا سا تو ساتھ دے۔ نہ کہ مخالف کے ساتھ مل کر اسے مزید دکھ وملال میں مبتلا کر دے وہ کچن سے نکل کر لان میں چلی آئی۔

☆......☆

شارم اپنے آفس کیبن میں ذرا فرصت سے بیٹھا تھا۔ سہ پہر تک کافی مصروفیت رہی تھی۔ اصم کی غیر موجودگی سے کام کا آدھا بوجھ اس کے کندھوں پر آ پڑا تھا بلکہ دونوں بھائی ہی اس کے شروع کیے پروجیکٹس کو دیکھ رہے تھے اب بھی ضیغم بھائی کے ساتھ کام کے حوالے سے تبادلۂ خیال کر کے آفس میں چائے پینے بیٹھا تھا۔ آدھی چائے ابھی کپ میں باقی تھی جب اس کا موبائل فون رنگ ٹون بجانے لگا۔ بی بی جان کی تصویر اسکرین پر جلوہ نما تھی۔

شارم یکدم چونک کر کال ریسیو کرنے لگا بی جان کبھی خود سے کال نہیں کیا کرتی تھیں سوائے کسی ہنگامی صورت حال کے اسے کچھ گھبراہٹ ہونے لگی۔ ریسیونگ بٹن کے باوجود اس کی آواز نہیں نکل پائی تھی دوسری طرف مسلسل بی بی جان کی ہیلو...... ہیلو کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شا...... رم...... میری آواز نہیں آ رہی؟'' چند

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

لمحوں بعد وہ نہیں بول پایا۔

''السلام علیکم جی بی بی جان...... آپ کی طبیعت......''

''مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی تھی جو میں گھر پر نہیں کرنا چاہتی تھی۔'' بی بی جان کی بات سے اس کے چہرے پر تفکر اور ذہن میں الجھن بڑھ گئی۔ نجانے کیا بات تھی۔

''جج......جی؟ جی حکم بی بی جان۔'' شارم کو محسوس ہوا تھا وہ اس پر کوئی ذمہ داری ڈالنے والی ہیں۔

''شارم۔ اصم کے ایکسیڈنٹ کے بعد اور میری بیماری کی وجہ سے سبرینہ اور ثمن کو کہیں آنے جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔''

بی بی جان نے اپنی بات کے دوران کچھ توقف کیا۔ شارم کو مزید تجسس و بیقراری ہوئی ''تو پھر کیا ہوا بی بی جان حالات معمول پر آجائیں گے تو چلے جائیں گے وہ لوگ بھی۔'' شارم نے ان کی ادھوری بات کے درمیان میں ہی اپنی رائے دی۔

''نہیں...... میں چاہتی ہوں کہ تم سبرینہ کو کچھ دن کے لیے اس کی ماں کے گھر بھیج دو۔'' بی بی جان کی نرمی میں مصلحت وقطعیت تھی۔ ''مگر کیوں بی بی جان۔ کیا سبرینہ نے کچھ کہا ہے۔ شارم کو تشویش ہونے لگی۔ سبرینہ کے حوالے سے کبھی بھی بی بی جان نے اس پر کوئی فیصلہ نہیں صادر کیا تھا۔ اب اچانک ان حالات میں وہ الجھن میں تھا'' کچھ باتیں کہے بغیر بھی سمجھ لینی چاہئیں بیٹا' اس کی روٹین تھی ہر پندرہ دن بعد ماں کے پاس جا کر رہنے، اب اتنے مہینوں سے وہ ہمارے لیے پابند ہے تو ہمیں بھی اس کا خیال کرنا چاہیے۔'' بی بی جان کا رویہ ہنوز ویسا ہی تھا۔

''بی بی جان مجھے تو اس وقت یہ مناسب نہیں لگ رہا خیر آپ کہہ رہی ہیں تو'' شارم ہچکچا کر بولا۔

''اور ہاں اسے حیل وحجت کے بغیر چھوڑنے جانا۔ خوامخواہ کا بحث مباحثہ مت کرنا۔'' بی بی جان کو اگر بیٹوں کی خوبیوں خامیوں کا پتہ تھا تو آگہی وہ بہوؤں سے بھی رکھتی تھیں۔ کس کی کیا فطرت ہے۔ کس میں کتنی برداشت ہے وہ جانتی تھیں، شارم ان سے بات کرنے کے بعد سبرینہ کو جانے کی تیاری کرنے کے لیے فون کرنے لگا۔

☆......☆

نیلم لان میں کچھ کتابیں لیے بیٹھی تھی۔ اس کے مڈٹرم ہونے والے تھے۔ اس کے باوجود کتابوں میں اس کا دھیان نہیں تھا۔ خیالات ہر وقت گڈمڈ رہنے لگے تھے۔ دل بغاوت پر اکساتا اور ذہن اروی کی باتوں پر الجھتا رہتا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے اروی سے بھی خدشہ رہنے لگا تھا کہ کہیں وہ کسی کو اس کے بارے میں بتا نہ دے یا پھر اس کی ٹوہ لے کر اسے رنگے ہاتھوں پکڑوا ہی نہ دے۔ وہ اسی شک وشبے میں مبتلا ہو کر کئی دنوں سے احتیاطاً اپنی دوستوں بالخصوص عامر اسد سے فون کے علاوہ رابطہ نہیں کیا تھا۔ واٹس اپ اور فیس بک پر عامر کو وقتی طور پر بلاک بھی کررکھا تھا۔ سارہ اسی لیے جھنجلائی تھی اور اب اچانک اس کے سر پر آدھمکی تھی۔ نیلم سارہ کو اچانک دیکھ کر حیران و پریشان ہوگئی۔

''پڑھائی ہو رہی ہے۔''

''تم!!......؟'' نیلم نے بے ساختہ ادھر دیکھا جہاں سے وہ آئی تھی۔ شمو واپس اندر جا رہی تھی۔ سارا کو شمو ہی لان تک لائی تھی۔ ''ہاں...... ہاں میں۔' اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو۔ پہلی بار تو تمہارے گھر نہیں آئی۔''

''نہ......نہیں وہ تم نے بتایا نہیں تھا آنے کا۔'' نیلم نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ ''سٹوپڈ گرل تم نے فون بھی آف کررکھا ہے اور نیٹ پر بھی آن لائن نہیں ہو رہیں کیسے بتاتی تمہیں؟'' سارہ بے تکلفی سے دھپ کر کے اس کے پاس گھاس پر ہی بیٹھ گئی۔ ''ہاں بس وہ بی بی جان کی وجہ سے۔'' اس کی گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔ ''جھوٹ نہیں بولو۔ تم دراصل فضہ کی باتوں میں آگئی ہو جبھی عامر بھائی کو بھی بلاک کررکھا ہے اور مجھے بھی۔'' سارہ نے قدرے ناراضگی سے کہا تو نیلم سر ہلا کر رہ گئی۔

''ایسی بات نہیں ہے سارہ تمہیں معلوم تو ہے میں نے فضہ کی باتوں کو اہمیت نہیں دی تھی۔''

''پھر کیا وجہ ہے کس کے کہنے پر یہ احمقانہ حرکتیں کر رہی ہو۔ پتہ ہے عامر بھائی کی تو جان پر بن آئی ہے۔ تم سے بات نہیں کی۔ تمہیں دیکھا نہیں بالکل مجنوں بن گئے ہیں تمہارے دو دن کے فراق میں۔'' وہی لے کر آئے ہیں مجھے یہاں۔'' سارہ اسے حیران دیکھنا چاہتی تھی وہ ہراساں ہوگئی۔

''کیا......! سارہ تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔ انہیں یہاں کیوں لے کر آئی ہو۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔'' نیلم کا منہ خشک ہونے لگا'' یار تم کتنی ڈرپوک ہو۔ بے وقوف کسی کو کیا پتہ تمہارے اس قلعہ نما گھر کے باہر کون کھڑا ہے کون نہیں۔ فضول کا بچپنا نہ دکھاؤ۔''

''یہ بچپنا نہیں ہے سارہ۔ میں کیسے بتاؤں میری ایک بھابی کو شاید مجھ پر شک ہو گیا ہے۔ اگر گھر میں سے کسی اور کو معلوم ہو گیا تو سوچو میرا کیا حشر ہوگا۔'' نیلم واقعی ڈری ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس نے اروی کو لان میں ہی ٹہلتے دیکھا تھا'' یار اس ڈر سے باہر نکلو۔ ایک دن تو سبھی کو پتہ چلنا ہے نا پھر کیا کرو گی' اس لیے میری جان Be brave'' سارہ نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ ''ابھی مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے پلیز تم انہیں کہو یہاں سے چلے جائیں۔ میرے لیے مشکل ہو جائے گی۔'' نیلم روہانسی ہو رہی تھی۔ ''تم نا بہت ناشکری ہو ایک بندہ تمہارے پیچھے دیوانہ ہے اور تمہیں کوئی پروا ہی نہیں۔'' سارہ برا مناتی غصہ دکھاتی کھڑی ہوگئی۔

''سارہ تم میری مجبوری سمجھو۔'' نیلم گڑگڑا سی گئی۔

''کیا کہوں کب ملو گی ان سے کوئی آس، امید کوئی پیغام'' سارہ نے خراب موڈ سے ہی پوچھا۔

''میں...... میں کال کرلوں گی۔'' وہ فوراً بولتی ساتھ کھڑی ہوگئی۔

''کر لینا اور یہ بھی کہہ دینا نیکسٹ ٹائم مجھ سے فریادیں نہ کریں۔ مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔''

''پلیز سارہ تم تو ناراض نہیں ہو۔ آؤ اندر چل کر بیٹھتے ہیں...... میں تمہارے لیے چائے بنواتی ہوں۔''

''میں ناراض نہیں ہوں اور چائے پھر کبھی پی لوں گی ابھی مجھے جانے دو ورنہ باہر کھڑا تمہارا مجنوں دیوار پھلانگ کر اندر آجائے گا۔ دیکھو میسج پر میسج ٹائپ کر رہا ہے۔'' سارہ نے اس کی نظروں کے سامنے فون لہرا کر دکھایا اور پھر اس کے ساتھ ہی بیرونی راستے کی طرف بڑھ گئی۔ نیلم پورچ تک ہی جا سکتی تھی کیونکہ گیٹ تک جانے کی اجازت نہیں تھی بلاوجہ۔

☆......☆

سبرینہ کو خوشی کے ساتھ حیرانی بھی ہو رہی تھی۔ شارم نے آفس سے آتے ہی اسے میکے جا کر رہنے کا مژدہ سنایا تھا بظاہر اس نے رسمی سا انکار بھی کیا تھا لیکن شارم کو بی بی جان کی جو ہدایت تھی وہ اسے اسی طرح جانے کو کہہ رہا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''شارم پہلے بی بی جان سے اجازت تو لے لیں۔ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو۔'' وہ الماری کے پٹ کھلے چھوڑ کر پلٹ کر پوچھنے لگی۔ ''میں انہیں جا کر بتا دیتا ہوں کہ آنٹی صالحہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے تمہارا جانا ضروری ہے۔''

''مگر شارم مما تو میرا مطلب ہے دو دن پہلے ہی وہ بی بی جان سے مل کر گئی ہیں اور......'' سبرینہ کو جانا تو تھا مگر اپنی ذات بچا کر۔

''اور کیا یار...... تم خود ہی تو مجھے کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کچھ دن کا بریک چاہیے۔'' شارم زچ ہوا۔

''اس دن آپ نے سو سو باتیں سنائی تھیں۔ مجھے کتنا لمبا لیکچر دیا تھا۔'' سبرینہ نے شوہر کو بھرپور انداز میں جتایا۔

''اس دن بھی میں اپنی وجہ سے کہہ رہا تھا۔ تمہاری عادت جو ہو گئی ہے۔ ویل اب مجھے احساس ہو گیا کہ واقعی تمہیں بھی ریسٹ کی ضرورت ہے۔ تبھی تم مجھے ٹائم دے پاؤ گی۔''

شارم نے شوہرانہ محبت جتائی تو سبرینہ کا دل مزید لہک اٹھا۔ احساس تفاخر سے ذہن نے ایک لمحے میں کیا کچھ سوچ ڈالا۔

''تھینکس آپ نے میرا اتنا خیال کیا۔ اب جائیں بی بی جان کو بتا دیں۔ میں تب تک کچھ ضروری چیزیں اور ڈریسیز بیگ میں رکھ لوں۔'' اس نے باقاعدہ شارم کو باہر جانے کے لیے دھکیلا۔ ''اور پلیز شمو سے کہیے گا سمعیہ کو لے کر آئے ابھی اس کا بیگ بھی تیار کرنا ہے۔'' سبرینہ کو واقعی جانے کی خوشی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت دنوں بعد رہائی ملی ہو۔

☆......☆

سارہ جب سے مل کر گئی تھی۔ نیلم عجیب سی بے کلی میں مبتلا تھی اپنے کمرے میں آتے ہی وہ بے اختیار رو کر رونے لگی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ محبوب در پر آ کر بنا دید کے پلٹ گیا تھا اور وہ دنیا کے ڈر وخوف سے خود پر جبر کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دنیا کو تہس نہس کر دے یا پھر خود کو۔ وہ متضاد سوچوں میں گھری کشمکش کا شکار تھی۔ آخر دل نے بغاوت پر اکسایا اور وہ منقطع رابطے بحال کرنے لگی۔

سارہ ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے فون سیٹ کا سوئچ آن کرنے کے بعد اپنے لیپ ٹاپ کو چارج کرتے ہوئے خود کو بہت مطمئن پایا۔ عامر کے سوا میں کسی اور کو سوچ بھی نہیں سکتی تو پھر میں اسے ناراض کیوں کروں۔ گھر والے تو آخر مان ہی جائیں گے۔'' محبت کا بھرپور احساس اسے تھپتھپا کر تقویت دے رہا تھا اور اروی بھابھی بھی ایسی نہیں لگتیں کہ میرے خلاف کسی کو بھڑکائیں گی۔ میں انہیں سمجھا لوں گی۔ اپنے آپ کو تسلیاں دینا محبت کرنے والوں کا شیوہ ہے۔ اسے اپنی محبت پر بھروسہ تھا۔ تبھی وہ مطمئن ہو کر پہلے سارہ سے رابطہ کر رہی تھی۔

☆......☆

اروی کمرے میں جب سے آئی تھی دونوں کے درمیان بالکل خاموشی تھی۔ دونوں ہی اپنے اپنے احساسات کے زیر اثر تھے۔ آخر اصم نے ہی پہل کر کے اپنے احساس سے نکلنے کی کوشش کی۔

''اروی آج انعم کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔'' اصم نے اسے دیکھے بغیر مخاطب کیا

''تو کیا مجھے اچھا لگا؟'' اس کے لہجے سے ناراضگی صاف عیاں تھی۔

''انعم کی عادت ہے وہ اسی طرح بات کرتی ہے تم ایسے ہی ہائپر ہو گئیں۔'' اصم نے ایک بار پھر بہن کا دفاع کیا۔

''ہاں ان کی عادت ہی ہے دوسروں کی عزت نفس کو مجروح کرتے رہنا۔'' اروی کی تلخی کم نہیں ہو رہی تھی۔ آخر اسے کسی کے سامنے تو دل کی بھڑاس نکالنی تھی۔ ''اروی پلیز بات کو غلط رنگ مت دو۔ وہ مذاق کر رہی تھی اور تم نے اس کے مذاق کو سر پر سوار کر لیا ہے۔'' ''مذاق بار بار اڑایا جائے تو مجھ جیسوں کے سر پر ہی نہیں دل پر بھی بوجھ بن کر آ پڑتا ہے۔'' اس بار وہ روہانسی ہو گئی۔ آواز گھٹ گئی تھی اس کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ اپنے موقف کو دوسرے پر ظاہر کرتے ہوئے بے بس ہو جاتی تھی۔ ''اس نے ایسا کیا کہہ دیا تھا اروی جو تم اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہو۔'' اصم کو اس کا رونا سمجھ میں نہیں آیا۔

''دکھ تو اسی بات کا ہے اصم کہ آپ کو وہ باتیں مذاق محسوس ہوتی ہیں جن سے میری اور میرے گھر والوں کی حیثیت و وقعت کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ انعم نے کئی بار میرے گھر والوں کے آنے پر اعتراض کیا ہے۔'' وہ بالآخر بول ہی اٹھی تھی۔ کبھی کبھی گھٹ کر رہنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اس مشکل سے گھبرا گئی تھی۔ ''ایسا کچھ نہیں ہے اروی تم زیادہ فیل کر رہی ہو۔ میں مان ہی نہیں سکتا کہ انعم یا گھر کا کوئی فرد کسی مہمان کے آنے پر اعتراض کر سکتا ہے۔'' اصم بے یقین تھا۔

آپ کو میرے کہنے پر یقین نہیں آئے گا میں جانتی تھی آپ کبھی ثمن بھابی سے پوچھ لیجیے گا وہ تو جھوٹ نہیں بولیں گی۔'' وہ اپنی بات کہہ کر بستر سے اٹھی اور وضو کرنے کے لیے باتھ روم میں جا گھسی اصم بے چین سا ہو گیا تھا۔ انعم کی باتیں اس کا رویہ جو وہ اروی سے برتتی تھی آہستہ آہستہ ذہن کے پردے پر مکرر ہونے لگا۔

☆......☆

شارم سبرینہ کو سسرال چھوڑ کر وہاں کھانا کھا کر آیا تھا۔ سبھی اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے ایک بار پھر بی بی جان کے پاس چلا آیا تھا۔ جب سے بی بی جان نے سبرینہ کو میکے لے جانے کا کہا تھا وہ تب سے پریشان ہو گیا تھا۔ اسے غیر معمولی سا احساس ہو رہا تھا کہ ضرور سبرینہ نے انہیں میکے بھجوانے پر مجبور کیا ہے جبکہ گھر میں اس وقت تک سبرینہ اور ثمن کی بےحد ضرورت تھی۔

''بی بی جان ایک بات پوچھوں۔'' تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد شارم نے سوال کیا تو وہ مسکرا دیں۔

''میں جانتی ہوں تم کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ گھر کی فضا کو سازگار رکھنے کے لیے ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔'' تحمل سے کہتے ہوئے ساتھ بیٹھے بیٹے کو تھپتھپایا ''اس کا مطلب ہے آپ کے اسٹریس کی وجہ سبرینہ تھی۔''

''نہیں بالکل نہیں۔ بلکہ وہ شاید اسٹریس میں تھی۔ ثمن اور اس پر ذمہ داری بھی تو بڑھ گئی تھی۔ میں نے اسی لیے سوچا ہے کہ باری باری کچھ دن اپنے اپنے میکے میں گزار لیں وہ ہمارا خیال رکھتی ہیں تو ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ ہم بھی ان کا خیال رکھیں۔'' بی بی جان کے لب ولہجے میں محبت و ممتا بدرجہ اتم موجود تھی۔ شارم نے بی بی جان کے لیے مزید عقیدت ومحبت محسوس کی ورنہ تو یار دوستوں سے گھریلو سیاستوں کے ایسے ایسے قصے سن رکھے تھے جو ذہن ودل کو لرزا دیتے تھے۔ ان کے گھر میں ایسا نہیں تھا یہی بات قابل اطمینان تھی۔ ''بی بی جان شکر ہے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

آپ نے مجھے ٹینشن سے بچالیا ورنہ میں پتہ نہیں کیا کیا سوچتا رہتا'' وہ متشکر ہو کر بولا۔

''چلو اچھا ہے ذہن صاف کرلینا اب گھر کے کسی معاملے پر الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ اب آرام کرو صبح آفس تو جانا ہوگا۔'' بی بی جان نے اسے تھپک کر کہا۔ شارم کو اچانک بابا جان کا خیال آیا۔''بابا جان؟'' استفسار کرتے ہوئے نظروں سے انہیں کمرے میں ڈھونڈا بھی''اس وقت وہ اصم کے پاس ہوتے ہیں یا پھر اپنی اسٹڈی میں۔ ابھی آجائیں گے۔'' بی بی جان نے بیٹے کی تشفی کے لیے بتایا۔ وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر ان کے پاس سے اٹھ گیا۔

☆......☆

سمعیہ کے سونے کے بعد تینوں ماں بیٹیاں بہت اطمینان سے لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ صالحہ کئی بار اپنی حیرت کا اظہار کرچکی تھیں۔ بلکہ ان کے دل میں تو خدشے بھی سر اٹھا رہے تھے کہ کہیں شہرینہ اور فائق کے نئے تعلق کے بارے میں تو کسی کو پتہ نہیں چل گیا وہ کہے بغیر نہ رہ سکیں۔

''سبرینہ مجھے تو حیرت ہے تمہاری ساس نے اپنی طبیعت کی خرابی کے باوجود تمہیں آنے کیسے دیا؟''

''مما! بتایا تو ہے کہ شارم نے خود یہ اسٹیپ لیا ہے وہ بھی دیکھ رہے تھے کہ میں کولہو کا بیل بنی ہوئی ہوں اور سچ پوچھیں تو میں نے دن رات اپنی تھکن جتائی بھی بہت ہے۔'' ایک آنکھ بھینچ کر اس نے اپنی چالاکی کا اعتراف کیا۔

''تو کیا شارم بھائی تمہاری بات پر یقین کرلیتے ہیں؟'' شہرینہ نے تجسس کا اظہار کیا۔

''تو اور کیا؟ اسی لیے تو کہتی ہوں کچھ سیکھ لو۔ کام آئے گا تمہارے شادی کے بعد تھوڑے سچ جھوٹ کو ملا کر ہی شوہر کا بھروسہ جیتا جاتا ہے ورنہ سسرال والوں کی نکتہ چینیاں ایک دن ٹکنے نہ دیں۔'' اس نے بہن کو بے لاگ مشورہ دیا۔

''فائق اتنا سیدھا نہیں ہے رینا۔ اسے الو بنانا آسان ہوتا تو انعم اپنے میکے نہ بیٹھی ہوتی۔'' شہرینہ بہن کا اشارہ سمجھ کر منہ بنا کر بولی۔

''صحیح کہہ رہی ہو انعم میں وہ صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ورنہ ہر مرد الو بن جاتا ہے۔ بنانے والے کو بنانا آنا چاہیے۔'' اپنی بات کہہ کر اس نے خود ہی بے اختیار قہقہہ لگایا۔ صالحہ نے فہمائشی نظروں سے دیکھا''بس رینا مذاق چھوڑو۔ بہن کو الٹے سیدھے مشورے نہ دو۔ یہ پہلے ہی ڈر رہی ہے۔'' صالحہ نے شہرینہ کو ایک نظر دیکھ کر سبرینہ کو سمجھایا۔

اس خوب صورت ناول کی اگلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیے

''املتاس''

'سچی کہانیاں' میں ایک نہایت ہی مقبول کامیاب ترین سلسلے وار ناول 'تاشون' کے بعد معروف اور مقبول کہانی کار شازلی سعید مغل ایک نیا تہلکہ خیز سلسلے وار ناول لے کر آئی ہیں۔

'املتاس' سحر و اسرار کا ایک ایسا انوکھا سلسلہ' جو آپ نے آج تک نہیں پڑھا ہوگا' یہ ہمارا صرف دعویٰ ہی نہیں یقین بھی ہے......!

''املتاس''

پہلی قسط 'سچی کہانیاں' کے پُراسرار نمبر شمارہ اکتوبر 2017ء میں ملاحظہ فرمائیے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ناولٹ

اے دشمنِ جاں

شادی کی رات گھونگٹ پلٹتے ہی وہ اپنے دولہا کو دیکھ کر بے ہوش ہوگئی اور آخری جملہ بس یہ نکلا آپ نعمان مسعود ہیں۔ ڈراموں والے...

وہ بڑے زور سے گری تھی گھٹنے پر اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔ ایک دم ہی بڑا نیل سا پڑ گیا تھا۔

''اری کم بخت ڈھینگ کی ڈھینگ ہوگئی ہے۔ ذرا آنکھیں کھول کر تو چلا کرناں۔''

دادی کو اس کے گرنے کی آوز سنائی دے گئی تھی وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔ اس کا دل جل کر رہ گیا۔

ایک تو دادی اماں بھی ناں اتی زور کی چوٹ لگی ہے پر انہیں تو۔

''زری اب کہاں رہ گئی شاہ نواز سے کتنی بار کہا ہے کہ میری نئی عینک بنوادے پر اسے کہاں فرصت، ماں اندھیروں میں ٹٹولتی پھرے۔'' انہیں اب بیٹے سے گلا تھا۔

''اے دادی ابھی تک ایسی عینک ایجاد نہیں ہوئی جو دیواروں کے پیچھے سے بھی صاف دکھا دے۔''

وہ اپنی چوٹ سہلاتے بمشکل دالان تک آئی

''تیری زبان بڑی چلتی ہے اس کترنی کو ذرا قابو میں رکھ ورنہ کاٹ کر رکھ دوں گی۔''

اس نے ایک نگاہ بھر کر اس بوڑھے ہڈیوں کے وجود کو دیکھا، جان ذرا نہ تھی بڑی بی میں اور باتیں من من بھر کی کرتی تھیں۔

''تمہیں تو نا بس میری زبان سے ہی گلہ رہتا ہے پوچھا تم نے کہ کیا ہوا زندہ ہے یا مرگئی۔'' چڑ کر بولی۔

''اے زندہ بھی ہے اور میرے سینے پر مونگ بھی دل رہی ہے۔'' انہوں نے سروتے سے چھالیہ کترتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔

''بس تمہیں تو یہی گلہ ہے کہ تمہارے سینے پر مونگ دل رہی ہوں ایسا ہی تھا تو پیدا ہوتے ہی میرا گلہ گھونٹ دیتیں ناں۔''

اندر ہی اندر آنسو اترنے لگے تھے پر دیکھنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

میں ایک دم ڈھیٹ بنی رہی۔

''گھونٹ دیتی تیرا گلا بھی اگر تیری اماں تیرے پیدا ہوتے ہی اس جہاں سے رخصت نہ ہو جاتی۔ اب ذرا انتظار ہی کر لیتی پر میری صبیحہ کو تو تو کھا گئی۔ ہائے میری صبیحہ ایسی پیاری لڑکی کیسے ارمانوں سے اپنے شاہ نواز کے لیے بیاہ کر لائی تھی۔ کیسا خیال رکھتی تھی میرا ہائے ہائے اری صبیحہ دیکھ تو ذرا آ کے یہ تیری لاڈلی جس کی خاطر تو نے اپنی جان دے دی کیسا پٹر پٹر زبان چلاتی ہے مجھ سے۔''

ان کا پرانا ٹیپ ریکارڈ چلنا شروع ہو گیا تھا۔

''اگر زندہ ہوتیں ناں اماں! تو کون سا بخش دیتی تم انہیں دادی۔ اب مر تو چکی ہیں۔ واپس تو آ نہیں سکتی۔ ہونہہ اب محبت جتاتی ہیں مجھے کیا پتہ اس وقت بھی یونہی باتیں بناتی ہوں گی۔''

وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھی دن خاصا چڑھ آیا تھا باورچی خانہ ابھی تک سونا پڑا تھا نجانے کیا بات تھی ابھی تک بوا نہیں آئی تھی۔

ناں آئے تو ناں آئے چاہے بازار سے کھانا آئے میں کیا کروں؟

ایک اور ناگوار جذبہ اندر پھوٹا تھا یہ بوا بھی خوب عورت تھی ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی تھی جان بوجھ کر دیر سے آتی تاکہ آتے ہی کوئی آسان سی چٹ پٹ ہانڈی تیار کر دے۔ اس کی تو خیر تھی پر دادی سے بھوک برداشت نہ تھی۔ کتنی ہی پٹیاں پڑھا ڈالی تھیں پر اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی۔

''بس اب باورچی خانہ سنبھال سجل آ گے بھی یہی کام کرنا ہے شادی کے بعد سو طرح کے جھنجٹ ہوتے ہیں کھانا پکانا تو عورت کا ہتھیار ہے اگر اس میں مہارت نہ پیدا کی تو عورت ذات کا فائدہ کیا۔

پر سجل بی بی کو اس قسم کی باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا حالانکہ خود کنول نے بھی شادی سے پہلے بوا سے ہی کھانا پکانے کی ٹریننگ لی تھی اور اب روٹی سے لے کر بریانی تک سارے ہنر آ گئے تھے۔

شاہ نواز کی بڑے بازار میں کریانے کی اچھی خاصی دوکان تھی خدا نے دو بیٹیاں دیں تھیں۔ سجل کی پیدائش پر صبیحہ بیگم نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لی تھیں اس وقت شاہ نواز کی ماں نے ہی اپنی پوتیوں کو اپنے پروں میں سمیٹا۔ انہیں اپنی بھتیجی کی جوان موت کا بڑا قلق تھا جسے وہ بڑے چاؤ سے اپنے بیٹے کے لیے بیاہ کر لائی تھیں پورے خاندان میں صبیحہ اور شاہ نواز کی جوڑی مثالی تھی پر شاید اس گھر کی خوشیوں کو کسی کی نظر کھا گئی۔ صبیحہ کے جانے کے بعد بوڑھی ماں نے کئی بار کبھی دبے لفظوں میں اور کبھی کسی کے ذریعے بیٹے سے دوسری شادی کرنے کو کہا پر بیٹے نے تو جیسے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا تھا۔ پہلے بھی زندگی کی مصروفیات میں صرف دکان ہی شامل تھی پر اس میں صبیحہ کی محبت کی ٹھنڈک اور خوبصورتی بھی تھی لیکن اس کے بعد تو جیسے وہ صرف اپنی دکان تک ہی محدود ہو کر رہ گیا۔ بیٹے کی دبی دبی سی گزارش ماں نے سن لی اور پر وہ چپ ہو رہیں خدا کا شکر تھا کہ کنول صبیحہ کی طرح خوش شکل خوش مزاج تھی ابھی بی کام کر رہی تھی کہ ایک اچھا رشتہ آ گیا اور یوں وہ پیا کے دیس سدھاری سجل اس سے پورے چار برس چھوٹی تھی اب اس کی بھی شادی کی عمر تھی انٹر کے بعد تھرڈ ائیر کا انگریزی کا پرچہ نجانے کون انگریز کا بچہ بناتا تھا کہ اس میں وہ ہمیشہ ہی رہ جاتی یوں کالج سے ہمیشہ کی رخصت لی اور گھر آ بیٹھی۔ کنول کے سمجھانے بجھانے پر پرائیویٹ داخلہ تو لے لیا تھا پر اس بار بھی یہ پل پار کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔

''سجوائے سجواری کہاں مر گئی؟''

نوریا اپنی چھوٹی سی پونی جھلاتی وارد ہوئی کہ وہیں دالان میں بڑی بی نے پکڑ لیا۔

''اے بیٹا! بھلا یہ بھی کوئی انداز ہوا نہ سلام نہ دعا۔ اے آن کی آن میری بچی کو مرنے کی بددعائیں دے رہی ہو۔''

''ارے دادی! میں کب سجو کو مرنے کی بددعائیں دے رہی ہوں بس یونہی منہ سے پھسل گیا ہوگا۔''

نوریا ان کی پکڑ میں آ چکی تھی۔ اب گھنٹے بھر کی کلاس تو انہیں لینا ہی تھی۔

''بھئی خوب تربیت کی ہے رخشندہ نے بچیوں کی۔ ارے بیٹا دعا بھی تو دے سکتی تھی ناں۔''

''اچھا دادی سوری۔'' وہ ذرا منمنائی۔

''یہ لفظ اچھا نکالا ہے موئے فرنگیوں نے...... سب کچھ کہہ ڈالو گالی گلوچ لگائی لترائی اور بس فقط ایک لفظ سوری''

انہوں نے کچھ اس انداز سے سوری پر زور سے جو منہ بھینچا تو نوریا کی تو ہنسی ہی چھوٹ گئی۔

''اے لو...... اب یہ تیری کیوں بتیسی کھلے جا رہی ہے۔''

''دادی جان بس یونہی۔''

اب نوریا جو سچ بولتی تو بڑی بی نے تو اس کی گدی بھی پکڑ لینی تھی اور پھر امی سے شکایت الگ کی جاتی۔

''سب جانتی ہوں لڑکی تیرے لچھن اور یہ تو بتا...... یہ تو میری بچی کے کان میں کیا کھسر پھسر کرتی رہتی ہے الگ کمرے میں۔ ارے بول۔ میرے سامنے باتیں کرنے کیا تیرے دیدوں کا پانی مرتا ہے۔''

بس ان کی گھڑی کی سوئی وہیں آ کر اٹکی تھی۔

اب نوریا کیا بتاتی اس بوڑھی جان کو...... کہ جوانی میں رنگ کتنے خوشنما دکھائی دیتے ہیں۔ برسات کی راتیں کیوں غضب ڈھاتی ہیں۔ ہر شام کتنی خوبصورت لگتی ہے...... ہواؤں سے خوشبو کیوں آنے لگتی ہے۔

''وہ دادی جان ایسا کچھ خاص نہیں۔ میں ناں...... ہاں میں اسے نوٹس کے بارے میں بتانے آئی تھی۔ وہ ایک انگریزی نظم کی بڑی اچھی استانی ٹیوشن سینٹر میں آئی ہوئی ہے بچ اتنی موٹی موٹی عینکیں لگاتی ہے آنکھوں پر اور پٹر پٹر انگریزوں کی طرح انگریزی بولتی ہے۔''

نوریا کو جلدی میں بس اتنا ہی سوجھا۔

''رے خاک انگریزی بولتی ہوگی چل اگر مان بھی لیا کہ تیرے اس پھٹیچر سے ٹیوشن سینٹر میں ایک استانی ایسی آ بھی گئی تو یہ تو بتا کہ تیری سمجھ میں خاک آتا ہوگا...... تیری تو خود اردو اتنی واہیات ہے...... لوکی کو لوکی ایسے کہتی ہے کہ موئی سبزی کی شکل ہی بدل دیتی ہے۔''

''توبہ ہے دادی تم تو بندے کی جان ہی لے لیتی ہو۔''

وہ بس اب رو دینے کو تھی۔

''اے یہ خوب کہا...... بول کتنے غلط غلط لفظ بولتی ہے تو...... نہ تیرا میں ٹھیک ہے نہ تیرا ہے ٹھیک ہے۔''

''تو تم نے تو اردو میں پوری ڈگری لے رکھی ہے ناں تم ہی سکھا دو مجھے۔'' اس کا منہ بن گیا

''اری تو سیکھنے والی تو بن...... پانچ جماعتیں پڑھ رکھی ہیں میں نے لڑکی...... جاہل نہیں ہوں...... اپنے شاہ نواز کو شروع میں کس نے پڑھایا۔ میں نے...... میرے ابا مرحوم عالم فاضل تھے...... جانتی بھی ہے کہ عالم فاضل کیا ہوتے ہیں پر تجھے کیا پتہ۔''

وہ اب کب رکنے والی تھیں۔ ان کی تو گاڑی چل چکی تھی۔

''کس نے جا کر دیکھا ہے......'' نوریا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بڑبڑائی۔

''ارے نوریا!......تو کب آئی......؟''

وہ تو شکر ہی ہوا کہ سجل نجانے کہاں سے نکل کر آ گئی اور اس کی جان چھوٹی۔

''میں تو کب کی آئی ہوئی ہوں بس دادی نے پکڑ لیا تھا۔''

اس نے منہ بنا کر بڑی بی کی جانب دیکھا جو سجل کے آ جانے پر اب ان دونوں کو غضیلی نظروں سے گھور رہی تھیں۔

''اچھا تو چل میرے ساتھ۔''

سجل نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے کمرے کی جانب لے گئی۔ دادی کی تیز عقابی نگاہوں کی چبھن نوریا کو اپنی پشت پر محسوس ہو رہی تھی

''اب بتا کیا ہوا؟''

سجو نے کمرے میں گھستے ہی پر اشتیاق انداز میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا

''بیٹھنے تو دے......ایک تو تیری دادی بھی ناں۔ سارے موڈ کا ستیاناس کر دیتی ہیں۔ قسم سے اتنا اچھا موڈ تھا۔ دیکھ تو ابھی اس کا میسیج آیا تھا۔ دوڑی دوڑی تجھے دکھانے آئی تھی کہ تیری دادی نے پکڑ لیا......''

اس نے پرانی وضع کے جھولتے بیڈ پر احتیاط سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ سجل بھی اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا جیسے اسی کے لیے کسی نے پیغام بھیجا ہو۔

''اچھا اب دکھا بھی ناں......''

''یہ دیکھ......''

اس نے اپنے دوپٹے کے پلو سے بندھے سستے سے موبائل کو بڑے چاؤ سے کھولا جیسے کسی خزانے کا در کھول رہی ہو۔

''موبائل تو بدل لے نوریا!......سچی سے آنکھوں میں مرلیاں سی ناچ جاتی ہیں اسے پڑھتے پڑھتے......'' اس نے معصوم سا شکوہ کیا

''اچھا اچھا......تو پڑھ'' اس نے موبائل آن کیا۔

''ہوں......دن گزرتے ہیں اداسی میں......اور......یہ کیا لکھا ہے......آگے......''

رومن میں لکھا کچھ واضح نظر نہیں آ رہا تھا......

نوریا نے اس کے ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

لا مجھے دکھا میں پڑھتی ہوں......آگے لکھا ہے

''رات گزرتی ہے تیری یادوں میں......'' پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے پر ہزاروں پھول سے کھل گئے۔ سجل کا منہ ہی بن گیا۔

''بس......یہ میسیج بھیجا ہے اس نے تو تو کہہ رہی تھی کہ بڑا رومانٹک قسم کا ہے......''

''ہاں تو ہے ناں......دن رات مجھے یاد کرتا ہے......ہائے کیا کیا سوچتا ہو گا نا سجو......'' اس کے چہرے پر سہانے سپنے بارہ بجا رہے تھے۔

''چل دفع ہو......دن رات تجھے یاد کر کے اس نے تعویذ گنڈے گاڑنے ہیں کیا۔ اتنی مشکل سے تو موبائل فون کے نمبر تک پہنچی تھی اور اتنی مشکلوں کے بعد یہ......''

پتہ نہیں کیا کیا سوچ رکھا تھا اس نے......اور نکلا کیا......

''تو تیرا کیا خیال ہے......پہلی ہی ملاقات میں مجھے اسکوٹر پر بھگا لے جائے گا۔ نوریا چڑ سی گئی۔

اتنے دنوں سے ٹیوشن سینٹر پر کیا پڑھا کیا نہیں پر اس ہینڈسم لڑکے کا نمبر ضرور حاصل کر لیا تھا اور وہ بھی خوب تھا ایک دو میسیجز کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا پر ظالم کا نمبر بڑی خاک چھاننے پر ملا تھا۔

''اسی لیے مجھے یہ ساری پیار محبت کی کہانیاں بڑی فضول سی لگتی ہیں ایویں میں اتنا مغز خرچ کرو آہیں بھرو اور ملتا ہے کیا......یہ تو بتا......''

اس نے اپنی تئیں بڑی عقلمندی کی بات کہی تھی۔ نوریا کی بھنویں غصے سے تن گئی۔

''مجھے لگتا ہے تجھ پر اپنی دادی کی روح سمانے لگی ہے۔ دیکھ لے ایک دن دادی چپ چپاتے مر جائے گی اور تو اس کی جگہ تخت پر بیٹھی اپنی عینکوں کا رونا روتی رہے گی پاگل ہو گئی ہے تو سجو......''

''ارے واہ تو ہی بتا کیا غلط کہا ہے میں نے کتنے دنوں سے تو نے مجھے اس لڑکے کے بارے میں بتا بتا کر میرا تجسس اتنا بڑھایا کہ دل میں آیا کہ کسی دن تیرے سینٹر جا کر اس کی شکل تو دیکھوں لو کتنی مشکلوں سے پھر اس کا نمبر ملا اور پھر بھی سلام اور اتنے سلاموں کے بعد یہ چند بکواس سے شعر اس سے تو اچھے بسوں اور ویگنوں میں لکھے ہوتے ہیں......وہ کیا ہے......آ جا لے جا نشانی تیری مہربانی۔ اس نے باقاعدہ لے میں گانا شروع کر دیا تھا۔

''چل دفع ہو پرے......رومانس تو تجھ میں پائی برابر نہیں ہے۔ پر دیکھ جس دن تیری چڑیا پھنسے گی ناں اس دن پوچھوں گی۔''

اسے واقعی ناراض ہوتا دیکھ کر اسے ذرا ملال ہوا۔ ایک واحد وہ ہی تو تھی جو اس کے دکھ درد کی ساتھی تھی یہاں تک کہ خود نوریا کی بھی وہی اکلوتی خفیہ رازداں سہیلی تھی جس سے وہ اپنا سب کچھ شیئر کر لیتی تھی۔

''ارے ارے تو، تو واقعی میں مجھ سے ناراض ہو گئی۔ ارے بابا......مذاق کر رہی تھی یار اور تو ہے کہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ اچھا ناں بس اب مان بھی جا ناں میری پیاری سی چھوٹی سی سہیلی......''

اس نے محبت سے اس کے گلے میں بانہیں ڈالتیں اور نوریا کا پھولا منہ نارمل ہو گیا۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں......اور ہاں تجھے پتہ ہے کہ آپا کے سسرال والے تاریخ مانگ رہے ہیں سچ بڑا مزہ آئے گا شادی میں۔''

''لو سال بھر پہلے تو منگنی کی تھی میں تو تیری آپا کی شادی کے انتظار میں سوکھ ہی گئی ہوں اب بھی تاریخ مانگ رہے ہیں۔''

''بنو......تیرے ابا کی دکان ہے ناں اسی لیے باتیں بنا رہی ہے۔ پورا سال گزر گیا میرے ابا کو اب بھی آپا کی شادی کے کھانے کے پیسے کم پڑ رہے ہیں اور اوپر سے میرے ددھیال والے......سارے ہی حیدرآباد آنے کو کہہ رہے ہیں ان کے خرچے الگ۔ جتنی معلومات اسے تھیں سب اگل دیں۔

''اچھا تب ہی رخشندہ خالہ کل دادی کے پاس آئی تھیں......''

''اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''قرضہ مانگنے آئی ہوں گی تو اپنے ابا سے کہہ کر قرضہ دلوا دے گی ناں......اس نے لجاتے ہوئے کہا۔

''بڑی مانتا ہے ناں میرا ابا میری......پر تو فکر نہ کر دادی ہے ناں......وہ راحیلہ کو اپنی پوتی کی طرح سمجھتی ہے......ویسے دل کی اچھی ہے دادی......''

''چل اچھا میں چلتی ہوں ابھی ٹیوشن کا کام بھی نبٹانا ہے اور کپڑے بھی تو استری کرنے ہیں۔''

اس کے چہرے پر ٹیوشن کے نام سے ہی چمک دوڑ گئی۔

''ہائے ہائے ٹیوشن......'' سجو نے بڑی ادا سے لہرا کر کہا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

☆......☆

صبح سے موسم ابر آلود تھا پر بادل تھے کہ برسنے میں نہیں آ رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں خراماں خراماں چلتیں تو ماحول میں کچھ اور بھی حسن

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

آ جاتا۔ کیا قدرت ہے رب کی اس کا دل موسم کی خوشگواری سے کھل رہا تھا تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جھٹ دیوار پر ٹنگی پرانی سی گھڑی کی جانب نگاہ دوڑائی۔ ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں نو پرابلم۔

وہ اپنی سوچوں کے گھوڑے دوڑاتی دروازے کی جانب بڑھی اور بنا پوچھے کھٹ سے دروازے کی چٹخنی گرادی۔ سامنے ایک گندمی رنگت کا دبلا پتلا سا جوان آنکھوں کالے رنگ کی عینک جمائے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''بارہ الف......؟'' اس نے دروازہ کھلتے ہی پوچھا۔

''ایں......'' اس کا منہ ناگواری سے بن گیا تھا۔

''جی میرا مطلب ہے یہ بارہ الف ہے۔''

اس کی مراد گھر کے پتے سے تھی۔ اتنا خوبصورت موسم اور ایسا غیر رومانوی شخص۔ توبہ ہی بھلی۔

''جی نہیں۔'' اس نے دھڑام سے دروازہ اس کے منہ بند کر دیا۔

''جس کا دل چاہتا ہے منہ اٹھا کر کسی کا بھی دروازہ بجا دیتا ہے یہ اچھا طریقہ ہے بھئی نہ جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام...... دفع ہو۔''

وہ خود ہی بڑبڑاتی پلٹی، تب ہی دادی اپنے کمرے سے برآمد ہوئیں جسے وہ رات سونے کے لیے استعمال کرتی تھیں ورنہ ان کی مستقل قیام گاہ تو دالان کے اس لکڑی کے تخت پر تھی جو شاید انیس سو بیس سے وہاں ایسے ہی پڑا تھا۔

''اری کون تھا دروازے پر......''

حسب معمول ان کا سوال کم و بیش ایسا ہی تھا جیسا کہ ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔

''تھا کوئی دادی پوچھ رہا تھا کہ بارہ الف......''

''الف پر آنے سے پہلے اس کی آنکھیں حیرت سے ذرا پھیلیں۔

''اوئی ماں...... بارہ الف تو ہمارے ہی گھر کا پتہ ہے...... پتا نہیں کون......''

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی دروازے تک گئی اور ایک جھٹکے سے پٹ وا کر دیے خوب اچھی طرح ادھر ادھر دیکھا پر اس کا نام ونشان تک نہ تھا ہاں گلی کے چند آوارہ لڑکے جنہیں سوائے کھیل کود کے دن بھر اور کوئی کام نہ تھا۔ وہی سبزی والے کی نکڑ پر دوکان اس کے برابر پرچون کی دکان۔ گلی سے گزرنے والی کام کرنے والیوں چڑ پٹر۔ سامنے والی خالہ کلثوم کی اپنی بہو سے زوروں کی لڑائی چل رہی تھی۔ اس قسم کے سین ہر روز یوں ہی چلتے رہتے تھے۔ وہ بور سی ہوگئی پر دماغ پر ایک اکتاہٹ سی سوار ہوگئی۔

''پتہ نہیں کون تھا۔ ہائے کہیں ابا نے دکان سے ہی نہ بھیجا ہو۔''

دل میں کچھ خوف نے بھی سر اٹھایا پر کیا کرتی تیر تو کب کا نکل چکا تھا۔ دروازہ بند کر کے وہ کچھ الجھتی ہوئی سی باورچی خانے کی جانب بڑھی تب ہی دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس کے دل کو کچھ قرار سا آیا اب اتنی بھی کٹھور تو نہ تھی دوڑ کر دروازے پر گئی۔

''اری سجو...... واہ کیا دروازے سے لگ کر کھڑی ہے...... اچھا چل ذرا بیس روپے کھلے تو دے اس رکشہ والے کو تو فارغ کر دوں بلکہ تو اس کو خود ہی پیسے دے اور سن ذرا چیک کر لینا میرے بلو کی کوئی چیز تو رکشے میں نہیں رہ گئی۔''

کنول نے دروازہ کھلتے ہی نہایت خوشدلی سے اپنے احکامات صادر کیے اور دروازے پر ہی بڑا سا بیگ اس کے سپرد کرتی خود بلو کو سنبھالتی اندر داخل ہوگئی۔

رکشے کو فارغ کر کے جب وہ پلٹی تو کنول تخت پر بیٹھی دادی سے باتیں بنا رہی تھی۔

''بجو ذرا دیکھ بھال کر اترا کرو ناں یہ دیکھو بلو کے فیڈر والا بیگ رکشے میں ہی رہ گیا تھا۔'' اس نے بیگ تخت پر رکھا۔ بلو اب بڑے مزے سے اس کی گود میں سو رہا تھا۔

''مجھے پتہ تھا کہ تو ہے ناں...... اس لیے بے فکر ہوگئی تھی۔ تیرے دولہا بھائی نے رکشہ لا کر دیا تھا سامان بھی اسی نے رکھا تھا۔''

کنول نے مسکراتے ہوئے بتایا وہ اس کے پاس تخت پر ٹک گئی۔

''اچھا یہ بتاؤ...... ناشتہ کر کے آئی ہو......''

''بس تو مجھے ایک کپ چائے بنا دے میری بہن۔''

''میرے لیے بھی چائے لے آنا......'' دادی نے بھی حکم داغا۔

''ناشتہ تو تم کرتی نہیں ہو دادی!...... بس خالی پیٹ میں چائے کا بگھار لگاتی رہنا۔'' وہ چڑ کر بولی۔

''ٹھیک ہی کہتی ہے دادی ایک آدھ پاپا ہی کھا لو...... اس طرح تیزابیت بڑھ جاتی ہے......'' کنول نے بہن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

صبح شاہنواز کے لیے چائے بنائی تھی تو ایک پاپا کھا لیا تھا۔ میرا بچہ تو بس چائے کا ایک کپ پی کر نکل جاتا ہے تو ہی بتا پھر میرے حلق سے کیسے نوالہ اترے......''

''دیکھا، دیکھا بجو اب یہ الزام بھی مجھ پر ہی آئے گا...... بیمار پڑ جائیں گی تو باتیں بنتی ہیں۔ خیر مجھے کسی کی پروا نہیں ہے پر تم خود ہی سمجھاؤ......''

وہ بڑبڑاتی ہوئی پھر باورچی خانے کی جانب بڑھی اور پتیلی دھو کر چائے کا پانی چولہے پر چڑھایا۔

''زبان کی بری ہے پر خیال رکھتی ہے میرا......'' دادی مسکراتے ہوئے کنول سے کہہ رہی تھیں۔

☆......☆

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ان تینوں کی محفل جمی تھی، اسی وقت اس کا پسندیدہ ڈرامہ چل رہا تھا۔ اس کا من تو اس میں ہی اٹکا تھا سو اسے غرض نہ تھی پر جب ڈرامہ بھی ختم ہوگیا اور ابا نے چائے کی ہانک لگائی تو اسے کچھ تشویش لاحق ہوئی۔ آخر ایسا بھی کیا کہ سب دادی کے کمرے میں ہی گھسے بیٹھے ہیں چائے بنا کر سب کو دے کر تو آ گئی لیکن تجسس بڑھتا ہی گیا۔ آخر دروازے کی اوٹ ذرا کان لگائے۔

''بات تو تیری درست ہے بیٹا...... پر تو خود ذرا دیکھ بھال کر لے۔''

شاہنواز کی آواز ابھری تھی۔

''دیکھ بھال کیا کرنی ہے ابا۔ ولایت کے دوست کا چھوٹا بھائی ہے۔''

''کہہ تو رہی ہے کہ اچھا بھلا آڑھتی کا کام ہے منڈی میں۔''

دادی نے بھی لقمہ دیا تو اس کی بھنویں ذرا تنیں۔ تو گویا خود اس کی شادی کے لیے یہ میٹنگ کی جا رہی ہے...... آڑھتی...... توبہ۔''

''انٹر کر رکھا ہے۔ اپنا گھر ہے دو منزلہ۔''

کنول نے مزید معلومات فراہم کیں۔

''تو وہ تو باپ کا ہوا ناں بیٹا!...... شاہنواز نے تصحیح کی۔

''ہاں ابا...... گھر تو اس کے باپ کا ہے پر ہے تو اپنا...... آج کل اپنا گھر ہونا کم بات نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہوتی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بیٹا، پر خاندان بہت بڑا ہے۔''

دادی کو شاید اعتراض ہوا تھا۔

''اے لو دادی! خوب کہی تم نے...... میری سسرال دیکھی ہے۔ ایک جیٹھ اور دو دیوران کے بیوی بچے۔ ایک بن بیاہی نند...... ابھی اس کی شادی بھی سر پر ہے خود ہی سوچو کہ میں تو گزارا کر رہی ہوں...... خوش ہوں ماشاءاللہ۔'' کنول تنک کر بولی۔

''ساس، سسر نہیں ہیں نا تیرے سر پر جس کا جو دل چاہتا ہے کرتا ہے۔''

''اب یہ تم دونوں کس بحث میں پڑ گئیں۔''

شاہنواز پہلے ہی الجھ رہا تھا لیکن رشتہ معقول تھا انکار بھی نہیں ہو رہا تھا۔ عجیب مخمصے کا شکار تھا۔

☆......☆

رات بھر اس کا من اداس سا رہا۔ کیوں...... وہ سمجھ ہی نہ پائی شاید اس کا ذہن انٹر پاس آڑھتی سے شادی کرنے پر قائل ہی نہ ہو رہا تھا۔ آخر برائی ہی کیا تھی اس میں...... کیا برائی ہے...... کیا برائی ہے وہ سوچتی ہی رہی۔ آخر مجھ میں ایسی کیا اچھائی ہے۔ عام سی شکل وصورت۔ نہ گوری...... نہ کالی...... بس صاقمر کی طرح دبلی پتلی لمبی سی ہوں۔ پر اس کی طرح خوبصورت تو نہیں ہوں...... کہاں صاقمر اور کہاں میں...... وہ الجھتی ہی رہی اپنے آپ میں پر اس من کا کیا کرتی جو اس آڑھتی سے شادی پر مان ہی نہ رہا تھا۔

صبح اٹھی تو سر بھاری ہو رہا تھا۔ شکر تھا کہ آج خلاف معمول بوا جلدی آ گئی تھی لہٰذا بنا بنایا ناشتہ بھی مل گیا۔ کنول اب بھی دادی کے ساتھ دالان میں بیٹھی نہ جانے کن باتوں میں مصروف تھی۔ شادی سے پہلے تو وہ اتنی باتیں نہیں کرتی تھی پر اب تو جیسے باتوں کی پٹاری تھی جو میکے میں آتے ہی کھل جاتی تھی۔ ان باتوں میں پہلے وہ بھی شامل رہتی تھی پر آج...... اب کیا بتاتی وہ کہ اس کا دل الگ ہی چال چل رہا ہے۔''

''کیا...... ہائے سجو تیرا رشتہ آیا ہے۔'' نوریا نے تو سنتے ہی خوشی سے نعرہ لگایا۔

''ارے ہلکے بول دادی نہ سن لے......''

''ویسے تو ہے بڑی بے شرم۔ اتی سی ہے پر پوری ہے۔''

''یہ تو نے خوب کہا۔ جا کر ہمارے اسکول میں تو دیکھ لڑکیاں کیسی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ شرم سے تو ڈوب مرے گی۔''

''ایں واقعی...... پر جب میں اسکول میں پڑھتی تھی تو لڑکیاں ایسی باتیں نہیں کرتی تھیں۔'' حیرت سے اس کے دیدے پھٹ گئے۔

''ارے تجھے اسکول چھوڑے چار سال ہونے کو آئے ہیں...... آپا سے سال بھر تو پیچھے تھی تو۔'' نوریا نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں تو چار پانچ سال میں کیا دنیا بدل جاتی ہے۔'' اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

''اے لو...... بدل کیا جاتی ہے بنو...... بدل گئی ہے۔ اب لڑکیاں چھپ چھپ کر فضول باتیں نہیں کرتیں......'' نوریا نے بڑے مزے سے اپنی پونی ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہائے میں مرجاؤں۔ نوریا زمانہ اتنا خراب ہو چکا ہے۔''

اس نے اپنے ماتھے پر بڑی زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اسے واقعی زمانے کی خبر ہی نہ تھی۔ اس کی دنیا تو بس ٹی وی کے چینل تک ہی محدود تھی۔

''ماڈرن ہو گیا ہے...... تو خراب کہہ لے۔

ویسے میں اب میٹرک میں ہوں۔ اچھے نمبر آئے تو اچھے کالج میں داخلہ بھی لے لوں گی۔ ویسے صاف بات ہے مجھے پڑھنے وڑھنے کا شوق ووق نہیں ہے میں تو بس آپا کی شادی کا انتظار کر رہی ہوں۔ اگر آپا کی شادی میں کوئی اچھا سا لڑکا پھنس گیا ناں تو پٹ سے شادی کرلوں گی۔''

اس نے بیٹھے بیٹھے ہی خود ہی رشتہ بھی طے کرلیا تھا۔

''اور وہ تیرا ٹیوشن والا ہیرو......'' اس نے جھنجلا کر پوچھا۔

''دفع کرو اسے...... پتہ ہے فلرٹ کر رہا تھا۔ میری سہیلی کے ساتھ ڈیٹ پر بھی چلا گیا۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔''

''اب سمجھ میں آیا۔ تیری شکل اتنی پکی پکی سی کیوں لگنے لگی ہے۔''

''دیکھ اب اپنی دادی بننے کی کوشش نہ کر...... یہ تو بتا کہ لڑکا کیسا ہے کیا کرتا ہے کون سے ہیرو کی شکل میں ملتا ہے۔ پاکستانی یا انڈین۔ ویسے انڈین بھی اب گورے ہونے لگے ہیں۔ سنا ہے لڑکے بھی رنگ گورا کرنے والی کریمیں لگاتے ہیں......'' ایک ہی سانس میں وہ بولے گئی تب ہی کنول کمرے میں داخل ہوئی۔ نوریا کو دیکھ کر خوش دلی سے بولی

''نوریا کیسی ہے۔ کتنی بڑی ہو گئی ہے ناں۔ کون سی کلاس میں پڑھ رہی ہے اور تیری آپا کی شادی کب ہونے والی ہے۔''

''ایک ہی سانس میں کتنے سوال کر ڈالے بجو تم نے بھی۔'' سجو نے مداخلت کی۔

''دسویں کلاس میں پڑھ رہی ہوں بجو اور آپا کی شادی بھی بس ہونے ہی والی ہے۔ دیکھو اگلے مہینے کی تاریخ ہو یا تین مہینے بعد کی......''

''چلو اچھا ہوا۔ لڑکیاں جلد ہی اپنے گھر کی ہو جائیں اچھا ہے۔ اور اب ہم اپنی سجو کی بھی جلد ہی شادی کر دیں گے۔''

کنول نے اس کے چہرے کی جانب مسکراتے معنی خیز انداز میں دیکھا تو پتہ نہیں کیوں اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

''اچھا بجو۔ واقعی یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ کیا بہت بڑا افسر ہے۔''

نوریا بڑی چالاک تھی مسمی سی صورت بنا کر کنول سے یوں پوچھ رہی تھی جیسے اسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔

''ارے بڑا افسر تو نہیں ہے پر بہت بڑا بزنس ہے اس کا۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔''

سجل کا دل بس جل کر رہ گیا۔ بہت بڑا بزنس۔ وہ بدبدائی

''اچھا تو پھر ہماری سجو کے وارے نیارے ہو گئے۔'' نوریا نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

''بس تو دعا کر میری بہن کے سب کچھ اچھی طرح ہو۔ اگلے ہفتے دیکھو لڑکے والے آئیں گے۔''

اس کی انفارمیشن پر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''کیا لڑکا بھی ساتھ آئے گا بجو؟'' نوریا نے جھٹ پوچھا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں میں نے صاف کہہ دیا تھا ولایت سے کہ میرے ابا پہلے لڑکے کو دیکھیں گے۔'' کنول نے سجل کی جانب دیکھا تو اس نے نظریں چرالیں اسے تو کچھ اچھا ہی نہیں لگ رہا تھا۔

☆......☆

پورے گھر میں ایک گہما گہمی تھی۔ کنول نے خوب زبردست قسم کے ناشتے کا انتظام کروایا تھا لڑکے کے گھر سے پورے آٹھ لوگ آ رہے تھے دادی کو اس بات پر اعتراض تھا کہ پہلی بار آٹھ لوگ...... کیا بات پکی کرنے آ رہے ہیں پر کنول کو تو اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

بات کی فکر زیادہ تھی کہ اس کے شوہر کی عزت پر حرف نہ آئے اس کا دوست کیا کہے گا کہ ولایت کے سسرال والوں نے کوئی اہتمام ہی نہ کیا۔ حالانکہ کام کرکر کے وہ خود بے حال ہوئی جارہی تھی اوپر سے بلو کی بھی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ تو شکر ہی تھا کہ بوا کو دادی نے خاص تاکید کی تھی اسی لیے صبح جلدی آ گئی تھی۔ شاہ نواز نے بھی جلد ہی دکان بند کرکے آنے کو کہا تھا۔ ابھی چھ بجنے میں دیر تھی پر کنول کا دل ہول رہا تھا کہ کسی طرح کوئی کمی نہ رہ جائے۔

''ارے یہ تو کیا منہ سجائے بیٹھی ہے اس طرح جائے گی ان کے سامنے۔'' کنول نے اس کا منہ بنے دیکھ کر جھلا کر پوچھا۔

''تو اور کیا کروں، کیا بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آؤں۔''

وہ بھی چڑ کر پٹ سے بولی۔

''دیکھ سجو! بات بگڑنی نہیں چاہیے۔ یہ تیرے بہنوئی کی عزت کا سوال ہے۔''

''اور میں...... میرا کیا ہوگا...... تجھے اپنے شوہر کی عزت کی پڑی ہے۔''

اسے غصے میں دیکھ کر کنول کو سمجھ میں آ گیا کہ موصوفہ کو لڑکا ابھی سے ناپسند ہے۔

''دیکھ...... تجھ میں لعل نہیں لگے کہ بارہ جماعتیں پاس کرکے تو کسی افسر سے شادی کرلے ......اور شکل دیکھ اپنی کون سی ریما میں ملتی ہے۔ رنگ دیکھ اپنا...... اور کام تجھے کیا آتا ہے۔ کھانا پکانے میں کوری۔ جب سے دادی کے جوڑوں میں درد بیٹھا ہے تب سے بوا آرہی ہیں کھانا پکانے...... نہ تجھ میں ادب...... نہ آداب۔''

اس نے ایک ایک کرکے اس کی خامیاں گنوانی شروع کیں۔

''ہاں ہاں مجھ میں تو کیڑے ہی کیڑے ہیں اور تیرے شوہر کے دوست کا بھائی اس میں تو ہیرے لگے ہیں ناں جو بہن میں تجھے برائیاں نظر آرہی ہیں۔''

اس کا دل رونے کو کر رہا تھا پر بہادری میں سارے آنسو پی گئی۔

''غلط کیا کہہ رہی ہوں بتا...... بتا مجھے...... او شکر کر کہ خدا نے ایک اچھا رشتہ بھیجا ہے۔''

''یہ کہہ کے تیرا شوہر اپنی دوستی یاری نبھا رہا ہے۔''

''دیکھ سجو! بتائے دے رہی ہوں میرے شوہر کو بدنام نہ کر......''

وہ بھی لڑنے کے موڈ میں تھی کہ تب ہی بوا نے پکارنا شروع کردیا۔

''چلتی ہوں ابھی...... اور سن...... ذرا ڈھنگ سے تیار ہوجانا شام کو...... ابا کی عزت نہ مٹی میں ملا دینا...... ہاں نہیں تو۔''

وہ سر مارتی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی اور اس کے آنسو جو کب سے جمے تھے بہہ نکلے۔

''ہاں اب ابا کی عزت کا خیال آ گیا اسے۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی پر یہاں اس کے آنسو دیکھنے والا کون تھا اس وقت اسے پہلی بار شدت سے اپنی مری ہوئی ماں کی یاد آئی کاش وہ زندہ ہوتی تو اس کے دل کا درد سمجھتی۔

''سجو...... سجو چل لڑکے والے آ گئے ہیں۔ ارے یہ کیا کپڑے بدل۔ کچھ میک اپ کر۔''

نوریا کو شاید کنول نے ہی بلوایا تھا ورنہ یہ اس کے آنے کا وقت تو نہ تھا۔

''تجھے کس نے بھیجا ہے میری منیجری کے لیے۔''

وہ پھٹ پڑنے کو تھی۔

''ارے تیری منیجر تو میں ہوں...... پر اب بجو کی بھی بن گئی ہوں۔ ترقی ہوگئی ہے میری ویسے ابھی سے ایک بات کہہ دوں یعنی نیوز بریک کردوں۔ لڑکے کے ساتھ تیری جوڑی نہیں بنتی۔'' اس نے چیونگم چباتے جیسے بم پھوڑا تھا۔

''ہائے میرے خدا میری قسمت۔'' وہ دھپ سے بستر پر بیٹھی۔

''ویسے ایک بات کہوں تو بہت بے صبری ہے...... ارے شکر کر ورنہ لڑکیاں دیکھنے کے لیے اتنے لوگ آتے ہیں جیسے سیل کا مال لگا ہو اسی پنچائیت سے بچنے کے لیے میں نے لو میرج کا سوچا ہے پر پارٹنر نہیں مل رہا۔''

اس نے اتنے مزے سے کہا اور اس کا دل جل گیا۔

''دفع ہوجا تو نوریا...... تو میری بے عزتی کررہی ہے۔''

''عزت افزائی کررہی ہوں...... اب چل بھی کون سا ان لوگوں نے تجھے پسند کرلینا ہے۔ لڑکے کی بہن کے نخرے بڑے لگتے ہیں۔''

''کیا مطلب...... اب کی بار اس کی آنکھوں میں حیرانگی تیر آئی تھی۔ واقعی اس چھٹانک بھر کی لڑکی میں کہاں کہاں کی باتیں چھپی تھیں۔

''پہلے اپنا منہ ٹھیک کر...... اچھی طرح سے بن...... جان لے۔ انکار ادھر سے ہی ہونا ہے۔''

اس نے بڑے وثوق سے کہا۔

''اور اگر انکار نہ ہوا تو۔'' نجانے کیوں اس کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

''تو کیا تو اس سے شادی کرلے گی۔ یہ تیرے نصیب۔''

اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور لگی ہنسنے۔

''ستیاناس ہو تیرا نوریا......'' وہ اسے کوسنے دینے لگی۔

''او پاگلے...... اب بس بھی کر لڑنا جھگڑنا بعد میں کرلیں گے پہلے اس ٹیم کو تو فارغ کر۔'' اس نے سے سمجھا بجھا کر تیار کرا ہی لیا۔

☆......☆

رات خاصی بیت چکی تھی کنول کا تو قیام کا ابھی پروگرام تھا پر بلو کی طبیعت کی وجہ سے اسے لوٹنا پڑا۔ صبح اسے ڈاکٹر کو بھی دکھانا تھا۔

''اماں......''

شاہ نواز کی آواز ابھری تو اس کے قدم تھم سے گئے اور کان خود بخود دروازے کی جانب متوجہ ہوئے۔

''ہوں۔'' دادی جیسے اونگھ رہی تھیں۔

''تمہیں یہ لوگ کیسے لگے۔''

''ہاں...... بس ٹھیک تھے۔''

''ہوں......'' ایک طویل خاموشی

''اور اس کے گھر والے؟''

''ہاں بس ٹھیک ہی تھے۔''

''اماں یہ تو کوئی جواب نہ ہوا......''

شاہ نواز کی آواز میں ایک اضطراب سا تھا۔ ویسے بھی اتنے دنوں میں یہ اس کا پہلا باقاعدہ رشتہ آیا تھا۔

''تو کیا چاہتا ہے۔''

''تم بھی تو کچھ کہو۔''

''کیا کہوں۔ جانتی ہوں تجھے نہ تو لڑکا پسند آیا ہے اور نہ ہی اس کے گھر والے۔''

''پر اماں! سجو کا کوئی ڈھنگ کا رشتہ بھی تو نہیں آیا۔''

وہ گو مگو کی سی کیفیت میں تھے۔

''ایک بات کہوں تو کر انکار چاہے وہ ہاں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

کہیں یاناں۔''

اس کے دل میں ٹھنڈ اتر گئی آج پہلی بار دادی پر بے پناہ پیار آیا تھا۔

پر اماں شاہنواز نے کچھ پس و پیش کی۔

''کہہ رہی ہوں نا۔ انکار کردے۔ ہماری بچی اب اتنی بھی بھاری نہیں ہے کہ اسے دو وقت کی روٹی نہ کھلا سکیں اور ویسے سجو کو بھی یہ رشتہ پسند نہیں......''

یہ انکشاف تھا یا زوردار دھماکہ۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''دادی کو کیسے پتہ چلا کیا نویرا نے......'' دل میں شک نے سر ابھارا۔

''کیا اس نے تمہیں بتایا تھا۔''

شاہ نواز نے بے یقینی سے پوچھا۔

''بتایا تو نہیں پر میں اس کا دل پڑھ سکتی ہوں کہ کیا ہے اس کے دل میں۔ بچی میری بجھ سی گئی۔ بس نہیں کرنا مجھے اس گھر میں شادی اپنی بچی کی۔ اور دیکھا تھا کیسے بڑھ بڑھ کر بول رہی تھی لڑکے کی بہن۔ کنول تو ہماری گاؤدی ہے۔ کیسے منمنا رہی تھی اس کے سامنے کل کلاں مر مرا گئی تو وہ تو میری بچی کو نوچ کھائیں گے۔''

''ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہی ہو...... بہت تیز لوگ لگ رہے تھے۔ اپنی سجو کا گزارہ مشکل ہے وہاں پھر وہ کنول کی طرح بھی نہیں۔ زبان اس کی رکتی نہیں۔ اور مرد کا ہاتھ اگر ایک بار اٹھ جائے تو...... خیر۔''

انہوں نے ایک لمبا سانس بھرا۔ بن ماں کی بچی۔ واہمات سر اٹھا رہے تھے۔

''بس...... صبح تو ولایت کو فون کردے...... کہہ دے کہ اماں نے منع کردیا۔''

''ٹھیک ہی کہتی ہو اماں میں صبح ہی فون کردوں گا۔''

شاہ نواز بھی پرسکون ہوگیا تھا اور وہ چپ چپاتی اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔

''دادی کیسی عجیب سی عورت ہے۔ میرے اندر تک جھانک لیتی ہے حالانکہ عینک بھی نہیں لگاتی میری دادی...... پیاری دادی۔ کتنی اچھی ہے ناں...... میری امی بھی زندہ ہوتی ناں تو ایسے ہی پیاری ہوتیں۔ ایسے ہی میرے لیے سوچتی۔ اتنا ہی پیار کرتی۔''

دل میں ڈھیر سارا پیار دادی کے لیے امنڈ امنڈ کر آرہا تھا اور پھر نجانے کب آنکھ لگ گئی۔

☆......☆

آج وہ صبح سے بوا کے ساتھ لگی تھی۔ بوا بھی بڑی توجہ سے بتا رہی تھی کہ آٹا کس طرح گوندھا جاتا ہے۔ کتنا پانی ڈالا جاتا ہے کیسے مکیاں لگائی جاتی ہیں اور کس طرح آٹے میں لوچ پیدا کرنے بعد اسے اٹھایا جاتا ہے۔ پیاز کو باریک کیسے کترا جاتا ہے سالن کا مسالا کیسے بنایا جاتا ہے، کیسے بھونا جاتا ہے۔ سبزی کب ڈالی جاتی ہے۔ دادی چپ چاپ اپنے کمرے میں لیٹی تھیں آج دالان کا تخت ویران تھا۔

کام سے ذرا توجہ ہٹی تو دادی کی جانب دھیان گیا۔ ان کے کمرے میں گئی تو دیکھا چپ چاپ آنکھیں موندے پڑی تھیں۔

''دادی...... اے دادی...... کیا ہوا۔ ہوں۔''

اس نے پیار سے ان کے سفید بالوں سے بھرے سر پر اپنا ہاتھ رکھا تو انہوں نے آہستگی سے اپنی آنکھیں کھولیں اسے دیکھ کر آنکھوں میں جیسے تراوٹ اتر آئی۔

''کچھ نہیں میری جان۔ بس طبیعت کچھ بوجھل سی تھی۔''

''کچھ کھایا بھی نہیں ہے ناں۔ بس بوا نے جو چائے دی تھی وہ ہی پی ہے۔''

''اچھا میں تمہارے لیے چائے پاپے لاتی ہوں۔''

''ارے نہیں بس میرے پاس دو گھڑی تو بیٹھ۔''

ان کے اصرار پر وہ ٹک گئی۔

''میں نے ان لوگوں کو انکار کروادیا ہے۔ تجھے میرا فیصلہ صحیح لگا ناں۔''

انہوں نے اپنے بوڑھے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھاما۔

''دادی! تم جو بھی فیصلہ کروگی میرے لیے وہ بالکل ٹھیک ہوگا۔''

اس نے پیار سے ان کا ہاتھ چوم کر کہا تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بس اب تو جلدی سے جا اور بوا سے کہہ کھانے میں جلدی کریں۔ سخت بھوک لگی ہے۔ پھر دادی پوتی ساتھ کھانا کھائیں گے۔''

''ابھی جاتی ہوں۔'' وہ کھل اٹھی۔

☆......☆

لان کے جوڑوں کی زبردست سیل لگی تھی۔ رخشندہ خالہ ضد کرکے اسے بھی ساتھ ہی لے گئی تھیں۔ لان کے جوڑوں کا تو بہانہ تھا راحیلہ کے سسرال والے تاریخ پکی کر گئے تھے سو تھوڑی بہت تیاری جو رہ گئی تھی اس کے لیے بازار کی دوڑیں لگ رہی تھیں اور اس بار سجو کے نام قرعہ فال نکلا تھا۔ اس نے تین جوڑے خریدنے میں پندرہ منٹ بھی نہ لگائے پر رخشندہ خالہ نے پورے بازار میں خوب وقت لگایا۔

''اچھا ہوا کہ تجھے ساتھ لے لیا نویرا اور راحیلہ تو جلدی جلدی کی رٹ لگا کر میرا دماغ کھا جاتی ہیں۔''

رخشندہ خالہ بڑی مطمئن تھیں۔

''پر گھر میں دادی اکیلی ہوں گی۔'' اسے ان کی فکر لاحق تھی۔

''چل اب تو گھر آ گیا ناں۔''

رکشہ پھٹپھٹاتا ہوا گلی میں داخل ہوا تو کالے رنگ کی چمچماتی کار ان دونوں گھروں کے درمیان کھڑی تھی۔

''لگتا ہے راحیلہ کے سسرال والے آئے ہیں۔''

اس نے پیشین گوئی کی۔

''کہاں یہ گاڑی ان کی نہیں ہے، ارے ان کی بڑی پرانی سی گاڑی ہے۔ پتہ نہیں کون ہے۔''

رخشندہ خالہ بے چین سی ہوگئیں رکشے والے کو جلدی سے پیسے دیے۔

''اچھا خالہ میں تو چلتی ہوں اپنے گھر۔''

''اچھا تو چل پھر کل آؤں گی تیرے گھر۔''

وہ کچھ گم صم سی اپنے دروازے کی جانب بڑھیں۔

''دادی! اکیلی بور ہو رہی ہوں گی ناں قسم سے رخشندہ خالہ نے اتنا گھمایا کہ بس...... مجھے بڑی فکر تھی کہ دادی اکیلی ہیں پر بوا بھی آج جلدی چلی گئی...... بھوک تو نہیں لگ رہی کچھ بنادوں۔''

ایک ہی سانس میں اس نے بہت سے سوالات کر ڈالے تب ہی اچانک اس کی نگاہ ان خاتون پر پڑی جو بڑی دلچسپ نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''دادی...... یہ''

اچانک ایک اجنبی خاتون کو دیکھ کر وہ کچھ گڑبڑا سی گئی۔

''یہ سجو ہے ناں اماں!'' خاتون نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ہاں...... یہ ہی سجل ہے۔ میری صبیحہ کی بیٹی۔''

دادی نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے انہیں بتایا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

"دادی...... یہ" اس کا سوال ہنوز برقرار تھا۔

"یہ عطرت ہے تیری ماں کی سہیلی۔ بڑا پیار تھا دونوں میں۔ یہ بیاہ کر کینیڈا چلی گئی تھی۔"

دادی کے بتانے پر وہ کچھ اور بھی کنفیوژ ہو گئی کینیڈا" اوئی ماں یہ تو کینیڈا سے آئی ہیں ہائے پتہ نہیں کیا سوچ رہی ہوں گی کہ میں بھی کیسی اود بلاؤ قسم کی ہوں وہ خود بخود تانے بانے بننے لگی۔

"صبیحہ کی جھلک تو ہے اس میں اماں۔"

"ظاہر ہے بیٹی جو ہے اس کی۔"

وہ خاتون بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھتے بولی تھیں۔

"تم اپنی بچیوں کو لے کر نہیں آئیں عطرت۔"

"ارے نہیں اماں ایک کا تو میں نے وہیں بیاہ کر دیا ہے دوسری ابھی چھوٹی ہے اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ دونوں میں پورے سات برس کا فرق ہے۔"

"ہاں بڑی والی تو میری کنول کے ساتھ کی ہے۔"

"جی جی...... اس کے بھی دو بچے ہیں اب۔"

"اے دفع ہو...... ان آنٹی کا تو کوئی بیٹا ہی نہیں۔"

دل میں سرگوشی ہوئی تھی اور خود بخود منہ بن گیا۔

"سجل ! بیٹا...... عطرت کے لیے کچھ لاؤ بھئی۔ میری بیٹی آج پہلی بار اتنے برسوں بعد آئی ہے۔"

"ارے نہیں اماں! ابھی تو میں چلتی ہوں پھر آؤں گی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ بلا وجہ کی محنت سے بچ گئی۔

دادی عطرت آنٹی کے آنے پر بہت خوش تھیں شاید اس لیے کہ وہ صبیحہ کے بچپن کی سہیلی تھی۔

☆......☆

عطرت آنٹی کا یوں اچانک آنا یونہی نہیں تھا اور وجہ سامنے آ گئی انہیں اپنے کسی بھانجے کے لیے رشتہ چاہیے تھا، ایک بھائی ایک بہن۔ نہ ماں نہ باپ بہن کی شادی کینیڈا میں ماں باپ کی زندگی میں ہو چکی تھی لڑکے کی سرکاری ملازمت تھی حال ہی میں ماں کے اچانک انتقال ہوا تھا اس خود غرضی کے زمانے میں اعتبار کس پر کیا جاتا تو ایسے میں عطرت آنٹی کو اپنی بچپن کی سہیلی یاد آ ئی وہ جانتی تھیں کہ کنول کی شادی ہو چکی ہے اور سجل کو وہ کیسے بھول سکتی تھی جس کی پیدائش کے چند روز بعد ہی ان کی پیاری سہیلی کا انتقال ہو گیا تھا۔ عطرت آنٹی نے نجانے کیا گھول کر پلایا تھا کہ دادی اور ابا سب راضی تھے وہ لوگ بہت زیادہ دھوم دھڑکا نہیں چاہتے تھے اور نہ ان کو جہیز کی انہیں کوئی لالچ تھی۔

"حیرت ہے تو تو بڑی تابعدار نکلی۔ ابا اور دادی نے کہا اور تو نے ہاں کر دی۔"

کنول نے بلو کا نیپکن بدلتے اس کی جانب دیکھا۔

"مجھے دادی پر پورا بھروسہ ہے۔"

اس نے بلو کے گال پر نرمی سے چٹکی لی۔

"تجھے پتہ ہے لڑکا کیسا ہے۔ کیسی فیملی ہے۔ کچھ خبر ہے۔" کنول نے اسے کریدنے کی غرض سے کہا۔

"کہاں نا ٹھیک ہی ہوگا" اس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

"چل بھئی اچھی بات ہے...... پر ولایت تو اپنے دوست کے بھائی کے لیے رشتہ لایا تھا تو دادی نے دوسرے ہی دن پٹ سے انکار کرا دیا تھا۔"

بلو مسکرا مسکرا کر اسے دیکھے جا رہا تھا، وہ چٹکی بجا کر اسے متوجہ جو کر رہی تھی۔

"اچھا کیا دادی میرا برا نہیں چاہتی۔"

اس کی بے پروائی کنول کے دل پر وار کر گئی۔

"یہ تجھے دادی کی محبت کب سے لگ گئی تو تو لڑتی تھی ان سے......"

"غلط کرتی تھی...... اور تجھے تو خوش ہونا چاہیے بجو...... میں بدل نہیں گئی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ چل اچھا ہی ہے۔"

اس کے احساس دلانے پر کنول کچھ مطمئن سی ہو گئی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ویسے مرحومہ امی کی یہ سہیلی بڑے کام کی نکلی۔ کہہ رہی تھیں کہ مہینہ بھر پہلے انہوں نے بھیجا تھا اسے گھر کا پتہ کرنے کے لیے کسی نے بتایا ہی نہیں۔"

"اچھا۔ کسے بھیجا تھا۔"

"ارے اسے ہی...... اب بن ناں...... ایشان نام ہے اس کا......"

اس نے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

"ہوگا...... مجھے کیا۔"

اسے شرم سی آ گئی۔ چہرہ گلابی ہو گیا۔

"مجھے تو لگتا ہے تو نے ہی اسے ٹرخا دیا ہوگا پٹ سے دروازہ بند کر دیا ہوگا۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور سجل کے ذہن کی چرخی گھوم گئی۔

"یہ بارہ الف ہے۔"

دبلا پتلا معمولی شکل و صورت آنکھوں پر موٹی نظر کی عینک جمائے 'اف۔' اس نے چکراتے سر کو تھاما۔

"یہ تجھے کیا ہوا بجو...... تیرا رنگ کیوں پیلا سا پڑ گیا۔"

کنول نے اس کی بدلتی صورت حال کو دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ہاتھ تھام لیے۔

"ہائے تیرے تو ہاتھ پیر برف ہو رہے ہیں۔" خود اس کا رنگ بھی فق پڑ گیا۔

"بجو...... تمہیں یقین ہے کہ وہ ہی گھر کا پتہ کرنے آیا تھا۔"

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس کے دل کا کیا حال ہو رہا ہے۔

"ارے دفع کر اسے...... اپنی حالت دیکھ۔ خود ہو یا کسی کو بھیجا ہو۔ ہمیں کیا۔ پر تو تو بیٹھ۔ میں ابھی تیرے لیے لیموں پانی لاتی ہوں۔"

کنول گھبرائی گھبرائی چلی گئی۔

"دادی ! میں نے تم پر بھروسہ کیا اور تم نے میرے ساتھ دھوکہ کیا۔ اتنا بڑا دھوکہ۔ اتنا بڑا فریب۔ اے میرے رب میں کیا کروں۔"

چٹاخ کی آواز سے سارے خواب شیشے کی مانند چکنا چور ہو گئے تھے۔ دل بے ترتیب انداز میں دھڑک رہا تھا اور پھر وہ اندھیروں میں ڈوبتی گئی۔

☆......☆

عطرت خاتون بھی خوب تھی۔ ادھر بیٹی کا رشتہ اپنے بھانجے سے طے کیا تو ادھر شاہ نواز کو دوسری شادی کے لیے راضی کر لیا۔ دادی بھی حیران تھی کہ ان بیس بائیس برسوں میں تو وہ بندہ راضی نہیں ہوا پر عطرت نے ایسا کیا جادو کر ڈالا کہ اس کی ناں ہاں میں بدل گئی۔ وہ خوش تھی کہ ان تمام مراحل کو عطرت نے بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ فاطمہ صبیحہ اور عطرت کی مشترکہ سہیلی ارجمند کی چھوٹی بہن تھی جو انی میں بیوہ ہو گئی تھی اب دس بارہ برسوں سے بھائی بھاوج کے گھر پڑی تھی۔ سیدھی سادی گھریلو قسم کی فاطمہ انہیں پہلی نظر میں ہی پسند آ ئی تھی۔ ویسے بھی سجل کے بعد ان کا دل کیسے سنبھلتا وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جاتی تھیں۔ کنول کو بھی فاطمہ اچھی لگی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھی اس نے ابھی سے طے کیا تا کہ وہ اسے امی کے بجائے چھوٹی امی کہہ کر بلائے گی۔ عطرت کینیڈا سے کیا آئی اس گھر کے لیے خوشیوں کی تتلیاں اپنے آنچل میں بھر لائی تھی۔ وہ سب بہت خوش اور مطمئن تھے پر اس کا دل بوجھل تھا۔

دادی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ تو ولایت بھائی کے دوست کے بھائی سے بھی کہیں گیا گزرا ہے۔ ہائے میرے خواب۔''

جوں جوں شادی کے دن قریب آتے گئے اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑتا گیا۔ اسے دیکھ کر دادی بھی ہولنے لگی تھیں کہ کہیں فاطمہ اور شاہنواز کا لگن سجو کو برا تو نہیں لگ رہا۔ وہ سوچتی اور چپ رہتی ڈاکٹر اسے دیکھ کر کمزوری کا نسخہ ہاتھ میں پکڑا دیتے، کوئی ڈپریشن کی دوائیں تھما دیتا تو وہ کیسے اپنا دل کا درد کسی کو بتاتی اور پھر اس گھر کے آنگن میں ڈھولک بجنے لگی۔

مہندی کا رنگ ہے لال بنو میری سانولی سلونی
بنو ہماری سیدھی سادی بنو کا بھیا انمول کہ
بنو میری سانولی سلونی
مہندی کا رنگ ہے لال بنو میری سانولی سلونی

کنول محلے بھر کی لڑکیوں کے ساتھ گلا پھاڑ پھاڑ کر گا رہی تھی اپنی شادی میں بھی جو شوق پورے نہ کر سکی تھی وہ سارے ارمان وہ سجو کی شادی میں نکال رہی تھی۔

''یہ دیکھ سجو! تیرے بری کے سارے کپڑے آ گئے ہیں۔ سارے بڑے بھاری ہیں اور زیور تو دیکھ۔''

''یہ نقلی زیورات ہیں نا بجو!'' نویرا بری طرح دیکھتے ہی ٹپک پڑی تھی۔

''یہ نقلی ہیں اور یہ لال ڈبے والی اصلی ہیں پر سن باہر محلے میں جا کر ڈھول نہ پیٹ ڈالنا کہ سونے کے زیور ہیں۔''

کنول نے اسے سرزنش کی۔

''میں پاگل تھوڑی ہوں بجو!...... ویسے ابھی امی بھی بری دیکھنے آنے والی ہیں۔''

''میں سونے کے زیور ذرا احتیاط سے رکھ آؤں۔''

کنول زیور کے ڈبے سنبھالے چلی گئی نویرا اس کا اترا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''یہ تو بتا سجو! تجھے کیا ہوا ہے۔ سب کچھ کتنا اچھا ہے اور تجھے کیا چاہیے۔''

''یہ تو نہیں سمجھے گی نویرا تو ابھی بچی ہے۔''

''میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں مجھ سے زیادہ اور کون سمجھے گا۔ ابھی سے اپنے لیے اچھا بر ڈھونڈ رہی ہوں تو بڑی ناشکری ہے گھر بیٹھے بیٹھے ہی مل رہا ہے ناں تو منہ ہی سجا لیا ہے...... اچھا یہ بتا کہ کل پارلر کتنے بجے جائے گی۔ میں بھی چلوں گی تیرے ساتھ یا بجو جائے گی۔''

وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی پر اس کا تو موڈ ہی آف تھا۔

''پتہ نہیں۔''

عجیب قسم کی روح سمائی ہے تجھ میں، لگتا ہے تیری دادی کی روح ابھی سے تجھ میں اتر گئی ہے۔''

وہ چڑ کر بولی

''دادی نے ہی تو دھوکا دیا ہے۔''

وہ زیر لب بڑبڑائی جو نویرا نہ سن سکی اسے تو رنگ برنگے چمکیلے کپڑوں اور زیورات سے غرض تھی وہ اس کے دل کا درد کیسے جانتی۔ اس کی آنکھ سے آنسو بہہ نکلا جسے اس نے چپکے سے اپنی انگلی کے پور میں جذب کر لیا۔

☆......☆

''مبارک ہو مبارک ہو۔'' کا شور فضا میں بلند ہوا تھا۔ قہقہوں کی آوازیں' کھانے کی خوشبو پرفیوم' پھولوں کے ہار یہ سب کچھ ایک فلم کی مانند اس کی نظروں کے سامنے سے گذر رہا تھا۔

''ہائے سجو تو کتنی پیاری لگ رہی ہے سچی۔''

نویرا نے اسٹیج پر دولہے کے برابر بیٹھی سجو کو دیکھ کر سچے دل سے کہا تھا۔

''نویرا......شرم نہیں آتی...... سجو آپی کہا کر بڑی ہے تجھ سے۔''

رخشندہ خالہ کو اس کے دلہن بنتے ہی اچانک اس کے بڑا ہونے کا احساس جاگا تھا۔ نویرا کا منہ اتر سا گیا۔

''ویسے تیرا دولہا بھی کم نہیں ہے۔''

اس سے رہا نہ گیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔ اور اس کا دل پھر دھپ سے بیٹھ گیا۔ کنول نے اسے کھانا کھلانے کی کوشش کی پر اس کے حلق سے ایک نوالہ بھی نہ اترا اور اوپر سے بھاری بھرکم کپڑے اور کلو کے حساب سے نقلی زیورات نے اور بھی حال برا کر رکھا تھا سو بس پانی پر ہی گزارا ہوا کہ اس کے لبوں سے پہلے ناک کی بھاری نتھ اچھل کر آ جاتی۔

''کیا گت بنا دیتے ہیں لوگ دولہن بیچاری کی۔''

اسے اپنے اوپر ترس آ رہا تھا۔ رخصتی کے وقت اتنی اونچی آواز سے روئی کہ شاہنواز کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ وہ تو شکر تھا خدا کا کہ کنول کی اونچی لے بھی ساتھ مل گئی تھی ورنہ تو اس کا اچھا خاصا تماشہ ہی بن گیا تھا۔

''اماں شاہنواز بھائی آپ لوگ فکر نہ کریں۔ میں سجو کو اپنی بہو نہیں بیٹی بنا کر لے جا رہی ہوں۔''

اس کا دل کچھ اور بھی بھر آیا۔

'بجو......''

وہ کنول کے گلے پڑ گئی پھر بڑی مشکل سے اسے بس کھینچا تانی کر کے سجی سجائی کار میں بٹھایا اور وہ پھر اندھیرے میں اتر گئی۔

''پانی کے چھینٹے مارو...... چپل سنگھائیں ...... نہ بیٹا یہ کوئی طریقہ ہے بس تم لوگ اس کے ارد گرد سے ہٹو ذرا ہوا لگنے دو۔''

سب کی ملی جلی آوازوں میں عطرت آنٹی کی آواز غالب آ گئی تھی۔

''دیکھو اسے ہوش آ گیا۔ بچی ہے...... ڈر گئی۔ سجل بیٹا یہ لو میرا بچہ تھوڑا پانی پی لو۔''

انہوں نے اس کا سر اپنے بازو میں لے کر ذرا سا پانی حلق میں ٹپکایا تو اس کی ذرا آنکھیں کھلیں۔

''گلنار......''

''جی بی بی جی......''

''ذرا اس کی نتھ تو اتارنے میں میری مدد کرو ۔ توبہ ہے اتنا زیور لاد دیا......''

عطرت آنٹی گلنار جو غالباً اس گھر کی نوکرانی تھی اس کے ساتھ مل کر اس کی نتھ اتارنے لگیں۔ نتھ اترنے کے بعد اسے کچھ آزادی محسوس ہوئی۔

''تم نے کچھ کھایا تھا میری جان۔ مجھے پتہ ہے یوں ہی چار بجے سے سوکھا منہ لیے بیٹھی تھیں۔ کنول نے مجھے سب بتا دیا تھا۔ گلنار جاؤ دلہن کے ساتھ کھانا بھی آیا ہے جاؤ تھوڑا سا لے کر آؤ' میری بچی کو بھوک لگی ہوگی......''

اس نے اس پیار بھرے انداز کے بعد انکار کی گنجائش بھی نہ تھی اور سچی بات ہے کہ بھوک بھی بہت شدید لگی تھی۔ ویسے ابا نے بڑے دل سے کھانا پکوایا تھا۔ بریانی تو بالکل اس کی پسند کے مطابق تھی اس نے پیٹ بھر کر کھائی پھر تھوڑا سا کسٹرڈ بھی عطرت آنٹی کے ضد کرنے پر کھایا بھرا پیٹ ہو تو انسان کی عقل کام کرنے لگتی ہے۔ وہ اب پٹر پٹر اپنے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اچھا بھلا کشادہ بیڈ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

روم تھا۔ پورے کمرے میں بڑا نفیس سا فرنیچر سیٹ تھا جو کمرہ سجانے والے کے ذوق کی تعریف کر رہا تھا شکر تھا کہ کمرے کو مزار کی طرح نہیں سجایا تھا ورنہ سال بھر تک بندہ ٹیپ اکھاڑتا پھرے۔ ذہنی طور پر وہ اب آمادہ ہو چکی تھی۔ گندمی رنگت موٹی نظر کی عینک دبلی پتلی جسامت۔ جو میرا نصیب۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ ہائے دادی۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے جھٹ گھونگٹ نکال دیا۔ گو دل تو ہرگز نہیں چاہ رہا تھا لیکن یہ ان دونوں کی پہلی ہی شادی تھی۔ اس بیچارے کے دل میں تو ڈھیروں ارمان ہوں گے۔

''السلام علیکم!''

بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ایں...... اتنی سوکھی جسامت پر آواز اتنی بھاری۔'' دل نے کہا۔ وہ اس کے روبرو ہی بیٹھ گیا تھا۔

''خالہ جی نے کہا تھا کہ سب سے پہلے دلہن کو رونمائی میں کچھ دینا۔ آئی مین گفٹ سو بڑی مشکل سے میں نے یہ رنگ پسند کی تھی۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔''

اس نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھاما اور درمیانی انگلی میں رنگ پہنا دی جس کے وسط میں ایک نازک سا ہیرا چمک رہا تھا۔

''ہوں پسند بری نہیں ہے بندے کی۔''

دل نے گواہی دی۔

''لڑکیوں کو ایسی ہی چیزیں پسند آتی ہیں...... ہوں۔''

اس نے آہستگی سے اس کا ہاتھ رکھا اور دھیرے سے گھونگٹ پلٹ دیا۔

''تھینکس عطرت خالہ۔ یور آر کیوٹ سجل......''

اس نے کچھ اس طرح سے کہا کہ اس سے رہا نہ گیا اور پٹ سے ہی اپنی آنکھیں کھول دیں جو حیرت سے پھٹ کر گویا چھت سے لگ گئی تھیں۔

''نعمان مسعود......'' بے خودی میں منہ سے کچھ ایسے نکلا کہ وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

''جی...... جی!''

درست تھا کہ اس کے دوست بھی اسے ٹی وی آرٹسٹ نعمان مسعود سے شباہت کے باعث اسے چھیڑتے تھے پر پہلی رات ہی اس کی دلہن نے اسے چھیڑا تھا یا یہ تعریف تھی۔

''ہائے دادی......''

دوسرے ہی لمحے میں وہ پھر اندھیروں میں کھو گئی تھی۔

''اوہو...... یہ اسے کیا ہو گیا۔''

وہ گھبرا کر اس کے ہاتھ سہلانے لگا پھر کچھ سمجھ میں نہ آیا تو دوڑ کر کمرے کا دروازہ کھولا۔

''رضوان...... گلنار...... کہاں مر گئے۔''

وہ زور زور سے آوازیں دے رہا تھا۔

''جی سر......''

دبلا پتلا سانولا سا آنکھوں پر عینک چڑھائے وہ نجانے کہاں سے نمودار ہوا۔

''جاؤ جلدی سے عطرت خالہ کو بلاؤ دیکھو وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔''

''جی سر۔''

وہ فوراً حکم کی تعمیل میں دوڑا۔

''توبہ...... چھوٹے سے علاقے کے بارہ الیف کے ڈبے جیسے گھر میں رہنے والی بد دماغ سی لڑکی کے نخرے تو دیکھو۔ ہوں......''

دل ہی دل میں وہ اسے بکتا جھکتا میڈم عطرت کے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

دوشیزہ ڈائجسٹ میں اشتہار کیوں دیا جائے؟

▶...... پاکستان کا یہ واحد رسالہ ہے، جس کا گزشتہ چوالیس (44) برس سے چار نسلیں مسلسل مطالعہ کر رہی ہیں۔

▶...... اس لیے کہ جریدے میں شائع ہونے والے اشتہارات پر قارئین بھرپور اعتماد کرتے ہیں۔

▶...... اس میں غیر معیاری اشتہار شائع نہیں کیے جاتے۔

▶...... پوری دنیا میں پھیلے، اس کے لاکھوں قارئین متوسط اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو مستند اور معیاری مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیتے ہیں۔

▶...... اس لیے کہ دوشیزہ ڈائجسٹ کو گھر کا ہر فرد یکساں دلچسپی سے پڑھتا ہے۔

▶...... جریدے کے ہر شمارے کو قارئین سنبھال کر رکھتے ہیں۔

▶...... اس جریدے کے بڑی تعداد میں مستقل خریدار ہیں، جو اندرون اور بیرون ملک پھیلے ہوئے ہیں۔

▶...... آپ کی مصنوعات کے اشتہار با کفایت اُن تک پہنچ سکتے ہیں۔

▶...... جریدے کی اعلیٰ معیار کی چھپائی آپ کے اشتہار کی خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔

شعبہ اشتہارات: دوشیزہ

88-C II فرسٹ فلور، خیابان جامی کمرشل، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فیز 7، کراچی

فون نمبر: 021-35893121 - 35893122

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ناولٹ

کن فیکون

پہلا حصہ

سب نے اس ایک دن کی بچی سے منہ موڑ لیا تھا۔ اللہ کا حکم یہی تھا اس میں اس معصوم کا کیا قصور لیکن رشتے داروں نے اس ننھی پری کے ماتھے پر منحوس کا ٹیگ ضرور چسپاں کرنا تھا... زندگی اور بندگی سے گندھی ایک خوبصورت تحریر

''عظمٰی اماں مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔''

چہرے پر خشک ہو جانے والے آنسو اب بھی اس کے چہرے کی چمڑی جھلسا رہے تھے اس نے دوبارہ تکیہ چہرے پر رکھ لیا تھا۔

''اچھا تم کھانا تو کھاؤ دوپہر کالج سے آ کر تم نے کھانا نہیں کھایا۔''

''اماں پہلے آپ میری بات کا جواب دیں۔''

''آیت تم کھانا کھاؤ پھر بات بھی کر لیں گے۔'' عظمٰی اپنے ازلی گداز دھیمے لہجے میں بولیں۔ عظمٰی نے آہستگی سے اس کے چہرے سے تکیہ ہٹایا۔

''تم فریش ہو کر آؤ میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں۔'' انہوں نے دونوں ہتھیلیوں سے اس کے گال تھپتھپائے۔ ''اماں'' اس نے عظمٰی کو پکارا۔ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے آیت خان کو دیکھا۔ ''کیا وہ ندیدوں کی پلٹن ڈائننگ ٹیبل پر موجود ہے مجھے ان کے ساتھ کھانا نہیں کھانا۔'' اپنی ننھی سی سرخ ہوئی ناک ہاتھ کی پشت پر رکھے ہاتھ گھماتی ہوئی بولی۔ روتے رہنے کی وجہ سے اس کے گلے میں خراشیں ہو گئی تھیں اس نے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر انہیں کیچر میں جکڑا۔ تمام لوگ کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں جا چکے ہیں۔ آیت نے چونک کر وال کلاک پر نظر ڈالی رات کے پونے بارہ بج رہے تھے۔ تم فریش ہو کر آؤ میں کھانا نکالتی ہوں۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے عظمٰی کو دیکھتی رہی پھر مسکراتے ہوئے بانہیں پھیلائے ان کے گلے لگ گئی۔ اب وہ انہیں کس پر کس کیے جا رہی تھی۔

''میرا بچہ۔'' اماں نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور باہر نکل گئیں جب وہ ڈائننگ ٹیبل کے قریب آئی تو پورے گھر میں ہو کا عالم تھا لاؤنج میں آواز دھیمی کیے ذیشان بیٹھا ہوا تھا۔ فرنٹ دیوار پر لگے ایل سی ڈی کے سامنے صوفے میں دھنسا ہوا، پیر اس نے قالین پر پسار رکھے تھے اور نظریں ہاتھ میں پکڑے موبائل کی روشن اسکرین پر گڑی ہوئی تھیں۔ ذیشان نے اچٹتی سی نگاہ آیت پر ڈالی اور پھر موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا آیت نے تیکھی نگاہوں سے اسے گھورا دل تو اس کا شدت سے چاہا اس تایا زاد کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

گریبان پکڑ لے اور دو چار طمانچے جڑ دے اس خبیث کے چہرے پر۔

''آیت کھانا گرم ہوگیا ہے آ جاؤ۔'' اس کے بدلتے تیور دیکھ کر اماں نے فوراً اسے آواز دی۔''کیا پکا ہے؟'' بیٹھتے ہوئے اس نے ڈونگے سے ڈھکن ہٹایا۔ دو عدد مرغی کی پنجر نما ہڈیاں اس میں پانچ ٹکڑے آلو کے تھوڑا سا بدرنگ شوربہ۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اماں کی طرف دیکھا ''تم یہ سفید چنے والا پلاؤ کھالو یہ لو ساتھ میں رائتہ بھی ہے۔'' اماں نے اس کے بولنے سے پہلے چاولوں کا پیالہ اور رائتہ آیت کے سامنے کردیا۔''اماں اسے پلاؤ کہہ کر پلاؤ کی انسلٹ تو نہ کریں' ایک کسیلی مسکان تھی آیت کے ہونٹوں پر۔ سب نے اپنے اپنے پیٹ کے دوزخ تو بھر لیے ناں دوسروں کا خیال کیوں کریں گے۔'' وہ بڑبڑائی۔ اماں اس کی پلیٹ میں چاول ڈالنے لگیں۔''بس کریں اماں۔'' عظمیٰ نے تھوڑے سے چاول ڈالے تھے کہ آیت نے ہاتھ کے اشارے سے مزید ڈالنے سے انہیں روک دیا۔

اماں اس وقت اس سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھیں ورنہ وہ ہتھے سے اکھڑ جاتی۔ اب! اماں اپنی پلیٹ میں چاول ڈال رہی تھیں۔ اماں آپ نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا وہ چونکیں۔ سوچا تھا تمہارے ساتھ کھاؤں گی۔ اماں مسکرانے کی جبراً فضول کوشش کرتی رہیں۔''ہاں جیسے آپ اور میرے لیے مغلیہ شاہی دستر خوان بچھنا تھا۔'' آیت کھانا کھاتے ہوئے بات نہیں کرتے چپ کرکے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کھانا کھاؤ۔'' عظمیٰ خان کی تمام تر توجہ اپنی پلیٹ پر تھی اس بار آیت نے جواب نہ دیا اور کھانے میں مشغول ہوگئی۔ ذیشان کبھی کبھار کن اکھیوں سے ان کی طرف بھی دیکھ لیتا اب اس کے کانوں میں ائیر فون گھسا ہوا تھا۔ گال کے ساتھ مائیک چپکائے اب سرگوشی انداز میں باتیں کرتا موصوف کھلکھلا کر مسکرا رہا تھا، ذیشان کے چہرے پہ معنی خیزیاں پھیلی ہوئی تھیں کھانے کے بعد آیت نے اماں سے کہا تھا ''رات بہت ہوچکی ہے صبح آپ کو تہجد کے لیے بھی اٹھنا ہوتا ہے آپ جاکر سو جائیں برتن میں سمیٹ دیتی ہوں۔'' ہاں یہ ٹھیک ہے برتن سمیٹ کر تم آ جاؤ۔''

''جی میں آتی ہوں۔'' وہ مصروف انداز میں بولی۔ اٹھتے ہوئے عظمیٰ نے ذیشان کی طرف دیکھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگیں آیت برتن سمیٹ کر جیسے ہی کچن سے باہر نکلی سامنے بیٹھے ذیشان نے بائیں آنکھ کو انگلی کی پور سے دباتے ہوئے آیت کی طرف دیکھا ''آیت'' ذیشان نے اسے ہلکے سے پکارا۔ اس کے اپنے کمرے کی طرف اٹھتے قدم رک گئے۔ پلٹتے ہوئے اس نے بغیر بولے تیوریاں چڑھا کر سوالیہ نگاہوں سے ذیشان کی طرف دیکھا۔

''پلیز آیت ایک کپ چائے بنادو۔'' اچانک سے دل جلا دینے والی مسکراہٹ ابھری تھی ذیشان کے چہرے پر۔

''ندرت کو اٹھائیں وہ آپ کو چائے بنادے۔'' آیت نے خشمگیں نظروں سے آنکھوں میں قہر اور ہٹ دھرمی برسائے ذیشان کی طرف دیکھا اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے بیڈ روم میں آئی تو اماں سو چکی تھیں کمرے میں پھیلی زیرو کے بلب کی دودھیا روشنی میں اماں کا چہرہ چاند کی مانند چمک رہا تھا اس نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا آہستگی سے ان کے ہاتھ کا بوسہ لیا ''سوری اماں'' اس قدر سرگوشی میں بولی کہ اپنی آواز خود بھی نہ سن سکی بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے سونے سے پہلے کی دعائیں پڑھیں جو بچپن میں اماں نے اسے سکھائی تھیں کلمہ پڑھا اور سیدھی کروٹ گال کے نیچے ہاتھ

رکھ کر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں جاچکی تھی...... آج صبح اماں نے اس کے قریب آتے ہوئے پوچھا تھا۔ آیت تم نے کالج جانا ہے! وہ جانتی تھیں کہ فرائی ڈے کو اس کے دو پیریڈ ہوتے تھے جبھی وہ اکثر کالج نہیں جاتی تھی جبکہ عظمیٰ چاہ رہی تھیں کہ آج وہ کالج ضرور جائے ورنہ سارا دن منہ لپیٹے اپنے کمرے میں پڑی رہے گی یا زبیدہ اور منزہ بھابھی پورا دن گھر کے کاموں میں لگا کر رکھیں گی اس کے لیے بہت سارے کام نکال لیے جاتے تھے۔ منزہ چچی اکثر رات کا کھانا آیت سے بنوانے لگی تھیں۔ آیت جان بوجھ کر کبھی مرچ تیز کردیتی تو کبھی نمک ایسا کہ نوالہ منہ میں نہ ڈالا جائے پھر انہوں نے آیت سے کھانا بنوانا چھوڑ دیا باقی کاموں میں اس کی جان ضرور ہلکان کرتی تھیں۔ آیت تم کالج جارہی ہو نا اٹھ جاؤ تیار ہوجاؤ میں تمہارے لیے ناشتہ بناتی ہوں۔'' آدھ کھلی آنکھوں سے اس نے اماں کو سلام کیا۔ آنکھیں پھر موندلیں آیت کے صبیح ماتھے کا انہوں نے بوسہ لیا محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئیں اماں اور آیت اکھٹی گھر سے نکلتی تھیں کالج اور یونیورسٹی کی بس انہیں پک اینڈ ڈراپ کرتی تھی۔ عظمیٰ خان نمل یونیورسٹی میں اسلامیات کی لیکچرار تھیں اور آیت بی ایس سی کررہی تھی۔ ان کا کالج اور یونیورسٹی میانوالی کے ایک نہایت سرسبز وخوبصورت مقام پر واقع تھا۔ اونچے پہاڑوں میں گھری یہ وادی جنت نظیر وادی کے روپ میں اس کرہ ارض میں واقع تھی۔ پاکستان کا قدیم ترین شہر میانوالی خوبصورت لوگوں کا شہر خانزادوں کا شہر جدی پشتی جاگیرداروں کا شہر جس کے ایک پوش علاقے میں آیت اپنی ماں عظمیٰ خان کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ نو بجے پیریڈ اٹینڈ کرنے کے بعد آیت اپنی دوستوں حدیقہ اور زنبیل کے ساتھ اس چشمہ کے نزدیک آ کر بیٹھ گئی جہاں یہ تینوں اکثر بیٹھا کرتی تھیں۔ اس چشمے کی نوک پلک درست کرنے میں ماہر کاریگروں نے نہایت جاں فشانی اور مہارت سے اس قدرتی چشمے کو لازوال کردیا تھا۔ تین چوڑی سفید ماربل ٹائلز کی سیڑھیاں اتر کر اس چشمے تک پہنچا جاتا تھا۔ دائیں جانب ہارٹ شیپ کا لان تھا جو ہمہ وقت رنگ برنگ موسمی پھولوں سے بھرا رہتا۔ سبز امپورٹڈ گھاس یوں لگتی جیسے بہت قیمتی ایرانی غالیچہ بچھا ہو۔ کل سے ویک اینڈ شروع تھا یہ تینوں ایک ہی بس پر جاتی تھیں۔ یونیورسٹی کی دو بسیں میانوالی شہری روٹ پر چلتی تھیں باقی بسیں قریبی مضافات کے مختلف قصبوں کے لیے مقرر تھیں۔ آیت یہ چاکلیٹ کھاؤ۔ زنبیل خان نے آیت کو خلاف معمول خاموش دیکھ کر بات کرنے کا آغاز کیا تھا۔ دوسری چاکلیٹ اس نے حدیقہ کو پکڑائی تھی۔ حدیقہ تو آدھی ختم کرچکی تھی جب کہ آیت آہستہ آہستہ اس کا ریپر کھولنے میں ابھی تک لگی ہوئی تھی اس کی نگاہیں یونیورسٹی کے حد نظر پھیلے پہاڑوں پر مرکوز تھیں جو جانے کتنی ان گنت صدیوں سے ایستادہ سانسیں روکے اپنی جگہ پر براجمان تھے۔ سورج کی کرنیں اس کے حسن میں اضافہ کررہی تھیں، ان پتھروں کے بھی قدرت نے کتنے بے شمار رنگ بنائے ہیں، بھورے، سیاہ، سرمئی، سفید، گلابی بنفشی قدرت کا یہ حسین خطہ۔ سختی سے بھنچے ہونٹ یک بارگی لرزے۔ کائنات کو اس قدر حسن بخشنے والا ربِ کُل تیرا کوئی ثانی نہیں۔ آیت کی ساکن پلکوں نے جنبش کھائی تھی حدیقہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔''اینی پرابلم؟'' آیت نے سر زور سے جھٹکا۔ یہ دونوں واحد دوست تھیں اس کی جن سے کبھی کبھار وہ اپنی پرابلمز شئیر کرلیتی تھی۔ بیکن ہاؤس میں بھی ان تینوں نے اکٹھا پڑھا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

آپس کی شناسائی خاصی پرانی تھی ان دنوں ابا آیت کے تعلیمی اخراجات کے لیے رقم بھجوایا کرتے تھے وہ ذہین تھی۔ آئی کیو لیول اس کا حیران کن تھا۔ دونوں بھائیوں کی مخالفت کے باوجود عظمیٰ خان نے آیت کو اچھے اسکول میں ڈلوایا تھا۔ بھابیوں نے ناک بھوں چڑھائی ہمارے بچے عام اسکولوں میں پڑھیں اور اویس خان کی بیٹی اتنے مہنگے اسکول میں پڑھے۔

''آیت آر یو اوکے؟'' حدیقہ نے نرمی سے اس کے کندھے کو چھوا تھا ''یس۔'' اب وہ تھوڑی تھوڑی چاکلیٹ کھا رہی تھی۔

''آیت کچھ ہوا ہے؟'' زنبیل کی پوری توجہ اس کی طرف تھی۔

''اس ایڈیٹ نے پھر تمہیں ستایا ہوگا تمہارے ساتھ بدتمیزی کی ہوگی؟'' حدیقہ کے چہرے پر تناؤ پھیلا تھا۔ ''ہاں کچھ دن پہلے میں کچن میں پانی پینے گئی تو ذیشان وہاں کھڑا مائیکرو ویو میں کچھ گرم کر رہا تھا میرے قریب آ گیا اتنا نزدیک کہ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

''پلیز آیت مجھ سے گھبرانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ میں تمہارا کزن ہوں بھئی مجھ سے کترانا کیسا؟ آیت تم مجھے واقعی بہت اچھی لگتی ہو۔''

''فار گاڈ سیک ذیشان بھائی مت اتنے چیپ بنیں کہ مجھے آپ سے گھن آنے لگے۔ ایسی چھچھوری باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے آپ کو۔'' میرا پارہ ایک دم چڑھ گیا تھا۔ وہ حیران ہوکر مجھے دیکھتا رہا۔ کیونکہ میں ہمیشہ خاموش ہوکر اس جگہ سے ہی چلی جاتی تھی جہاں وہ کھڑا ہوتا تھا۔ میں اس سے کنی کترا جاتی تھی کیونکہ وہ لوگ فوراً بڑا ایشو کریٹ کر لیتے ہیں۔ اماں بھی ہمیشہ مجھے ہی نصیحت کرتی رہیں۔ بیٹا درگزر کر دیا کرو اللہ ہے نا پھر تمہیں لوگوں کے رویوں کی کیوں فکر رہتی ہے۔'' اماں ہر بار مجھے قرآنی آیات کی تفسیر سنا دیا کرتیں اور پھر مجھے دم کرتیں۔ میں فوراً پرسکون ہو جاتی لیکن کب تک آخر میں کیوں ان لوگوں کی زیادتیاں سہوں۔ ان کی محکوم یا محتاج نہیں ہوں اپنا کھا رہی ہوں۔''

آج ان دونوں کو وہ اور ہی آیت خان دکھائی دے رہی تھی۔ زنبیل خان اور حدیقہ اس کی باتیں سن کر شاکڈ تھیں۔ آج سے پہلے آیت کے لہجے میں ایسی ترشی ان دونوں نے نہیں دیکھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ یقیناً کوئی بڑی بات ہوئی ہے جو آیت یوں ری ایکٹ کر رہی ہے۔ آیت کی آنکھیں گلابی ڈوروں سے بھرتی جا رہی تھیں لہجہ رندھ گیا تھا، اس نے آسمان کی وسعتوں میں آنکھیں گاڑ لی تھیں جہاں حد نظر نیلے امبر پر سفید، جامنی بادل شمال کی جانب تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ یقیناً اب وہ پہاڑوں پر ڈیرہ جمائیں گے اور خوب برسیں گے وہ مرغابیوں کے اس غول کو دیکھ کر مسکرائی جو روئی کے گالوں جیسے بادلوں کے نیچے اڑ رہی تھیں دیکھنے میں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ زنبیل اور حدیقہ کی نظریں آیت پر رکی ہوئی تھیں آیت سوچتے سوچتے اچانک بولی'' ذیشان نے لمحہ بھر کے لیے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا۔ میں سٹپٹا کر ایک دم بپھر گئی۔ اس کی ایسی حرکت کی مجھے امید نہیں تھی۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا ''میرا ہاتھ چھوڑ دو۔'' میری قہر آلود نظروں کی بھی اس نے پروا نہ کی اس نے یوں ہی میرا ہاتھ پکڑے رکھا۔ وہ آنکھوں میں بدستور طنطنہ اور خباثت بھرے خود کو ایزی رکھے چیونگم چباتا رہا اس کی بے باک نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے دوسرا ہاتھ کس کر اس کے گال پر جڑ دیا۔ وہ اس اچانک افتاد پر بوکھلا گیا'' خبردار جو تم نے آئندہ ایسی گھٹیا حرکت کی منہ نوچ لوں گی تمہارا۔'' میں گلے کے بل چیخی۔ وہ حیرت سے مجھے گھور رہا تھا۔ آواز سن کر پورا گھر اکٹھا ہو گیا۔ ذیشان ماں سے مخاطب ہوا ''آپ سب نے دیکھ لیا نے اپنی آنکھوں سے یہ لڑکی مجھے لائن مار رہی ہے۔ میں نے اگنور کیا تو میرا ہاتھ پکڑ کر رونے لگی کہ میں اس کے جذبات کی قدر نہیں کر رہا۔''

میں تو حیران رہ گئی۔ زبیدہ تائی نے مجھے بے بھاؤ سنا ڈالیں منزہ چچی بھی بڑبڑانے لگیں اماں بھی آواز سن کر اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ ''تائی جی یہ بکواس کر رہا ہے اس نے میرا ہاتھ پکڑا تھا۔''

''آیت تم جھوٹ بول رہی ہو میرا بھائی ایسا نہیں ہے۔'' ندرت آپا بھی مجھ پر برس پڑیں۔

''ہم اندھے نہیں ہیں تم اس کے آگے پیچھے منڈلاتی دکھائی دیتی ہو۔ ذیشان نے خود یہ بات مجھ سے کہی ہے۔'' تائی بہت گرم ہو رہی تھیں۔ تمہارا ابا خود تو امریکہ میں عیش کر رہا ہے اور تمہیں ہمارے گلے ڈالا ہوا ہے۔''

''تائی جی اتنا بڑھ بڑھ کر بولنے سے پہلے اپنے بیٹے کے چہرے پر میری پانچ انگلیوں کے نشان ضرور دیکھ لینا۔''

''کتنی لمبی زبان ہے تمہاری'' چچا زاد شہلا اور شانزے کیوں پیچھے رہتیں۔ آج کل شہلا اور ذیشان کا دھواں دھار قسم کا افیر چل رہا تھا۔ ''آیت تمہاری اماں کچھ نہ بولیں؟'' زنبیل گویا ہوئی ''نہیں جھگڑا بڑھ نہ جائے اس خیال سے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئیں۔ اماں کی بات بھلا کون سنتا ہے۔ وہ جب بھی میرے دفاع کے لیے بولیں بھائیوں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا تمہیں تو اپنے اویس بھائی کی یہ بیٹی بہت عزیز ہے نا عظمیٰ تمہارے باقی بھائیوں کی اولادیں تو جیسے سوتیلی ہیں نا تمہارے لیے اماں ہمیشہ ان دونوں بھائیوں سے کنی کتراتی ہیں تایا اور چچا بہت منہ پھٹ ہیں اور اماں ان جیسی نہیں ہیں۔'' آیت ظلم سہنا بھی تو گناہ ہے۔'' حدیقہ تم درست کہہ رہی ہو اس وقت اگر اماں تھوڑا سا بھی بول لیتیں تو گھر میں ایک طوفان کھڑا ہو جانا تھا اماں اور میرے کردار پر ان لوگوں کی زبانیں قینچی کی طرح چلتی ہیں کئی دنوں سے گھر میں شدید قسم کی ٹینشن چل رہی ہے۔'' ''آیت تم بتا رہی تھیں نا جب سے نمل کالج کا قیام ہوا ہے میم عظمیٰ خان تب سے یہاں پڑھا رہی ہیں یعنی تقریباً دس سال سے وہ تدریس سے وابستہ ہیں یہاں پر۔''

''ہاں۔''

''پھر تو انہیں یہاں پر گھر بھی الاٹ ہو سکتا ہے پر وہ کیوں درخواست نہیں دیتیں۔'' حدیقہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں'' آیت بار بار جلتی آنکھیں انگوٹھے اور انگشت شہادت سے دبا رہی تھی۔ توقف کے بعد گویا ہوئی۔

''میں نے اماں سے کہہ دیا ہے مجھے اب ان لوگوں کے ساتھ نہیں رہنا۔ آپ نمل میں گھر لیں یا مجھے ہوسٹل بھیج دیں۔''

''آیت تم فکر نہیں کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' زنبیل اور حدیقہ اسے سمجھا رہی تھیں وہ دونوں آیت کی فکر کرتی تھیں اس کا خیال تھا انہیں وہ آیت کے لیے پریشان تھیں۔

مس عظمیٰ خان تمام اسٹوڈنٹ کی مشترکہ فیورٹ مس تھیں۔ عظمیٰ خان نے اسلامیات میں ماسٹرز کیا تھا فرسٹ پوزیشن میں وہ بچپن سے ہی پڑھاکو قسم کی تھیں۔ ان کے ابا انہیں کتابی کیڑا کہا کرتے تھے۔ اسلام کیا ہے؟ اس پر انہیں وسیع دسترس تھی۔ انہوں نے ترمذی شریف کی تمام جلدوں کا عرق ریزی سے مطالعہ کیا تھا تمام آسمانی کتابیں انہوں نے سمجھ کر تفصیل کے ساتھ پڑھے ہوئے تھے اللہ کا ہر ہر حکم، حدیث نبویؐ، انہیں ازبر تھیں جیسے کسی نے گھول کر ان کے روم روم میں وہ تمام ذکر بھر دیئے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہوں۔ وہ عاشقِ رسولؐ تھیں قرآنی تفسیر پر ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ انہیں عبور حاصل تھا قرآن پاک کی کسی ایک لائن کے بارے میں بھی ان سے پوچھا جاتا وہ سورت آیت نمبر کا حوالہ دے کر یوں تفصیل روانی اور احسن طریقے سے سمجھاتیں کہ سوال کرنے والا انہیں سراہے بغیر نہ رہ سکتا۔ ماسٹرز کرنے کے بعد عظمیٰ کی شادی ہوگئی تھی ان کے والد ولی خان اعلیٰ خاندان کے درویش صفت آدمی تھے جن کے پاس علم کا خزانہ تھا۔ وہ چلتی پھرتی ڈکشنری تھے دنیا کے کسی بھی حصے کے متعلق ہر سوال کا جواب ان کے پاس ہوتا تھا۔ تمام عمر وہ میانوالی کے ایک گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ بڑے بیٹے نفیس خان جنہوں نے میانوالی گورنمنٹ کالج سے اسکالرشپ پر پڑھا تھا پھر انہوں نے لاہور جا کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم فل کیا اب تک وہ میاں والی کے ایک نجی کالج میں گریڈ بائیس کے پروفیسر تھے ان سے چھوٹے اویس خان تھے آیت کے والد انہوں نے ایم بی اے میں ماسٹرز کیا ان کے بعد افضال خان تھے جنہوں نے ایم ایس سی کیا تھا وہ واپڈا میں بہترین عہدے پر فائز تھے۔ افضال خان کے بعد عظمیٰ خان تھیں۔ اویس خان کو اپنی خالہ زاد عفت نصیر پسند آ گئی تھیں شادی میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئیں اویس کی شادی عفت سے ہوگئی۔ دونوں خوش تھے ان کی ازدواجی زندگی شاندار گزر رہی تھی ۔زبیدہ تائی منزہ چچی اور عفت میں خوب بنتی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد آیت پیدا ہوئی آیت تو بچ گئی لیکن عفت جانبر نہ ہوسکیں آیت کو جنم دینے کے چند گھنٹے بعد انتقال کر گئیں۔ آیت کی پیدائش کے وقت سے ہی اس کی آزمائش شروع ہوگئی۔ زبیدہ تائی نے عفت کی موت کا گہرا صدمہ لیا تھا انہوں نے آیت کو منحوس قرار دے دیا تھا جو آتے ساتھ چھوٹی سی عمر کی ماں کو ہڑپ کر گئی اویس عفت سے بہت محبت کرتے تھے کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک سالہ رفاقت کے بعد منی مٹی تلے اپنا مسکن بنالیں گی انہوں نے عفت کے ساتھ تیرہ مہینے گزارے تھے اس خوش حال زمانے میں ان دونوں نے ایک دوسرے کو بے تحاشہ محبتیں دیں۔ عفت نے جب ایکسپٹ کیا تو دونوں کی خوشی کی انتہا نہ تھی الٹرساؤنڈ رپورٹ میں پتہ چلا کہ بیٹی ہے دونوں بیٹی کا جان کر بہت خوش تھے کہ بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں والدین کی ہمدرد و خیر خواہ وہ خوش کیوں نہ ہوتے ان کے گھر اللہ کی رحمت آ رہی تھی۔

سب نے اس ایک دن کی بچی سے منہ موڑ لیا تھا۔ اویس سب کو سمجھا رہے تھے کہ اللہ کا حکم یہی تھا اس میں اس معصوم کا کیا قصور عفت کی زندگی اتنی ہی تھی لیکن تا جی زبیدہ اور منزہ کے رشتے داروں نے اس ننھی پری کے ماتھے پر منحوس کا ٹیگ ضرور چسپاں کرنا تھا۔ اتفاق سے دو دن بعد دادا ولی خان سیڑھیوں سے گر گئے۔ تائی چچی کی زبان پھر کھلتی چلی گئی ''لو جی آتے ہی دادا کی ٹانگ تڑوادی ماں کی جگہ یہی مر جاتی۔ پل بھر میں جوان جہان کو اس لوتھڑے نے نگل لیا۔ کیا ملا ایسی جونک جن کر۔'' وہ دنوں پرسے کے لیے آنے والی خواتین کے سامنے آٹھ آٹھ آنسو بہاتیں۔ اس ننھی سی جان کے لیے ان کے اندر کس قدر زہر جلن کڑھن برپا تھی۔ تلملاہٹ تھی کہ کم ہی نہ ہو پا رہی تھی۔ نجانے اس نومولود کے ساتھ کیسا بیر تھا ان دونوں کو۔ آیت ایک ہفتے کی تھی کہ زبیدہ تائی کی بھتیجی کی منگنی ٹوٹ گئی۔ وہ نزلہ بھی آیت پر گرا۔ اس بدبخت کا پیر ہی اس قدر بھاری ہے کہ آئے دن ہمارے خاندان میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ عظمیٰ خان جو شادی کے چھ ماہ بعد

طلاق لے کر میکے واپس آ گئی تھیں ان کے شوہر منظور حسین دقیانوسی خیالات کے مالک تھے۔ بے پناہ چھوٹے ذہن کے تنگ نظر اور شکی مزاج۔ عظمیٰ بہت پڑھی لکھی خاتون ہیں، منظور حسین کے ہر وقت کے شک نے عظمیٰ کی زندگی اجیرن کردی تھی۔ منظور کو بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا بنا سوچے سمجھے جو منہ میں آتا بول دیتے۔ ''یونیورسٹیوں میں پڑھنے والیوں کے بوائے فرینڈ ضرور ہوتے ہیں اور خوبصورت لڑکیاں تو کئی کئی لڑکوں سے بیک وقت دوستیاں رکھتی ہیں۔'' عظمیٰ شوہر کے اس قدر جاہلانہ رویے پر خود کو ان سیکیور فیل کرتی تھیں۔ پھر منظور حسین کی ماں، بھابیوں نے بھی جلتی پر تیل کا کام انجام دیا دراصل چھوٹی بھابی کی کزن منظور حسین کو پسند آ گئی تھی جو انہیں کے ساتھ دفتر میں کام کرتی تھی۔ سویٹی نامی وہ لڑکی چلتا پھرتا شرارہ تھی اسی شرارے کی خاطر پاکباز بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے کر بھائیوں کے پاس بھیج دیا۔

زبیدہ بیگم کی زبان کو اب لگام دینا مشکل ہوگیا تھا۔ بات بے بات عظمیٰ کے کردار کی دھجیاں اڑاتیں منظور حسین زبیدہ کے ماموں زاد تھے جانے عظمیٰ کے سسرال والوں سے کیا کیا باتیں سنیں شامت آ گئی عظمیٰ کی' بھائی الگ منہ بنائے دکھائی دیتے۔ بھابیاں ویسے ہی عظمیٰ کو بوجھ سمجھنے لگی تھیں۔ بھائیوں کے اس رویے کو برداشت کرتے ہوئے عظمیٰ کے والد ولی محمد نے بیٹی کو گلے سے لگالیا۔ عظمیٰ ماسٹرز کے بعد اسلامیہ کالج میں جاب کرنا چاہتی تھیں تب عظمیٰ کا رشتہ آنے پر ولی خان نے بیٹی کی شادی منظور حسین سے کردی تھی' جلد بازی میں یہ رشتہ طے پایا تھا حالانکہ دونوں گھرانوں کے مزاجوں میں بہت فرق تھا۔ عظمیٰ کے سسرالی پڑھے لکھے جاہل تھے جبکہ عظمیٰ کا میکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا، سوجھ بوجھ رکھنے والے تھے یہ اور بات کہ جب تیز طرار زبیدہ افضال خان سے بیاہ کر آئیں تو اپنی شاطرانہ چالوں سے افضال خان کو اپنا گرویدہ بنالیا وہ خوبصورت بیوی کے رنگ میں رنگتے چلے گئے۔ افضال خان بھی تمام قصور عظمیٰ کا ہی سمجھتے تھے ورنہ بھلا منظور حسین میں کیا کمی تھی۔ سیدھے سادے منظور حسین کو قابو نہ کرسکی۔ ایک مہینے بعد ہی منظور حسین نئی نویلی دلہن گھر لے آئے تھے۔ تب بھی بھابیوں کی آنکھوں کی چربی نہ ہٹی۔ ولی خان نے چاہا وہ دوبارہ عظمیٰ کی شادی کردیں وہ بیٹی سے شرمندہ تھے۔ ''ابا جی آپ اس طرح نہ سوچیں آپ نے تو میرا اچھا ہی سوچا تھا یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے اللہ کا حکم ایسے ہی تھا۔ اس میں آپ کی کیا غلطی ہے اللہ پاک کے فیصلے بہترین ہوتے ہیں اللہ نے ہمیں جلد ہی ان لوگوں کی اصلیت دکھادی ورنہ اگر دیر ہوجاتی تو جانے کس کس کا نقصان ہوتا۔'' عظمیٰ خدا پر بھروسہ رکھنے والی صابر شاکر متحمل مزاج کی لڑکی تھیں ''ابا جی مجھے شادی نہیں کرنی میں آپ کے پاس رہوں گی۔'' ولی محمد خان کبھی بیٹوں پر بوجھ نہیں بنے تھے ان کی پنشن ان کے لیے بہت تھی۔ پھر عظمیٰ نے ایک کالج میں اپلائی کیا فوراً اسے کال آ گئی تب وہ کالج میں اسلامیات پڑھانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اسلامی اسکالرز کی اعلیٰ کتابوں کا مطالعہ کرتیں وہ فارغ نہیں بیٹھتیں ساتھ ساتھ شارٹ کورسز بھی کرتی رہیں۔ ولی خان خوش تھے کہ عظمیٰ نے خود کو مصروف کرلیا ہے عظمیٰ مطمئن تھیں کہ منظور حسین جیسے شخص سے ان کی جان چھوٹ گئی۔ خدا کا جتنا شکر ادا کرتیں کم تھا اللہ کی ذات پر بے حد بھروسہ تھا۔ بھابیوں کی محاذ آرائی کی اب وہ پروا نہیں کرتی تھیں منزہ کی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح عظمیٰ کو گھر سے نکالا جائے، منزہ کا ایک بھائی ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ اس کی کپڑے کی دکان

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

تھی۔ تھوڑا بے وقوف تھا سیدھی ٹانگ کھینچ کر چلتا تھا۔ منزہ چاہ رہی تھی کہ اس سے عظمیٰ کی شادی کرادی جائے لیکن ولی خان نے سختی سے منع کر دیا تھا میری بیٹی کا اب کوئی نام نہ لے کسی پر بوجھ نہیں ہے یہ۔'' ماسٹر ولی خان کی بیٹی عظمیٰ خان جسے خدا نے شاید روز اول سے ہی اپنے لازول انس سے نواز دیا تھا پانچ سال کی عمر سے ہی وہ محلے کی بے بے جی کے پاس سپارہ پڑھنے جانے لگی تھیں عاتکہ باجی تو بس عظمیٰ کو ہی دیکھتی رہتیں جب وہ چھوٹی سی اوڑھنی اوڑھے ہل ہل کر سبق یاد کر رہی ہوتی اس کے چہرے پر ان کہی بے نام ملکوتی روشنی کی کہکشاں اتر آتی تھی۔ دھیمے لہجے میں بات کرنے والی عظمیٰ خان تمام بچوں کی فیورٹ بن چکی تھی۔ اویس بھائی کی شادی جیسے عفت سے ہوئی تو عظمیٰ کو تو دوست مل گئی تھی عفت' عظمیٰ کا بہت خیال رکھتی دن گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا اور ننھی پری چھوڑ کر عفت اپنے مالک حقیقی سے جاملی۔ عظمیٰ نے آیت کو گود لے لیا۔ ابا جی آج کے بعد میں اس کی ماں ہوں، خدا نے مجھے ماں نہیں بنایا لیکن صدقے جاؤں اس رحمٰن کے جس نے میری گود میں یہ پھول ڈال کر جیسے ممتا کے جذبے سے روشناس کرادیا۔ عظمیٰ نے ہی اس کا نام آیت رکھا تھا۔ آیت کی نیلی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی کتابی چہرے پر ننھی سی پتلی سی ناک کٹاؤ بھرے ہونٹ گلابی کھلتی صاف رنگت جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی تھی اس کے نقوش واضح ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے کی سبک متانت آمیز کھلی کھلی مسکراہٹ اسے اور دلکشی سونپ جاتی دونوں بھائی اور اویس کو فورس کر رہے تھے دوسری شادی کے لیے لیکن اویس خان نے دوٹوک انکار کر دیا تھا۔'' مجھے اب شادی نہیں کرنی عفت کی جگہ کوئی دوسری عورت نہیں لے سکتی میری بچی ہے میں خوش ہوں۔'' ولی خان اور عظمیٰ خان نے اویس کو سمجھایا بھائی آپ شادی کرلیں تنہا زندگی گزارنا بہت مشکل ہے مانا کہ عفت بھابی کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا مگر اکیلے میں بھی تو زندگی دشوار گزر بن جاتی ہے۔'' عظمیٰ میں اکیلا کہاں ہوں۔ میرے ساتھ میرے جگر کا ٹکڑا آیت ہے۔''

'' بھائی وہ تو ٹھیک ہے آپ آیت کی فکر نہ کریں آیت اب میری بیٹی ہے۔'' دونوں بھابیاں چاہ رہی تھیں ان کی بہن اس گھر میں آجائے ماسٹر ولی خان نے یہ فیصلہ اویس پر چھوڑ دیا تھا۔ زرقا ان کی دور پار کی رشتے دار تھیں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ڈریس ڈیزائنر تھیں اور امریکہ سے ڈیزائننگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئی تھیں تینوں بھائی امریکہ میں سیٹل تھے زرقا کے والد اس کی شادی کے لیے زرقا کو پاکستان لے کر آئے تھے عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے زرقا کے رشتے آنا بند ہو گئے تھے اویس اپنی لائف میں ویل سیٹل تھے پاکستان میں امریکن بینک میں اچھی جاب پر فائز تھے۔ زرقا کے لیے اویس خان کا رشتہ اچھا تھا جلد ہی ان کی شادی ہو گئی۔ زرقا نیچر کی اچھی تھیں ویسے بھی آیت کا ان پر کوئی بوجھ نہ تھا وہ تو عظمیٰ کی ذمہ داری بن چکی تھی اب زرقا کے کہنے پر اویس نے بوسٹن کے ایک بینک میں ٹرانسفر کی درخواست دی بوسٹن میں زرقا کے ایک بھائی اور والد رہائش پذیر تھے زرقا کی والدہ نہیں تھی۔ شادی کے صرف چھ ماہ بعد وہ دوسری بیوی کو لے کر امریکہ سدھار گئے۔ وہ اویس جو اپنی مرحومہ بیوی سے بے حد محبت کے دعوے کرتے تھے دوسری شادی کے لیے تیار نہیں تھے انہیں فکر تھی کہ کہیں ان کی بیٹی اگنور نہ ہواہی اویس خان نے اب کبھی عفت کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ پرانی محبت کو خوش خوش خیر باد کہہ کر بھی ذرا برابر ملال کی کیفیت میں مبتلا نہ تھے۔ نئی چاہتیں، تازہ محبتیں ان کے ماتھے پر نماز کی محراب کی مانند چ چکی تھیں اویس خان زرقا سے دھواں دھار قسم کی محبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ زرقا خوبصورت تھیں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ تابناک مستقبل رکھتی تھیں۔ پھر اویس خان کو کیا ضرورت تھی پرانی شناسائی کو گلے کا ڈھول بنانے کی جو ہر روز مراثی کے گلے کا ہار بنتا ہے۔ عظمیٰ خان نے اس ننھی پری پر اپنی محبتوں کی انتہا کر دی تھی۔ شاید ایسی محبت تو اس کی ماں بھی آیت کو نہ دے پاتی۔ جیسی محبت عظمیٰ نے اسے دی تھی عظمیٰ مطمئن تھی خوش تھی پل پل رب کا شکر ادا کرنے والی تھیں عظمیٰ بھائیوں بھابیوں پر بوجھ نہ بنیں ہر ماہ گی بندھی رقم زبیدہ بھابی کو دے دیتیں جبھی ان کی زبان قدرے بند تھیں۔ سامنے تو خوشامدی عزت سے عظمیٰ کو نواز دیتیں پیٹھ پیچھے عظمیٰ کے خوب چھلکے اتارتیں۔

اویس خان باقاعدگی سے آیت کے لیے ڈرافٹ بھجواتے جو بینک میں جمع ہوتی رہتی بھائیوں کو علم نہیں تھا کہ اویس بیٹی کے لیے بھاری رقم بھجواتے ہیں ورنہ وہ رقم بھی بٹور لی جاتی۔ آیت کے لیے عظمیٰ نے گورنس رکھ لی تھی دن کو جب عظمیٰ کالج ہوتیں تو ثوبیہ آیت کا خیال رکھتی ثوبیہ پڑھی لکھی سمجھدار اور تمیز دار لڑکی تھی۔ کافی تگ و دو کے بعد ایک اسٹوڈنٹ کی مدد سے انہیں اس تک رسائی ہوئی تھی۔ ثوبیہ نماز روزے کی پابند تھی وہ بہترین طریقے سے آیت کا خیال رکھ رہی تھی۔ آیت پانچ سال کی ہو چکی تھی ثوبیہ نے اسے گھر میں ہی نرسری پریپ اور ون کلاس پڑھادی تھی۔ آیت بہت تحمل والی بچی تھی۔ آئی کیو لیول نمبر ون سے بھی بڑھ کر تھا ثوبیہ جو سمجھاتی از بر اور ذہن نشین ہو جاتا۔ آیت ثوبیہ سے بہت مانوس تھی عظمیٰ نے بہترین اسکول میں آیت کے ٹیسٹ دلا کر ٹو کلاس میں اس کا ایڈمیشن کروادیا۔ وقت پر لگا کر ایسے بھاگا کہ پتہ ہی نہ چلا اور آیت نے میٹرک کر لیا ہمیشہ وہ پوزیشن ہولڈر رہی اساتذہ کی وہ فیورٹ اسٹوڈنٹ تھی۔ چودہ سال کی عمر میں اس نے میٹرک ضلع بھر میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ اس دوران اویس صرف ایک بار پاکستان آئے ماسٹر ولی خان کے انتقال پر ساتھ میں بیوی اور دو بچے بھی تھے۔ اویس آیت سے بہت پیار کر رہے تھے۔ اس کے لیے ڈھیروں تحائف لائے تھے۔ آیت بس انہیں دور سے دیکھا کرتی یہ ابا ہیں میرے کیا باپ ایسے ہوتے ہیں اس کا ننھا سا ذہن سوچتا رہا'' ابا آج تک میں نے آپ کے ہاتھوں کا لمس محسوس نہیں کیا پدرانہ انس محبتیں کیسی ہوتی ہیں، مانوس نہیں ہوں ایسے متبرک لمحات سے غافل ہی تو رکھا آپ نے مجھے۔ باقی بچوں کی طرح آپ کے گلے میں میں نے کبھی باہیں نہیں ڈالیں میں تو آپ کو اب دیکھ رہی ہوں سات سال کی عمر میں۔ آپ کی محبت کی والہانہ خوشبو سے میں ناآشنا ہوں اس خوشبو نے مجھے کبھی خود میں نہیں اڑھایا نہ ہی آپ کی بانہوں نے مجھے جھولا جھلایا اپنے کندھے سے لگا کر مجھے کبھی نہیں سلایا۔ وہ ایک کونے میں دبکی ٹکر ٹکر ابا کو دیکھتی اور سوچتی رہتی ابا آپ کی محبت سے میں مانوس نہیں ہوں آپ کے ہاتھوں کے لمس میں کس قدر مٹھاس بھری ہوگی میری دوست جب اپنے پاپا کی باتیں کرتی ہیں تو میں چپ سادھے رہتی ہوں میرے پاس تو کوئی ایسا ارفع اعلیٰ لمحہ ایسی یاد نہیں تھی جو میں ان کے ساتھ شیئر کرتی میری دوستوں کی آنکھوں میں جو چمک عود کر آتی تھی اپنے والد کے ذکر پر میری آنکھوں میں آج تک ایسا کوئی کوندہ نہیں لپکا۔ سات سال کی عمر میں آپ کو اب آ کر دیکھ رہی ہوں۔ کیا میری یاد کبھی آپ کو نہیں آئی آپ کا دل نہیں چاہا مجھے اپنے ساتھ رکھیں اپنے باقی دو بچوں کی طرح میرے بھی ناز اٹھائیں۔ نوالے بنا بنا کر میرے بھی منہ میں دیں مجھے بھی شبرام اور انعم کی طرح سیر کے لیے لے جائیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

،شاپنگ کرائیں چھوٹی ماں اپنے بچوں کی طرح میری انگلی پکڑ کر احتیاط سے سڑک پار کرائیں ماں خدانے لے لی آپ کو دوسری عورت مجھ سے چھین کر لے گئی۔ وہ سات سالہ بچی اس قدر حساس ہو چکی تھی بڑوں کی طرح سوچتی تھی ابا روزانہ شام کو آیت کو گھمانے لے کر جاتے ساتھ میں شہرام اور انعم بھی ہوتے دونوں ابھی چھوٹے تھے آیت سے بہت پیار کرتے تھے۔ اپنے اسکول فرینڈ کی باتیں اس سے کرتے اس کو ہنساتے اس کے ساتھ پارک میں کھیلتے پاپا بنچ پر بیٹھے ان تینوں کو دیکھ کر مسکراتے رہتے اس وقت ان کی آنکھوں میں آیت کے لیے محبت کا ایک سمندر امڈ آتا۔ آیت کو دیکھ کر انہیں عفت شدت سے یاد آتی آیت کی شکل ماں جیسی نکلتی آ رہی تھی۔ انہیں آیت کے چہرے پر بھرپور اعتماد دکھائی دیتا وہ زچ ہو ہو اٹھتے۔ اویس خان ایک بیٹی کی پرورش تو اچھے طریقے سے کر رہے تھے دوسری کو پیدا کر کے بھول گئے۔ اسے بہن کی گود میں ڈال کر اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان کو پس پشت ڈال دیا۔ باپ کا تحفظ کیا ہوتا ہے پدرانہ میٹھی چھاؤں کیسی ہوتی ہے آیت اس احساس سے عاری تھی اویس خان کفرانِ رحمت کے زمرے میں تھے۔ اس مالک کے سامنے جس نے فرمایا کن فیکون۔ پھر وہ کیوں نہ ہو جو عزوجل شانہ فرماتے۔ آیت خان ولد اویس خان ابن ولی محمد خان اپنی خواہش سے اس دنیا میں نہیں آئی تھی بلکہ رب کے حکم سے آئی تھی کن فیکون کہنے والے کے حکم سے آئی اسے دنیا میں لانے والا سبب بنا اویس خان پھر اس نے سات سال تک بن ماں کی بچی کو کیوں نظر انداز کیا پیدائش کے وقت سے ہی سب کی تیکھی بیزار نگاہیں اس کے ماتھے پر منحوس کے ٹیگ کے ساتھ آویزاں کر دی گئیں تائی چچی کو تو کسی صورت اس کا وجود برداشت نہیں تھا بڑبڑاتی رہتیں اویس خود تو امریکہ میں بیٹھا عیش کر رہا ہے اس منحوس کو ہمارے سروں پر تھوپ رکھا ہے۔ تایا افضال خان اور چچا فیض نے بھی کبھی آیت کا خیال نہ رکھا ویک اینڈ پر اپنے بچوں کو گھمانے پھرانے لے جاتے شاپنگ ڈنر سب چلتا لیکن آیت کو پوچھا تک نہ جاتا۔ اللہ پاک روز اوّل سے جانتا ہے کہ اس بچی کی پیدائش پر اس کی ماں کی روح قبض کر لی جائے گی اس بچی کی دیکھ بھال کس نے کرنی ہے؟ اس معبود نے اسی عظیم رب نے عظمیٰ کا گھر بنایا پھر گھر نہ بسا کر اولاد اس کے نصیب میں نہ لکھی اگر مالک یوم الدین اولاد عظمیٰ کی قسمت میں لکھ دیتا تو پھر اس بن ماں کی بچی کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا' نہ تائی نہ چچی اگر عظمیٰ بھی نہ ہوتیں تب بھی وہ مالک اس بچی کا بندوبست کر دیتا کیونکہ آیت کا ذمہ اللہ نے خود اٹھایا تھا۔ لیکن یہاں تو ایک بے اولاد کو ممتا چاہیے تھی، ایک بن ماں کی بچی کو واقعی ماں چاہیے تھی، سو وہ بچی عظمیٰ کے جینے کی وجہ بن گئی، رب جل شانہ نے اپنے بندوں کے لیے کتنے اسباب پیدا کیے ہوتے ہیں اپنی بے مثال حکمت کے تحت کم فہم کم ظرف مخبوط الحوس بندوں کی سمجھ میں اس کی حکمتیں نہیں آ سکتیں۔ آیت جانتی تھی عظمیٰ خان اس کی ماں نہیں ہے پھوپھی ہیں لیکن عظمیٰ نے ماں سے بڑھ کر اسے چاہا بچپن سے ہی نپے تلے لفظوں میں اسے سمجھا دیا تھا تمہاری ماں کا نام عفت تھا جو تمہاری پیدائش کے بعد اپنے مالک حقیقی کے پاس چلی گئی تھیں جہاں ہم سب کو اپنی اپنی باری پر جانا ہے۔ تمہارے ابا امریکہ میں ہوتے ہیں۔ تائی چچی نے کبھی آیت کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کیا' منحوس ہے کہ گردان کرتی رہتیں۔ افضال تایا کہ دو بچے تھے ذیشان خان اور ندرت خان فیض چچا کے شہلا شانزے صارم خان اور یاسر خان تھے اگر آیت لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی ہوتی تو شہلا آپی اس

کے ہاتھ سے ریموٹ چھین لیتی" شہلا آپی میں ڈرامہ دیکھ رہی ہوں۔" منہ بسورے اس نے شہلا کو دیکھا۔ "چھٹی والے دن تم اور کیا کرتی ہو سارا دن ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہتی ہو جاؤ میرے لیے چائے بنا کر لاؤ"۔ شہلا گھمنڈی انداز میں خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورتی، شہلا کا لہجہ خاصا تحکمانہ تھا، دو دن پہلے اس نے تایا ابا کے لیے چائے بنائی تھی تو اس کا ہاتھ جل گیا تھا، وہ گیارہ سال کی بچی ہی تو تھی تایا اور چچا اپنی بیٹیوں کے بجائے ہمیشہ آیت کو ہی کام کا کہتے تھے۔ "آیت شہلا آپی کے لیے چائے بنا رہی ہو تو ایک کپ میرے لیے بھی بنا لینا" ندرت آپی اچانک برآمد ہوئیں تھیں۔ وہ مرے مرے قدموں سے کچن کی جانب بڑھی۔ ننھے منے ہاتھوں سے گندی پڑی چائے کی پتیلی دھوئی۔ ماں آپ بھی میرے دفاع میں کچھ نہ بولنا۔

"آیت ابھی تک چائے نہیں بنی۔" شہلا کی باریک چبھتی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی "لا رہی ہوں شہلا آپی" اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ ابا پلیز مجھے اپنے پاس بلا لیں وہ سرگوشی میں یوں بڑبڑائی جیسے واقعی سات سمندر پار بیٹھے ابا اس کی آواز سن لیں گے اور کوئی طلسماتی اڑن کھٹولا لائیں گے اور فوراً اسے یہاں سے لے جائیں گے تب اسے اس شدید گرمی میں بھٹی کی مانند دہکتے کچن میں کھڑے ہو کر ان لوگوں کے لیے چائے بھی نہیں بنانی پڑے گی، چائے ابل کر برتن سے باہر نکل رہی تھی اور آیت مسکرا رہی تھی کیونکہ وہ اڑن کھٹولے میں ابا کے ساتھ بیٹھی افق سے باہم گلے ملتی وادیوں کی سیر کر رہی تھی۔ "آیت" تائی جان کے تڑک کر بولنے پر وہ بے طرح چونکی اس کے پیر زمین پر ڈگمگائے اس کا ننھا سا دل سہم کر اچھلا۔ "چائے گر رہی ہے تم کہاں غائب ہو۔" زبیدہ تائی نے اسے کندھے سے پکڑ کر زور سے جھنجوڑا۔ ایک تکلیف دہ کراہ اس کے بھنچے ہونٹوں کے اندر اچانک گم ہو گئی۔ "کبھی کام کی طرف بھی دھیان لگا لیا کرو یا روٹیاں ہی توڑتی رہو گی۔" تائی کی آنکھیں زہر اگل رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے چولہا بند کر دیا اور کپوں میں چائے ڈالنے لگی کپ ٹرے میں رکھ کے جیسے ہی وہ پلٹی تائی کی کٹیلی آواز اس کے کانوں میں اتری "چائے دے کر آؤ اور یہ ساری جگہ صاف کرو۔" زبیدہ تائی فریج سے سبزی نکالتے ہوئے بولیں۔ "جی اچھا۔" کل اس کا ٹیسٹ تھا اور اسے پڑھنا بھی تھا۔ پانچ منٹ کے لیے ٹی وی دیکھنے بیٹھی تھی کہ شہلا نے اسے وہاں سے اٹھا دیا انہیں چائے دے کر وہ دوبارہ کچن میں آئی "چولہے صاف کر کے سبزی بنا دینا۔" تائی سبزی کی ٹوکری کچن کاؤنٹر پر رکھتی باہر نکل گئیں۔ آیت نے لمحہ بھر کے لیے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو دیکھا اور پھر کلو کے قریب بھنڈیوں کی ٹوکری دیکھی ساتھ میں اتنے پیاز اور ٹماٹر پڑے دیکھے "پلیز ابا مجھے اپنے پاس بلوا لیں اتنے سارے کام مجھ سے نہیں ہوتے۔" اس کی آنکھوں میں درد کی نمی کا ریلا پھیل گیا۔ اماں اس وقت مشین لگا کر اپنے اور آیت کے کپڑے دھو رہی تھیں۔ ہفتہ بھر کے کام انہیں سنڈے کو ہی مکمل کرنے ہوتے تھے۔ اماں فارغ ہو کر کچن میں آئیں تو آیت چھری ہاتھ میں پکڑے پیاز کاٹ رہی تھی کڑا کسیلا چبھتا پیاز اس کی آنکھوں میں خنجر پرو گیا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ کی پشت سے آنکھیں دباتی پھر چھری پکڑ کر پیاز کاٹنے لگتی۔ آیت۔ عظمیٰ اماں کے دل پر گھونسا لگا "اماں" وہ چھری وہیں پھینک کر اماں سے لپٹ گئی۔ اب وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہچکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اماں کے پیٹ تک بمشکل اس کا سر پہنچ رہا تھا۔ یکبارگی اس نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

چہرہ اوپر اٹھا کر اماں کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو اماں پیاز کاٹنا بہت مشکل کام ہے اسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں میں تیزاب چھڑک دیا تھا۔ ''آیت جا کر منہ دھولو اور پھر بیٹھ کر پڑھو میں کرلیتی ہوں یہ سب۔'' وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے آنسو صاف کررہی تھیں۔ اماں آپ بہت اچھی ہیں وہ مسکرائی۔ ''میری گڑیا بھی تو بہت اچھی ہے نا'' اسے جیسے کسی اسیری سے اسے ایک دم رہائی مل گئی تھی وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگنے لگی معاً پھر کوئی اسے آواز نہ دے دے۔ عظمیٰ سبزی بنانے لگی تھیں۔ ''عظمیٰ آیت کہاں ہے؟'' گھنٹہ پہلے اسے سبزی کاٹنے کو دے گئی تھی۔'' زبیدہ تائی کچن میں آتے ہوئے انہماک سے کام میں لگی عظمیٰ سے بولیں ''بھابھی میں نے اسے اندر بھیجا ہے۔'' عظمیٰ اپنے مخصوص گداز لہجے میں گویا ہوئیں۔ بدستور زبیدہ کے ماتھے پر تیوریوں کا جال بنا ہوا تھا۔ ''عظمیٰ تم اس لڑکی کو بگاڑ رہی ہو اسے سبزی بنانے دیتیں ہم اس کے دشمن تھوڑی ہیں ہم تو چاہتے ہیں وہ کچھ سیکھ لے کل کلاں اگلے گھر میں جانا ہے وہاں کیا کرے گی؟''

''بھابھی اس کی آنکھوں میں کڑوے پیاز چبھ رہے تھے۔'' ہاں ہاں تم فضول میں اس کی طرف داریاں کرتی رہتی ہو۔'' عظمیٰ نے سامنے لاؤنج میں بیٹھی شہلا شانزے اور ندرت کی طرف دیکھا جو خوش گپیوں میں مشغول تھیں۔ تھوڑے وقفہ کے بعد ان کے قہقہے سنائی دیتے۔ شہلا صوفہ پر نیم دراز تھی جبکہ ندرت اپنے نیل فائل کررہی تھی۔ شانزے کے ہاتھ میں ولگر سا فیشن میگزین تھا۔ ماڈلز پر کمنٹس کیے جارہے تھے۔ ''بھابھی میں بنارہی ہوں سبزی۔'' عظمیٰ کے لہجے میں رتی بھر بیزاری نہیں آئی تھی۔ ''اچھا اچھا ہاں سنو عظمیٰ پانچ سو ذرا دینا مرغی منگوانی ہے تمہارے بھائی آئیں گے تو ان سے لے لینا۔ عظمیٰ ہر مہینے اپنے خرچ کی رقم دے دیتی تھیں پھر بھی آئے دن پانچ سو ہزار مانگ لیے جاتے تھے۔ ساتھ میں یہ بھی باور کرایا جاتا تمہارے بھائی آئیں گے تو ان سے لے لینا لیکن عظمیٰ نے کبھی ادھار دیے پیسے بھائیوں سے نہیں مانگے تھے۔ سبزی بنا کر سلیب پر رکھی اور سنک سے ہاتھ دھونے لگیں۔ اویس کا جب بھی فون آتا آیت منتیں کرتی پلیز ابا مجھے اور اماں کو اپنے پاس بلوالیں اویس اسے تسلی دیتے بیٹا کچھ کوشش کرتا ہوں عنقریب پاکستان کا چکر لگانے والا ہوں پھر سوچتے ہیں۔'' رات گئی بات گئی بھلا ابا آیت کو کیوں امریکہ بلواتے۔ وہاں زرقا خوب کمارہی تھی اس نے کئی بوتیک کھول لیے تھے۔ ڈیزائننگ آرٹس کا انسٹی ٹیوٹ بھی کھول لیا تھا زرقا کے پروجیکٹ وسیع ہوتے جارہے تھے۔ زرقا نے عالی شان قسم کا لگژری گھر خرید لیا تھا نیشنلٹی پہلے ہی اس کے پاس تھی اویس زرقا سے دبتے تھے وہ جورو کے غلام کہلائے جانے کے مستحق تھے پھر بھلا کیسے پہلی بیوی کی بیٹی کو اپنے ساتھ رکھ سکتے تھے۔ انہوں نے ایک دو مرتبہ زرقا سے ڈھکے چھپے لفظوں میں بات کی تھی۔ زرقا نے کھٹور پن سے انکار کردیا۔ مصلحتاً اویس خان خاموش ہوگئے۔ اویس سادا طبیعت کے مالک تھے۔ بحث مباحثوں سے کتراتے تھے وہ شوگر کے مریض بن چکے تھے۔ مگر پابندی سے آیت کے لیے ڈرافٹ بھجواتے تھے شاید ایسا کرکے وہ اپنا بوجھ کم کرتے تھے وہ بوجھ جو بیٹی کی جدائی میں دل پر دھرا تھا۔ آیت اسکول سے کالج میں آچکی تھی گھر والوں کا رویہ اس کے ساتھ بہت برا تھا۔ آیت کے ساتھ ناروا سلوک کرنا جیسے ان لوگوں کا فرض تھا تائی اماں کا پورے گھر پر کنٹرول تھا۔ تایا تھے ہی زن مرید ٹائپ کی شے جبھی باقی افراد بھی زبیدہ بیگم کو عقلمند و دانا شخصیت سمجھتے تھے میاں نے کیا سر پر بٹھایا باقی افراد کے سروں پر ناچنے کا پاورفل گر خود ہی انہوں نے سیکھ لیا تھا۔ تائی جان کی مرضی کے خلاف اس گھر میں پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ اس گھر میں تینوں بھائیوں کے ساتھ عظمیٰ کا بھی حصہ تھا ورنہ تو کب سے عظمیٰ خان کو اس گھر سے بیدخل کردیا جاتا اگر عظمیٰ بے دخل ہوتی تو ساتھ ساتھ آیت بھی ہوتی اب مزید آیت ان لوگوں کے رویے برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ وہ عظمیٰ خان سے شکوہ کرتی اماں آپ نے تمام عمر اسی طرح سمجھوتوں کی بھٹی میں خود کو جھونک کر گزار دینی ہے اماں مجھے آپ سے شکایت ہے کم از کم آپ تو اس گھر میں اپنی اور میری اہمیت کو اجاگر کرتیں، آپ اپنے لیے تو کچھ نہیں کرسکیں میرے لیے کیا کریں گی، کپڑے استری کرتی اماں کے پاس کھڑی وہ بولے جارہی تھی وہ پر گویا ہوئی عظمی اماں میرے باپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تو آپ نے بھی اچھا نہیں کیا۔ کیا آپ کے منہ میں زبان نہیں ہے تمام عمر مسکین بنے آپ نے زندگی گزار دی جو انسان اپنے لیے اسٹینڈ نہ لے سکے اس نے کسی اور کی اولاد کے لیے کیا کرنا ہے

'پلیز آیت'' وہ تڑپ اٹھیں جب آیت ایسے جملے کہہ کر ایک منٹ میں عظمیٰ خان کو پرایا کردیتی تھی ان لمحوں میں وہ شدید تکلیف سے دوچار ہوا ٹھتیں۔ دنیا میں خدا کے بعد سب سے زیادہ محبت آیت سے کرتی تھیں اگر ان کی اپنی بھی اولاد ہوتی تو اس سے بھی زیادہ محبت انہیں آیت سے ہوتی۔ آیت ان کے جینے کی وجہ تھی آیت ان کے لیے اس نہج پر سوچتی ہے آیت کا شکایتی تلخ لہجہ یکایک ان پر کوڑے برسا جاتا انسانی جبلتیں ہی تو دوسرے انسان کو اپنی زبان کی تندی کی مدد سے سولی پر لٹکا دیتی ہیں آیت کی لہجوں کی بازگشت سماعتوں کو چیرتی اعصاب کو شل کر جاتی۔ ''آیت کسی کے بخت کی خوشیاں کبھی کوئی دوسرا نہیں لے پاتا جس کے نصیب میں ہوتی ہیں اسے مل کر رہتی ہیں۔ تم ہر وقت شکوے نہ کیا کرو کہ اللہ کو پسند نہیں ہے شکوہ کرنا بلکہ اس کا شکر ادا کیا کرو۔'' عظمی گلوگیر لہجے میں نرمی اتار کر اسے سمجھاتیں وہ آیت کے ذہن پر چھائی دھند کی اس موٹی تہہ کو ہٹانا چاہتی تھیں آیت کی باتیں ان کے سینے پر نشتر بن کر لگتیں عظمی مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہرائی گئیں اللہ پاک تو نے ہمیشہ میری مدد فرمائی ہے اور ہمیشہ یونہی فرماتے رہنا مجھے تنہا نہ چھوڑنا عظمیٰ سات سال کی تھیں جب ان کی والدہ ہارٹ اٹیک سے اچانک انتقال کرگئیں جس ماں نے صبح ناشتہ کروا کر بیٹی کو اسکول بھیجا تھا جب بیٹی اسکول سے واپس آئی تو مری ہوئی ماں کو دیکھا تب عظمیٰ کی خالہ جو چچی بھی تھیں انہوں نے عظمیٰ کی پرورش کی عظمیٰ شروع سے ہی صبر و شکر کرنے والی متحمل مزاج والی بچی تھی عفو و درگزر جیسے ان کی گھٹی میں شامل تھا بڑے ہوکر بھی یہی چیز ان کے لیے وسیلہ صبر شکر تحمل کا باعث بنی بھابھیوں کے بھالوں کے مانند ڈستے رویوں نے وقتی طور پر انہیں شدید اذیت سے دوچار کیا تھا عظمیٰ ان سے مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں کیونکہ ایسا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ان کی نیچر ہی ایسی نہیں تھی۔ بھائیوں کا انداز بھی بہت لاپروا تھا۔ رشتے کتنی جلدی بدل جاتے ہیں کیونکہ یہ انسانی رشتے جو ہوئے اتنی جلدی گرگٹ بھی رنگ نہیں بدلتا ہمیشہ ایک ہی ٹیبل پر کھانا کھانے والے بہن بھائی کتنی آسانی سے ایک دوسرے سے دور ہوجاتے ہیں بھائیوں کی اولادیں بھی اپنی اکلوتی پھوپھی کی پروا نہیں کرتی تھیں عظمی خود کو مصروف رکھتیں اکثر درد کی صلیبیں بھاری بھرکم سلوں کی مانند ان کے سراپے کو اپنے حصار میں قید کرلیتیں تو چند قرآنی تفسیر پڑھتیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

جن میں اللہ جل شانہ نے صبر کرنے والوں سے مخاطب ہوتے ہوئے ان کے بلند درجات ارشاد فرمائے ہیں ان کی قبروں کو جنت کے باغوں کا بہترین باغ فرمایا ہے اللہ کی رضا پر راضی رہنے والوں کے لیے اجر عظیم ہے ایسا اجر کہ بندے کی سوچ بھی وہاں تک نہیں پہنچ پائے۔ پر وہ اپنی اس چار روزہ زندگی کی خاطر اپنی دائمی آخرت کو کیوں خراب کرتیں۔ کن فیکون اس پر قادر ہے رب العزت اگر میرا پروردگار چاہتا تو میری اس دنیاوی زندگی کو سہل بنانے کے لیے فرمادیتا کن فیکون۔ لیکن اس میں بھی اس کی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔ اگر وہ مجھے ڈھیروں ڈھیر نعمتیں عطا کردیتا ممکن ہے تب میں دنیاوی آسائشوں میں کھو کر اس رب کو بھول جاتی اسے ایسے یاد نہ کرتی اس کے حکم کو فراموش کردیتی۔

اللہ کا احساس ہر پل ان کے ذہن کے پردے پر جھلملاتا اس رب کے خیال کی دلآویزی سے ان کے ہونٹوں پر گداز مسکان بھر جاتی اللہ کا قرب تو عظمٰی خان کی سرشت میں بسا ہوا تھا پھر بھلا وہ کیسے اس مالک سے اس کے خیال سے فراموشی کی کیفیت میں رہ سکتی تھیں۔ عظمٰی خان اپنا احتساب خود ہر وقت کرتی رہتی تھیں۔ مجھے کس قدر نعمتوں سے نوازا ہے اس رب نے اچھی شکل وصورت۔ اعلیٰ خاندان تعلیم دینی دنیاوی صحت تندرستی سب سے بڑی نعمت جو رب نے آیت کی صورت میں میری گود میں ڈالی۔ بھلا مجھے اب اور کیا چاہیے میں خوش اور مطمئن ہوں۔ یہ اعتماد ہر پل ان کے چہرے سے چھلکتا تھا وہ بیخودی کے عالم میں مسکراتیں وہ ہمیشہ دعا کرتیں مالک مجھے ہر پل نفس امارہ کی غلامی سے بچانا ورنہ میں دونوں جہانوں میں شدید خسارے میں رہوں گی مجھے قطعاً ایسا خسارہ نہیں چاہیے مجھے تو بس رب کل تیری خوشنودی چاہیے۔ اپنے محبوب محمد مصطفیٰ ﷺ کی رہنمائی اور بے پناہ محبت میرے دل کے کونے کو منور کرنے کے لیے مجھے عنایت کردے۔ وہ اپنے انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگاتیں اور عرض کرتیں میرے پالنے والے میری ڈیمانڈ اتنی بڑی نہیں ہے کہ تو اسے پورا نہ کرسکے بس مجھے اپنا اور اپنے محبوب کا قرب بخش دے میری التجائیں قبول فرما وہ اپنے ہاتھوں میں پکڑی تسبیح بغور دیکھتیں اور اپنے آپ مسکراتی رہتیں۔

''اماں اس وقت آپ مجھے بہت بری لگ رہی ہیں۔'' آیت جو کب سے اماں کو نوٹس کررہی تھی ایک لخت تڑپ کر غرانے والے انداز میں بولی۔ تب عظمٰی خان اچانک چونک جاتی آیت کی اس کسیلی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھتی۔

''تمہارے لیے کیا بنا کر لاؤں کیا کھاؤ گی؟''

اسے ان لمحوں میں اماں اچانک سے معصوم لگنے لگتیں

''ذرا آپ کچن میں جائیں تو سہی وہاں پھولن دیوی کچن کا محاصرہ کیے ہوئے ہے آپ اپنی مرضی سے تو اس گھر میں کچھ نہیں بناسکتیں۔''

''آیت تمہیں باہر سے کچھ منگوادیتی ہوں۔''

اماں اس کا موڈ بحال کرنا چاہتی تھیں ہر بات کا عظمٰی خان کے پاس آسان حل ہوتا تھا اماں اچانک سے اس بگڑے تیور والی لڑکی کا موڈ صحیح نہج پر لے آتی تھیں۔ آیت صلح جو نگاہوں سے اماں کو دیکھتی تو عظمٰی میٹھی مسکان کے ساتھ اس کا گال تھپتھپاتی۔ ''اماں ذرا آپ ادھر تو بیٹھیں۔'' وہ بیٹھ جاتیں۔ ''ہاں بولو۔

''غور سے میری بات سنیں۔''

''بات سناؤ گی تو سنوں گی۔''

''آپ نے یونیورسٹی میں گھر کے لیے درخواست دی ہے؟''

''نہیں۔'' عظمٰی کا انداز سپاٹ ہوگیا تھا۔

''کیوں نہیں اماں؟'' آیت کا چیختا چلاتا لہجہ ان کی سماعت سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھیں اچانک پھیلیں ہونٹ مزید بھنچ گئے تھے۔

(اس ناولٹ کا اگلا حصہ آئندہ ماہ)

ماشٹر نثار تکیہ شیخ چلی کے اکھاڑے میں صراحی دار امرودوں کے درختوں تلے لنگوٹیاں باندھ کر بیٹھے بدن پر تیل کی مالش کررہے ہوتے تھے اور کمپنی باغ کو جاتی نہر کی جانب سے کھٹے کے پھولوں کی خوشبو آرہی ہوتی......

اس وقت جب میں ایک اسٹرانگ کپ آف ٹی پی کر ماشٹر نثار پر لکھنے بیٹھا ہوں تو میری گھڑی صبح کے ساڑھے پانچ بجارہی ہے اور میرے کمرے کی کھلی کھڑکی میں سے باہر اسکول کی گراؤنڈ کے شبنم آلود سبزے کی مہک آنگن میں کھلے موتیے کی خوشبو کو ساتھ لے کر اندر آرہی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے امرتسر میں اس وقت میں اور ماشٹر نثار تکیہ شیخ چلی کے اکھاڑے میں صراحی دار امرودوں کے درختوں تلے لنگوٹیاں باندھ کر بیٹھے بدن پر تیل کی مالش کررہے ہوتے تھے اور کمپنی باغ کو جاتی نہر کی جانب سے کھٹے کے پھولوں کی خوشبو آرہی ہوتی۔

ماشٹر نثار اور میں ہم عمر تھے' یہی کوئی چودہ' پندرہ برس کی عمریں ہوں گی مگر وہ بڑا کمزور تھا۔ رنگ گہرا سانولا تھا' پتلی گردن پر کدو ایسا سر جھولتا رہتا اور زرد آنکھیں لوکاٹ کی ٹہنی پر بیٹھی شیاما چڑیا کو دیکھ کر بے قرار ہو اٹھتیں۔ ہمیں صبح صبح پہلوانوں کے ساتھ اکھاڑے میں کسرت کرنے کا بہت شوق تھا۔ ہم بھی پہلوانوں کی طرح بدن پر خوب مالش کرتے' اکھاڑے کے کنارے گڑے ہوئے تیل میں چپڑے بانس کو تھام کر بیٹھکیں لگایا کرتے۔ جلد ہی تھک جاتے اور پھر اکھاڑے کی ٹھنڈی مرطوب مٹی پر چت لیٹ کر لمبے لمبے سانس لینے لگتے پھر ہم اکھاڑے میں اتر کر نامی گرامی پہلوانوں کی طرح پنجے میں پنجہ ڈال کر کھڑے ہوجاتے اور پھر یوں داؤ پیچ سے کام لیتے گویا رستم زماں کے شاگرد ہوں۔ اپنے اناڑی پنے کی وجہ سے ہم کشتی لڑتے لڑتے ہر بار بڑے پہلوانوں کی زد میں آجاتے جو ہماری پیٹھ پر لات مار کر ہمیں پرے ہٹا دیتے۔ اکھاڑے سے باہر نکل کر ماشٹر نثار دھاگا اپنی رانوں کے گرد لپیٹ کر یہ دیکھا کرتا کہ وہ کل کے مقابلے میں آج کتنی بڑھ گئی ہیں۔ واپس آکر ہم بسے گوجر کی دکان سے پیڑوں کی لسی پیتے اور پہلوانوں کی طرح چھاتی پھلا کر گلی میں اِدھر اُدھر گھومنے لگتے۔

بسا گوجر بھی بڑا مزے دار آدمی تھا۔ وہ پہلوانی چھوڑ چکا تھا مگر اس کا جسم اب بھی بڑا سڈول تھا۔ ہفتے میں ایک بار گائے کے دودھ سے ضرور نہاتا مگر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وہ بڑا ڈرپوک تھا' اندھیرے میں اس کے پاؤں نہ اٹھتے تھے اور روشنی میں چھپکلی کو دیکھ کر وہ دکان کی گدی پر اچھل پڑتا تھا۔ سارا دن وہ دکان پر دودھ دہی بیچتا' گوجروں سے حساب کتاب کرتا اور اور شام کو تحصیل پورے والے ٹھیکے پر جا کر پیٹ بھر کر مٹھ مالٹا شراب پیتا' ساتھ ایک کونڈا دہی کا کھا جاتا اور پھر تخی سرور کے تکیے پر جا کر گھڑے پر رات گئے تک ماہیا گاتا رہتا۔ بسے گوجر کے کان ٹماٹروں کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ ایک روز ہمیں لسی کا پیالہ تھما کر بسے گوجر نے کہا۔ ''اوئے منڈیو' تسی کہاں سے پہلوان ہو؟ اوئے' تمہارے ابھی کان ہی نہیں ٹوٹے۔''

مجھے یاد ہے' اسی روز ہم تکیہ تخی سرور گئے تھے اور ماسٹر نثار نے ایک اینٹ نیچے رکھ کر دوسری اینٹ سے میرا کان توڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں درد سے چیخ اٹھا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے کان نہ ٹوٹ سکے۔

چیت بیساکھ کے دنوں میں ہم بانس کی تیلیوں کے پنجرے لے کر کھیتوں' باغوں میں سرخیں پکڑنے جایا کرتے تھے۔ مادہ سرخ پنجرے میں بند ہوتی' پنجرے کا دوسرا دروازہ کھول کر رسی کا دوسرا سرا ہاتھ میں لیے ہم جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے۔ جونہی کوئی نر سرخ اپنی مادہ کو دیکھ کر پنجرے میں داخل ہوتا' ہم رسی کھینچ دیتے۔ پنجرے کا دروازہ کھٹ سے بند ہو جاتا اور ہم خوشی خوشی گھر لوٹتے۔

ماسٹر نثار کا اصل نام کچھ اور تھا' یہ نام اس نے میڈن تھیٹرز کے مشہور ہیرو ماسٹر نثار کے نام پر رکھ لیا تھا کیونکہ اسے بھی اصل ماسٹر نثار کی طرح گانے اور اداکاری کا بڑا شوق تھا۔ انہی دنوں امرت ٹاکیز میں اصلی ماسٹر نثار اور مس کجن بائی کی فلم ''لیلٰے مجنوں'' لگی تو ہم دونوں دیکھنے گئے۔ اسکرین پر جب ماسٹر نثار نے مجنوں کے روپ میں قبرستان میں جا کر قبروں کو سونگھنا شروع کیا تو ماسٹر نثار نے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔ ''دیکھتے جانا' دیکھتے جانا' ہائے' ہائے' ہائے۔''

تھوڑی ہی دیر میں اسکرین پر مجنوں نے ایک قبر کو جو جھک کر سونگھا تو خوش ہو کر بولا۔ ''اسی قبر میں سے میری لیلیٰ کی خوشبو آ رہی ہے' ضرور یہی میری لیلیٰ کی قبر ہے۔''

اس کے بعد اس نے ایک ہاتھ ہوا میں پھیلایا' نتھنوں کو پھلایا اور گانا شروع کر دیا۔

ہاں' ہاں' راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا
جھونکا ہوا کا جیسے اِدھر سے اُدھر گیا

میرے ساتھ دو آنے والی تھرڈ کلاس میں بنچ پر بیٹھا ہوا ماسٹر نثار جھومنے لگا۔ باہر نکل کر اس نے کہا۔ ''میں ذرا اپنے گانے کو پکا کر لوں پھر ہم دونوں کلکتے جا کر میڈن تھیٹرز والوں کی فلم کمپنی میں کام شروع کر دیں گے۔''

ماسٹر نثار کو لیلیٰ مجنوں' راجہ ہریش چندر' جلتی نشانی' روپ بسنت' دھوپ چھاؤں' اناتھ آشرم' حاتم طائی اور نقشِ سلیمانی فلموں کے کئی گیت زبانی مع طرزوں کے یاد تھے۔ اس نے یہ سارے کے سارے گیت ایک کاپی میں نقل کر رکھے تھے جس کے باہر موٹے قلم سے لکھا تھا۔ ''ماسٹر نثار امرتسری عرف شیر دل۔''

ماسٹر نثار ڈھولک بہت اچھی بجا لیتا تھا۔ یہ فن اس نے کلیر شریف کے عرس پر ایک استاد سے سیکھا تھا جو ایک ہیجڑے کے پیچھے ڈھولک بجایا کرتا تھا۔

ڈھولک وہ اس انہماک سے بجاتا کہ اس کی زرد آنکھیں بند ہوتیں' پتلی گردن پر تربوز جیسا سر جھول رہا ہوتا اور دبلا بدن یوں دائیں بائیں پیچ وخم کھا رہا ہوتا گویا کوئی اسے گدگدی کر رہا ہو' ساتھ ہی وہ گاتا بھی۔ اس کی آواز بہت بری تھی۔ اسے راگ داری سے بھی کوئی واقفیت نہ تھی مگر وہ درد میں ڈوب کر گاتا تھا۔ جب وہ ناک سے سانس لیتا تو ایک سیٹی سی بج

اٹھتی۔ ذرا کی ذرا اپنی آنکھیں کھول کر ماسٹر نثار چھت کی طرف دیکھتا اور آنکھیں بند کر کے گردن ایک طرف ڈھلکا کر مصرع اٹھاتا۔

راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا

وہ گانے میں لفظوں کو بگاڑ دیا کرتا تھا مثلاً مجھے اچھی طرح یاد ہے بلکہ اس وقت بھی جب میں اس کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو میرے کانوں میں اس کے گانوں کی آواز گونج رہی ہے۔ وہ 'راحت کا اس طرح سے زمانہ گزر گیا' میں 'زمانہ' کو ہمیشہ 'زمائی نا' کہا کرتا تھا۔

راحت کا اس طرح سے زمائی نا گزر گیا

اس کے علاوہ اس کی عادت تھی کہ وہ گاتے ہوئے ہر شعر یا گیت کے آخری لفظ کے ساتھ 'ہاوم' ضرور لگا دیا کرتا تھا۔ اسے شاہو موک کی فلم ''آوارہ گرد راج کمار'' کا یہ گانا بہت پسند تھا۔

بے کس ہوں' مجبور ہوں میں
جان سے لاچار ہوں

اس کو وہ یوں گایا کرتا۔

بے کس ہوں' مجبور ہوں میں ہاوم
جان سے لاچار ہوں ہاوم

کبھی کبھی وہ گانے کے شروع میں بھی ہاوم لگا دیا کرتا مثلاً فلم 'حاتم طائی' کے پہلے گانے کو جسے دو فرشتے گاتے ہیں' وہ یوں گایا کرتا تھا۔

ہاوم اٹھ حاتم' کیوں سویا نادان ہاوم
اٹھ بندے' رب کو پہچان ہاوم

کبھی کبھی وہ ماسٹر نثار ایسا ایکٹر نہ بن سکنے کی وجہ سے بڑا اداس ہوتا تو وہ پاسنگ شو سگریٹ کا لمبا کش لے کر اور ناک سے سیٹی بجا کر دھواں نکالتا اور ڈھولک گھٹنوں میں دبا کر اسے کستے ہوئے کہتا۔

''میدے باؤ' کبھی اپنے بھی دن ضرور پھریں گے۔''

پھر آہستہ آہستہ ڈھولک بجاتے ہوئے اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ گردن ایک طرف کندھے پر جھک جاتی اور ایک درد بھری آواز ابھرتی۔

شیام ناہیں آئے
تڑپت جیا مورا

وہ ڈھولک بجانے اور گانے میں مگن رہتا۔ وہ دنیا کے جھنجٹوں سے بے فکر ہو کر گا رہا ہوتا کہ باہر سے اس کے والد امام دین حجام کی آواز آتی۔ ''اوئے تان سین دیا پترا' بس کر' ہٹی تے نئیں جاناں؟''

ماسٹر نثار فوراً ڈھولک سے ہاتھ کھینچ لیتا اور آنکھیں کھول کر بلند آواز میں جواب دیتا۔ ''آیا میاں جی......!''

وہ اپنے باپ کا بڑا ادب کرتا تھا جس طرح اس زمانے میں سب بچے اپنے ماں باپ کا ادب کیا کرتے تھے حالانکہ اس زمانے کے باپ اپنے بچوں سے آج کل کے باپوں کی طرح لاڈ پیار نہیں کیا کرتے تھے' الٹا مارا پیٹا کرتے تھے۔ ماسٹر نثار کا والد حجام تھا' بھرا بھرا گول چہرہ' سفید داڑھی' سر کے سفید بال جن پر وہ مہندی لگا کر پیپل کے پتے باندھا کرتا تھا۔ زیادہ بھنگ پینے کی وجہ سے اس کے چہرے کی رنگت سبزی مائل پھیکی پڑ گئی تھی۔ میری حجامت بناتے وقت وہ بورے پر بیٹھا میرا سر اپنے گھٹنوں میں دبا لیتا اور مشین سے خشخاشی کرنے کے بعد سر پر جب آم کی گٹھلی پھیرتا تو مجھے بورے پر تارے چمکتے نظر آتے۔ ماسٹر نثار نے والد کا پیشہ اختیار کرنے کی بجائے ترکھانہ کام کو ترجیح دی تھی۔ چنانچہ وہ حاجی اللہ دتا ترکھان کی دکان پر کام سیکھا کرتا تھا۔ یہ حاجی اللہ دتا ترکھان بھی ایک طرفہ بزرگ تھا۔ وہ خربوزے کی پھانک بیجوں اور چھلکے سمیت کھایا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں خربوزے کی اصل اور مفید شے تو اس کے بیج اور چھلکا ہوتا ہے۔ یہ گودا تو قدرت نے یونہی ساتھ لگا رکھا ہے۔

کبھی کبھی میں حاجی صاحب کی دکان پر ماسٹر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

نثار کو ملنے جایا کرتا۔ دکان میں کٹی ہوئی لکڑیوں کی گیلی گیلی خوشبو پھیلی ہوتی اور ماشٹر نثار ایک طرف بورے پر تیشہ لیے بیٹھا لکڑیوں کے تختے چھیل رہا ہوتا۔ بازار میں سے گزرتے جھنڈ کی لکڑیوں سے لدے ہوئے گڈے گزرتے تو میں آنکھ بچا کر ایک ڈنڈا کھینچ لیتا۔ ماشٹر نثار اس کا بڑا خوب صورت گلی ڈنڈا گھڑ دیتا اور ہم گرمیوں کی شکر دوپہروں میں انجمن پارک یا الیگزینڈرا گراؤنڈ میں جا کر گلی ڈنڈا کھیلا کرتے۔

جمعے کے روز ہم دھلے ہوئے کپڑے پہن کر مسجد خیرالدین ہال بازار میں جا کر جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ میرا لباس عام طور پر سفید ٹاسے کی قمیص، کلکتے کی چارخانہ دار دھوتی اور سلیپر پر مشتمل ہوتا لیکن ماشٹر نثار کی سج دھج نرالی ہوتی تھی۔ وہ چاند خاں پٹواری کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک کنگھی سے تیل میں چپکے بال سنوارتا اور لٹھے کی کھڑکھڑاتی شلوار کے بل درست کرتا رہتا اور پھر یوں سنبھل سنبھل کر میرے ساتھ چلتا گویا تنی ہوئی رسی پر چل رہا ہو۔ مسجد میں جا کر ہم حوض کنارے بیٹھ کر وضو کم کرتے اور حوض میں تیرتی سرخ مچھلیوں کو زیادہ دیکھا کرتے۔ انگریزی کا ایک لفظ وہ بہت بولا کرتا تھا، یہ لفظ تھا "never mind" ماشٹر نثار اردو میں اس کو 'نیور مین' بولا کرتا تھا۔ ایک بار بسے گوجر کی دکان میں ماشٹر نثار میرے ساتھ بیٹھا بسے گوجر کو ہیر سنا رہا تھا کہ گلی میں سے جلی مراثی کا گزر ہوا۔ وہ دکان کے سامنے رک گیا۔ کچھ دیر گردن جھکا کر ہیر سنتا رہا پھر سر اٹھا کر بولا۔ ''پتر' راگ داری کا حلیہ خراب نہ کرو' تم راگ داری کے لیے پیدا نہیں ہوئے' بس لوگوں کے سر مونڈا کرو۔''

جلی مراثی اتنا کہہ کر چل دیا۔ بسے گوجر کو اور مجھے اس کی یہ بات بڑی بری لگی۔ بسا گوجر کھونچا اٹھا کر جلی مراثی کے پیچھے بھاگنے لگا تو ماشٹر نثار نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ ''پہلوان' نیور مین۔''

ماشٹر نثار کو تھیٹر میں پارٹ کرنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ اپنے اس شوق کو پورا کرنے کے لیے اس نے صندوقچی میں نقلی مونچھیں' نقلی داڑھی' سرخی پاؤڈر' گتے کا شاہی تاج جس پر تارے ٹکے تھے اور مور کا پنکھ جڑا تھا اور نقلی موتیوں کے ہار وغیرہ جمع کر رکھے تھے۔ ہم دونوں بھی کبھی اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں بچوں کو جمع کر کے ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کا ناٹک کھیلا کرتے تھے۔ لہنگے اور دوپٹے ہم اپنے اپنے گھروں سے چوری چھپے صندوق کھول کر نکال لایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ شہر میں سنتو کھ سر کی گراؤنڈ میں ایک تھیٹریکل کمپنی اتری جس نے شکنتلا کا کھیل کھیلا۔ میں اور ماشٹر نثار بڑے شوق سے یہ کھیل دیکھنے گئے۔ ٹکٹ کے لیے ہمارے پاس پیسے نہیں تھے چنانچہ ہم لسوڑے کے ایک درخت پر چڑھ کر اندر پنڈال میں کود گئے اور ایک طرف قناتوں کے پاس دبک کر بیٹھے کھیل دیکھتے رہے۔ اگلے روز ہم نے وہی کھیل اپنی ڈیوڑھی میں کھیلا۔ صبح ہی سے ہم نے کاپیوں میں سے کاغذ پھاڑ کر اور قلم' دوات سے جلی حروف میں شکنتلا کے اشتہار لکھ کر مکانوں کی دیواروں پر چسپاں کر دیئے تھے۔ شام کو ہم نے ڈیوڑھی میں تخت پوش بچھا کر اسٹیج بنایا' بانس جوڑ کر آگے پردہ گرا دیا۔ محلے کے بچے وہاں جمع ہو گئے تھے۔ ماشٹر نثار راجہ دھشنت بنا اور میں اس کا وزیر۔ ہم نے سیڑھیوں میں بیٹھ کر چہروں پر نقلی مونچھیں لگائیں' خوب سرخی پاؤڈر تھوپا' ماشٹر نثار نے سر پر مور کے پنکھ والا گتے کا تاج رکھ لیا۔ میں نے اپنی بڑی بہن کا دوپٹہ سر پر پگڑی کی طرح باندھ لیا۔ ہمارے ایک دوست نے اسٹیج پر آ کر پردہ ہٹا دیا اور شکنتلا کا کھیل شروع ہو گیا۔ ماشٹر نثار دھشنت کے روپ

میں تیر کمان لیے جنگل میں کھڑا تھا اور میں وزیر بنا ہاتھ باندھے' سر جھکائے ساتھ کھڑا اسے کہہ رہا تھا۔ ''مہاراج' ہرن اسی جنگل میں گیا ہے۔''

ماشٹر نثار گرج کر بولا۔ ''مگر کہاں ہے ہرن؟ کہاں ہے ہرن؟ اگر ہرن نہ ملا تو ہم تیری گردن کاٹ کر رکھ دیں گے۔''

میں نے ایک طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا۔ ''وہ رہا ہرن مہاراج......''

جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا' وہ ڈیوڑھی کا دروازہ تھا جس کا نصف پٹ کھلا تھا۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ ماشٹر نثار نے فوراً کمان کے ساتھ تیر جوڑ کر چلا دیا۔ تیر بچوں کے سروں کے اوپر سے سن سے ہو کر گزرا اور ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر سیدھا بسے گوجر کو لگا جو شراب کے نشے میں دھت سامنے والے مکان کی دیوار کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ چیخ مار کر گر پڑا۔

میں نے یہ منظر دیکھ لیا تھا چنانچہ میں نے ماشٹر نثار کو کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ماشٹر' تیر بسے گوجر کے لگ گیا ہے' بھاگ چلو......''

ماشٹر نثار نے گردن اکڑائی اور مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ ''نیور مین......''

محلے میں ایک دم شور برپا ہو گیا' ڈیوڑھی میں بھگدڑ مچ گئی اور ہم دونوں بھاگ کر حاجی اللہ دتا ترکھان کے گھر میں جا کر چھپ گئے جو اس وقت تنور کی روٹی کے ساتھ خربوزے مع بیج اور چھلکوں کے کھا رہا تھا۔ اس نے چونک کر کہا۔ ''اوئے' کی خرود مچا کے آئے او' اوئے......''

ماشٹر نثار نے کہا۔ ''استاو جی' ہمیں بسا گوجر مارتا ہے۔''

''اوئے' کیوں مارتا ہے بسا؟''

''کہتا ہے' مجھے کمپنی باغ کی ٹھنڈی کھوئی سے پانی لا دو' بھلا استاد جی شام کو ہم وہاں کیسے جا سکتے ہیں؟''

''بسا گوجر سودائی ہو گیا ہے' تم آرام سے بیٹھ جاؤ یہاں۔''

عید میلادالنبیؐ کے جلوس میں ہم نے ایک ایک سبز جھنڈا تھام رکھا ہوتا اور ہماری یہی کوشش ہوتی کہ جلوس ہمارے محلے سے ہو کر ضرور گزرے اور پھر جلوس جب ہمارے محلے میں سے ہو کر گزرتا تو ہم بڑے فخر کے ساتھ کن انکھیوں سے اپنی گلی کے بچوں کو دیکھتے جو دکانوں کے پھٹوں پر کھڑے رشک سے ہمیں تک رہے ہوتے۔ کڑہ مہان سنگھ سے سکتری باغ تک دھوپ میں جلوس کے ساتھ چلتے چلتے ہمارے چہرے سرخ ہو کر پسینے میں شرابور ہو جاتے لیکن ہمیں کبھی تھکان یا گرمی کا احساس نہ ہوتا تھا۔

کمپنی باغ میں ٹھنڈی کھوئی کے سامنے والی گراؤنڈ میں ایک بڑا گنجان درخت تھا جس کی پھیلی ہوئی شاخیں زمین کو چھوتی تھیں۔ میں اور ماشٹر نثار گلی کے لڑکوں کے ساتھ یہاں جٹ براہمن کھیلا کرتے تھے۔ میں ٹارزن کی طرح ایک ٹہنی کو پکڑ کر چھلانگ لگاتا اور جھولتا ہوا زناٹے کے ساتھ دوسری ٹہنی پر جا پہنچتا۔ ماشٹر نثار ٹہنیوں کے بیچ کسی دوشاخے پر بڑے ٹھاٹ سے بیٹھ جاتا اور پھر راجہ اندر کی طرح گردن اکڑا کر ایک دم پکار اٹھتا۔ ''یہ آج میرا تخت کیوں ہل رہا ہے؟'' پھر خود ہی مصاحب بن کر ادب سے گردن جھکا کر کہتا۔ ''جناب' آپ کا شاہی تخت جنوں کی گردنوں پر رکھا ہے جو آپ کو سبز پری کے محل کی طرف لے جا رہے ہیں۔''

ماشٹر نثار راجہ اندر کے روپ میں مسکراتا اور پھر ایک ہاتھ اٹھا کر گانا شروع کر دیتا۔

ہاوم' راجہ ہوں میں قوم کا
اندر میرا نام' ہاوم

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سبز پری پر عاشق ہوں
عشق ہے میرا کام' ہا دم

برسات کے دنوں میں ہم دو مونہی نہر کے کنارے کنارے لمبی سیریں کرتے۔ لبالب نہر میں تیرتے ہوئے سبز' زرد' سرخ آموں اور امرودوں کو چھلانگ لگا کر پکڑتے' نہر کی پلیا پر کھڑے ہو کر مٹھیاں چوم کر پانی میں کود جاتے اور مردہ تاری لگایا کرتے۔ کبھی غوطہ لگا کر نہر کی تہہ سے مٹھی بھر گیلی ریت اٹھا کر لاتے اور اس سے اپنے دانت مانجھتے کیونکہ ہم نے بڑوں کو یہی کرتے دیکھا تھا۔

جنوری' فروری کی سردی میں جب باغ اجڑ جاتے تو ہم امرود کے باغوں میں نکل جاتے اور درختوں پر لگے اکا دکا امرود توڑ توڑ کر آدھا کھاتے اور آدھا پھینک دیتے۔ بارش شروع ہو جاتی تو ہم ٹاہلیوں کے گرتے پتوں میں بھیگتے گھر واپس آجاتے۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم اسی کمپنی باغ کے درختوں پر کھیلتے پلیا پر سے نہروں میں چھلانگیں لگاتے اور ڈیوڑھی میں سرخی پاؤڈر تھوپے 'شکنتلا' کھیلتے رہیں گے اور وقت کبھی نہیں گزرے گا لیکن وقت گزرتا چلا گیا اور پھر وقت جب ایک اہم موڑ پر سے گزرا تو ہم سے امرتسر کمپنی باغ' ہال بازار' سکتری باغ' بجلی والی نہر اور مسجد خیر الدین ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔ جب ہم کمپنی باغ کی نہروں میں چھلانگیں لگاتے پھر رہے تھے اور ماشٹر نثار آنکھیں بند کیے ڈھولک بجاتے ہوئے 'لیلیٰ مجنوں' کے گانے گا رہا تھا' اس وقت برصغیر پاک و ہند کے مسلمان لیڈر مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکتِ پاکستان کے لیے جدوجہد کر رہے تھے جہاں مسلمان عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکیں۔ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا چنانچہ ایک روز جو ہم نہر سے ڈبکی لگا کر نکلے تو امرتسر میں چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں' آگ لگی تھی' بم پھٹ رہے تھے' دھواں ہی دھواں تھا' لاشیں تھیں' آگ ہی آگ تھی' لبالب بھری ہوئی ٹھنڈے پانیوں کی نہریں سوکھ گئی تھیں' باغ اجڑ گئے تھے' ٹھنڈی کھوئی کے پانی میں انسانوں کا گرم خون آن ملا تھا' مسجدوں کے حوض خشک ہو گئے تھے' ہم نے امرتسر چھوڑ دیا' امرتسر نے ہمیں چھوڑ دیا۔ خستہ حال' بیمار' نیم جاں مہاجروں کے لٹے پٹے قافلے لاہور کی حدوں میں داخل ہو رہے تھے۔ ہر طرف ایک افراتفری' ہیجان اور پریشانی کی فضا طاری تھی۔ بہن بھائی سے' ماں بیٹے سے' بیٹا باپ سے اور خاوند بیوی سے بچھڑ گیا تھا۔ لاہور اسٹیشن پر کٹی ہوئی گاڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ وقت گزرتا چلا گیا' میں ماشٹر نثار سے نہ مل سکا۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی گاؤں کی طرف نکل گئے ہیں۔

پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے دس گیارہ برس گزر گئے۔ ایک روز میں انار کلی بازار سے گزر رہا تھا کہ میں نے اپنے بانو بازار کے کونے پر ایک دکان کے باہر ماشٹر نثار کو سڑک پر بیٹھے ایک الماری کی مرمت کرتے دیکھا۔ اس کے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرہ سوکھ کر سیاہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ کپڑے میلے' بوسیدہ اور پیوند لگے تھے۔ وہ برمے سے تختے میں سوراخ ڈال رہا تھا اور اس کے سفید بالوں میں لکڑی کا بورا پڑا تھا۔ میں چپکے سے اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی زرد ویران آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور پھر وہ میرے گلے لگ گیا اور ہلکے ہلکے سسکیاں بھرنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''ماشٹر نثار' یہ کیا حال بنا لیا تم نے؟''

ماشٹر نثار میلی قمیص سے آنکھیں پونچھ کر دھیرے سے مسکرایا اور خشک آواز میں بولا۔ ''ہاں' حمید! نیور مین......''

☆☆......☆☆

سخن زار

تقدیر بنالوں اُسے

وہ شخص جو دل سے نکلتا ہی نہیں
ظالم ایسا پتھر ہے جو پگھلتا ہی نہیں
کیے ہزار جتن' بہت منایا اُسے
دعاؤں میں نمازوں میں مانگا اُسے
یہ دل ناداں ہے جو سنبھلتا ہی نہیں
کتنا معصوم کتنا نادان ہے پگلا
لاکھ بہلاؤ مگر...... بہلتا ہی نہیں
سنہرے خوابوں کی نگر میں رہتا ہے وہ
کاش اک بار مل جائے وہ پردہ نشیں
آنکھوں میں چھپا لوں
دل میں بسا لوں
تقدیر بنالوں اُسے

شاعرہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

غزل

درد سینے میں قسم کرو
ابھی جگہ ہے تم اور ستم کرو
کہا ہے کس نے یہ تم سے
میری بربادی کا ماتم کرو
بڑھائے تھے تمہی نے فاصلے
تمہی یہ فاصلے کم کرو
جلے ہیں اشکوں کے دیے
لو چراغوں کی مدھم کرو
مجھے پکارنے سے پہلے تم ذرا
بیتے دنوں کا ماتم کرو
شب غم منتظر ہے آؤ
دل توڑنے کی رسم کرو
کہا تھا جو ساتھ نبھائے گا وعدہ
اک بار پھر میرے صنم کرو

شاعرہ: فصیحہ آصف خان۔ ملتان

غزل

اس کا ہونا میرے واسطے اک خواب سا تھا
میری زندگی کے سوال میں وہ جواب سا تھا
اس کے مختصر احساس میں، میں جان پائی
وہ تو کتاب فقط بند کتاب سا تھا
دل بے وفا اسے یوں بھول گیا ہے
جیسے وہ میرے آخری نصاب سا تھا
خاموشیوں کے صحرا میں میرا محرم
میرے لیے وہ مسکراہٹوں کے سیلاب سا تھا
اس کی حقیقت بڑی سادہ ہے نگین
جو لٹ گیا ہو راہ میں ایسے اسباب سا تھا

نگین افضل وڑائچ۔ شادیوال۔ گجرات

دل

دل اس خیال سے بہل جاتا ہے
کہ......کوئی ایک دن......!
ایسا بھی آنے والا ہے......کہ
جب ملے گی اپنے حوالے سے
اک سچی خوشی
ملیں گی یادیں ہزاروں
بنیں گی زادِ سفر
زیست کٹ جائے گی اس تصور میں
کہ......کچھ تو 'اپنے' حوالے سے
اچھا ہے
کہ......

زمر نعیم۔ لاہور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ذرا ٹھہرو

ذرا ٹھہرو
ابھی جو قافلہ اترا ہے خوشبو کا
میں لفظوں کے لبادے میں
اسے محفوظ کرلوں کہ
کہیں تند ہی باد خیال
کی انگلیاں تھامے
نکل جائے نہ ہاتھوں سے
کہ اکثر یوں ہوا کہ جب تمہیں
کچھ لکھنا چاہا تو
کبھی مصروفیت اس راہ کی دیوار بنتی ہے
کبھی تنگی وقت بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیتا ہے
کبھی چادر میں خود ہی مصلحت کی اوڑھ لیتی ہوں
کبھی اندر انا پنجے میرے یوں گاڑ دیتی ہے
کہ ہفتوں اس کشش و پیچ میں ہی اپنے
بیت جاتے ہیں کہوں کچھ یا لکھوں کچھ
یا یہ کہ کورا چھوڑ دوں کاغذ
مگر کچھ مستعار لمحے لیے ہیں وقت سے میں نے
ان کو خواب آور گولیاں دے کر سلایا ہے
چھپا آئی ہوں چادر مصلحت کی سات پردوں میں
کہ میرے ہاتھ یہ پل آج بڑی مشکل سے آیا ہے
نہیں اب درمیاں کچھ بھی میرے احساس اور مجھ میں
فقط اتنا سا کہنا ہے کہ درگاہ محبت پر
میرے دل میں دعا کرنے بنا جھجکے بلا ناغہ
تمہاری یاد آتی ہے

شاعرہ: خولہ عرفان۔ کراچی

دل مسمار کا روگ

زمین قلب کو مسمار کرنے والے بتا
کس قیامت کے تھے آثار

تیرے پاؤں تلے
کسی ٹوٹی ہوئی دیوار کے ملبے سے کوئی
تیری تصویر بھی ٹکڑوں میں ملی تجھ کو کہیں......؟
یا تیری یاد کا کوئی ڈھیر ملا ہو تجھ کو
جس میں چنگاری محبت کی
دہکتی تھی ابھی......
تیری یادوں کے خزانے
تیری بے باک ہنسی
ان میں کچھ جان تھی......؟
یا وہ لہو پوش ہوئے
تیرا انداز تکلم وہ تیری عشوہ گری
وہ بھی رکھے تھے وہاں
کیا وہ بھی زمیں بوس ہوئے؟؟
ڈھاتے ہوئے اس دل کو
سنگدل ذرا سوچا ہوتا
کون خود کو کڑی دھوپ میں پھراتا ہے
اپنے ہاتھوں سے مکاں اپنا......
کون گراتا ہے!!!

فرح اسلم قریشی۔ کراچی

غزل

لکھا ہے نام تیرا میرے ہاتھ کی لکیروں میں
تیرا چہرہ ہے میرے خواب کی تعبیروں میں
برسوں مانگی ہے فقط ایک ہی دعا میں نے
خدا بس تجھ کو ہی لکھے سدا میری تقدیروں میں
رنگ بکھیروں میں جب بھی کسی کاغذ پر
عکس پڑتا ہے تیرا ہی میری تصویروں میں
سنگ رہوں تیرے عمر بھی کسی سائے کی طرح
تو رہے چاہے سمندر میں یا جزیروں میں

عائشہ شفقت

دوشیزہ گلستان

ترتیب: ارم حمید

وہ جو چاہے تو کیا نہیں ممکن
وہ نہ چاہے تو کیا کرے کوئی

سبحان اللہ

نبی کریمؐ نے فرمایا:
جب کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے فرماتا ہے جا اور اپنے باپ کا بازو بن جا مگر جب بیٹی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس بچی سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ مجھے قسم ہے اپنی ذات کی آج سے میں خود تیرے باپ کا بازو ہوں۔

راز عدن۔ بحرین

سبق

زندگی نے بہت کچھ سکھایا، کتابوں نے بھی رہنمائی کی لیکن انسانی رویوں نے جو سبق دیا تو وہ زندگی کے کسی ورق میں تھا نہ ہی کتاب کے کسی صفحے پر تحریر تھا۔

جدید نظم

سوہنی گھاٹ بدل سکتی تھی
اور کہانی چل سکتی تھی......
رانجھا غنڈے لے آتا تو
ہیر کی شادی ٹل سکتی تھی
سسی کے بھی اونٹ جو ہوتے
تھل میں کیسے جل سکتی تھی
مرزا نے کب سوچا تھا کہ
صاحباں راز اگل سکتی تھی
لیلیٰ کالی...... پڑھ لکھ جاتی
فیئر اینڈ لولی مل سکتی تھی
جو پتھر...... فرہاد نے توڑے
جی ٹی روڈ نکل سکتی تھی
انٹرنیٹ...... پہلے جو ہوتا
ہجر کی رات بھی ڈھل سکتی تھی

افشاں۔ UK

آدمی کو مارنا

کون کہتا ہے دشوار ہے آدمی کو مارنا
لہجہ بدل
تیور بدل
نظریں بدل

اخلاق

میں جیسے جیسے لوگوں سے ملتا گیا،
میرا ایمان پکا ہوتا گیا کہ اخلاق......
بھی رزق ہے، جو قسمت والوں کو ملتا ہے

مضبوط لوگ

کچھ لوگ جب روتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

وہ کمزور ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ مضبوط رہتے رہتے تھک جاتے ہیں۔

وہ جان لیتا ھے...

جب کبھی یہ الفاظ ذہن میں ابھریں رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں:

''وہ جان لیتا ہے نیتیں بھی۔''

غزالہ رشید۔کراچی

سادگی

ایک مرتبہ گاؤں میں سیلاب آ گیا۔ ڈوبتے ہوئے لوگوں کو بچانے کے لیے ہیلی کاپٹر استعمال کیا گیا ...150 کی آبادی والے گاؤں سے گن کر لوگوں کو نکالا گیا۔ پھر ہیلی کاپٹر والے چوہدری کے پاس پہنچ گئے اور کہا آپ کے گاؤں میں 150 لوگ تھے مگر اب تک 500 لوگوں کو نکالا جاچکا ہے یہ اضافی لوگ کہاں سے آئے؟

چوہدری بولا اصل میں گاؤں والوں نے ہیلی کاپٹر پہلی بار دیکھا ہے اس لیے آپ ایک طرف سے نکالتے ہو۔ یہ دوسری طرف سے پھر آجاتے ہیں، میں خود تیسری بار آیا ہوں۔

سلیم اللہ۔جھنگ

شک

بیوی دیر سے گھر آئی اور چپ چاپ بیڈ روم کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ کمبل میں دو کے بجائے چار پاؤں نظر آرہے تھے۔ اس نے کرکٹ کا بلا اٹھا کر مارنا شروع کردیا، جب تھک گئی تو پانی پینے کچن میں گئی، دیکھا شوہر تو وہاں بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔

شوہر: تمہارے امی ابو آئے تھے میں نے انہیں بیڈ روم میں سلادیا ہے، جاؤ جا کر مل لو......

عمر اور زندگی کا فرق

جو اپنوں کے بغیر گزرے وہ ''عمر''

اور جو اپنوں کے ساتھ گزرے وہ ''زندگی''

آگاھی

جب انسان خود سے مخاطب ہونے لگتا ہے تو وہ دوسروں سے خاموشی اختیار کرلیتا ہے۔

کشور علی۔میاں چنوں

نیکی

تم کسی کے ساتھ بھلائی کرو اور تمہیں اس کا بدلہ برائی کی صورت میں ملے تو سمجھ لو کہ تمہاری نیکی قبول ہوگئی۔

ایمان

جو لوگ خوشی سے اللہ کے حوالے سب کچھ کردیتے ہیں وہ ہر حال میں مگن اور خوش رہتے ہیں کیونکہ فکر وہاں ختم ہوجاتی ہے ...... جہاں ایمان شروع ہوتا ہے۔

سلمیٰ۔بحرین

حبیب جالب کے قلم سے

اس دیس میں لگتا ہے عدالت نہیں ہوتی
جس دیس میں انساں کی حفاظت نہیں ہوتی
مخلوق خدا جب کسی مشکل میں ہو پھنسی
سجدے میں پڑے رہنا عبادت نہیں ہوتی
ہر شخص سر پہ کفن باندھ کے نکلے
حق کے لیے لڑنا تو بغاوت نہیں ہوتی

محمد علی۔کراچی

تڑپ کے معنی

جدید ڈکشنری میں

میں نے امی جان سے پوچھا
امی جان تڑپ کسے کہتے ہیں؟
امی جان اٹھیں اور وائی فائی کو بند کردیا۔
اور بولیں بیٹا اب محسوس کر!!!

ھائے یہ بیویاں

کراچی میں پچھلے دنوں شدید بارشیں ہوئیں جن

کے باعث نظام زندگی مفلوج ہوگیا...... ایسے میں ایک میسج موصول ہوا...... بارش کی وجہ سے میں گھر پر بیوی کے ساتھ قید ہوں پلیز میری مدد کی جائے۔

عقیلہ حق۔کراچی

سنھری باتیں

کبھی سوچا ہے؟؟

کندھوں پر اٹھانے والے ہمیشہ مٹی میں ملا دیتے ہیں۔

مطلبی

مجھے کیا حق ہے کہ میں کسی کو مطلبی کہوں۔

میں تو خود اپنے رب کو مطلب کے وقت یاد کرتا ہوں۔

نمبر ون

دنیا کا نمبرون باکسر محمد علی کہتا ہے:

یہ زندگی اصل نہیں...... میں نے دنیا کو زیر کیا۔ فاتح قرار پایا مگر سکون نہیں ملا۔ میرے رب نے مجھے بیماری دی تاکہ میں جان سکوں کہ میں نہیں بلکہ صرف وہ نمبرون ہے۔

آسیہ حق۔لاہور

تلخ حقیقت

گاؤں میں نیم کے درخت کم ہو رہے ہیں گھروں میں کرواہٹ بڑھتی جارہی ہے۔

زبان میں مٹھاس کم ہو رہی ہے جسم میں شوگر بڑھتی جارہی ہے۔

شادی ہال میں عورتیں نیم عریاں ہوتی ہیں اور کرسیاں، بہترین غلافوں میں۔

کہتے ہیں سارا قصور مولویوں کا ہے اور ہر خوشی اور غم میں مولوی نہ ہو تو جان پر بن جاتی ہے۔ اپنی غلطی پر دنیا کے سب سے بہترین وکیل اور دوسروں کی غلطی پر سب سے بڑے جج۔

مصیبت میں والدین سے دعا کرواتے ہیں اور جب ان کی بات نہ سنی ہو تو کہتے ہیں کہ آپ کو کیا پتہ۔

جب کتابیں سڑک کے کنارے رکھ کر بکیں گی اور جوتے کانچ کے شوروم میں تب سمجھ لینا کہ لوگوں کو علم کی نہیں جوتوں کی ضرورت ہے۔

راحیلہ۔لاہور

پاکستان میں انکار کے طریقے

دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
تھوڑی دیر میں بتاتا ہوں
پوچھنا پڑے گا
پکا نہیں ہے یار!

اشعار

بچھڑنا ہے تو خوشی سے بچھڑو سوال کیسے جواب چھوڑو
کسے ملی ہیں جہاں میں خوشیاں؟ ملے ہیں کس کو عذاب چھوڑو
نئے سفر پہ چل پڑے ہو مجھے خبر ہے کہ خوش بڑے ہو
یہ کون اجڑا تمہارے پیچھے؟ یہ کس کے ٹوٹے ہیں خواب چھوڑو
محبتوں کے تمام وعدے نبھائے کس نے بھلائے کس نے
تمہیں پشیمانی ہوگی جاناں جو میری مانو حساب چھوڑو

رمشہ خٹک۔اسلام آباد

رب کو راضی کرو

مصر کے مشہور عالم اور ادیب شیخ علی طنطاوی'' ایک جگہ بڑی قیمتی بات کہتے ہیں فرماتے ہیں:

'' جو لوگ ہمیں نہیں جانتے ان کی نظر میں ہم عام ہیں اور جو ہم سے حسد رکھتے ہیں ہم ان کی نظر میں مغرور ہیں۔

جو ہمیں سمجھتے ہیں ان کی نظر میں ہم اچھے ہیں۔

جو ہم سے محبت رکھتے ہیں ان کی نظر میں ہم خاص ہیں۔ جو ہم سے دشمنی رکھتے ہیں ان کی نظر میں ہم برے ہیں۔

ہر شخص کا اپنا ایک الگ نظریہ اور دیکھنے کا طریقہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

ہے لہٰذا دوسروں کی نظروں میں اچھا بننے کی سعی میں اپنے آپ کو تھکانا حماقت ہے۔

اللہ آپ سے راضی ہو جائے بس یہی کافی ہے سب لوگوں کو راضی کرنا ممکن نہیں۔رب کو منانا سب سے آسان بھی ہے اور اس کے بنا گزارہ بھی نہیں۔

ناوہ۔ناروے

عقل

عقل کی کروڑوں دلیلیں اللہ سے ایک گناہ بھی معاف نہیں کرواسکتیں......لیکن ندامت کا ایک آنسو زندگی بھر کے گناہ معاف کروا سکتا ہے۔

لوٹ آئو

لوٹ آؤ اللہ کی طرف اس سے پہلے کہ
لوٹ جاؤ اللہ کی طرف

فیض علی۔سکھر

آڑو کے چند فوائد

آڑو معدے کو طاقت دیتا ہے
آڑو پیاس کو ختم کرتا ہے
ذیابطیس میں آرام دیتا ہے
بھوک لگتا ہے
جگر کو قوت بخشتا ہے
بخار کو ختم کرتا ہے

نیا دور

میرے گھر والوں کے ساتھ تعلقات ٹھیک ہونے ہی والے تھے کہ میرا انٹرنیٹ ٹھیک ہو گیا......

عشق

عشق انسان کو قلندر بو علی کرتا ہے
عشق پاگل نہیں پاگل کو ولی کرتا ہے

زاہدہ۔سرگودھا

فیس بک کا نشہ

کلاس روم میں پڑھائی کے دوران پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ایک لڑکے نے اپنے موبائیل پر اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولا......جیسے اس کا اسٹیٹس آن لائن ہوا پروفیسر صاحب نے جو لیپ ٹاپ پر آن لائن تھے کمنٹ کیا نالائق انسان کلاس سے نکل جاؤ آفس میں بیٹھے پرنسپل نے پروفیسر کے کمنٹ کو لائک کر کے تائید کر دی۔

دوست نے یہ ماجرا دیکھ کر کمنٹ کیا اوئے ٹینشن نہ لے کیفے میں آجا......سموسے کھاتے ہیں......

ماں نے گھر سے کمنٹ کیا نکھے انسان کلاس نہیں لینی تو سبزی لے کر گھر آجا۔

باپ نے دفتر سے کمنٹ کیا دیکھ لی اپنے لاڈلے کی حرکت تمہارے پیار نے اسے بگاڑا ہے۔

گرل فرینڈ نے کمنٹ کیا دھوکے باز تم نے تو کہا تھا کہ تم کالج نہیں گئے۔ہسپتال میں ہو اور دادی کی حالت بہت خراب ہے آخری اسٹیج پر ہیں اس لیے ملنے نہیں آسکتا......اس وقت دادی نے بھی کمنٹ کیا او! بیڑا غرق ہو تیرا بے غیرتا......کیوں دادی کو مارنے پر تلے ہو۔

زین شمسی۔کراچی

پہلا گناہ

اس کائنات کا سب سے پہلا گناہ کیا تھا؟

سب سے پہلا گناہگار کون تھا......؟

اس سوال کے جواب میں کئی لوگ کہیں گے قابیل کا اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرنا سب سے پہلا گناہ ہے لیکن نہیں یہ اولین گناہ نہیں......بلکہ یہ دنیا کا ،کرہ ارض کا پہلا گناہ کہا جا سکتا ہے

کائنات کا سب سے پہلے گناہ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ”میں اس سے بہتر ہوں۔ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے جبکہ اس کو مٹی سے۔کائنات کا سب سے پہلا گناہ غرور و تکبر ہے جس نے ایک برگزیدہ فرشتے عزازیل کو ابلیس بنا دیا جسے ہم عرف عام میں شیطان کہتے ہیں۔

غرور انسان کی سب نیکیاں برباد کر دیتا ہے بلکہ فرمانِ نبویؐ ہے جس کے دل میں رتی برابر بھی غرور ہوا وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔

مصباح حسن۔اسلام آباد

مان

کوشش کریں کہ سب ٹوٹ جائے وہ مان نہ ٹوٹے جو کسی نے آپ پر کیا ہے اور خود سے زیادہ کیا ہے۔

پروین شاکر کی نظم سے اشعار

ملتے ہوئے دلوں کے بیچ اور تھا فاصلہ کوئی
اس نے مگر بچھڑتے وقت اور سوال کر دیا
بلا کی دھوپ سے آئی ہوں میرا حال تو دیکھو
بس اب ایسا کرو کہ تم سایۂ دیوار ہو جاؤ

منزہ سہام۔کراچی

فاتحہ

اشفاق احمد فرماتے ہیں فاتحہ لوگوں کے مرنے پر نہیں بلکہ احساس کے مرنے پر پڑھنی چاہیے کیونکہ لوگ مر جائیں تو صبر آ جاتا ہے مگر احساس مر جائے تو معاشرہ مر جاتا ہے۔

(حنا۔لاہور)

دیوانِ غالب سے...

حیرت ہوئی غالب تمہیں اس حال میں دیکھ کر
ایسا بھی کیا ہوا کہ خدا یاد آ گیا

اے عالم وقت کوئی ایسا بھی فتویٰ دے
جو وطن سے وفا نہ کرے کافر ٹھہرے

☆

اگر اللہ نے وہ لے لیا جس کے کھونے کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے تو یقیناً وہ کچھ ایسا دے گا جسے پانے کا تم نے سوچا بھی نہ ہو گا۔

اچھی باتیں

غیبت سننے والا غیبت کرنے والے کے برابر گنہگار ہے۔دوسروں کی غیر موجودگی میں ان کے متعلق اچھے الفاظ استعمال کرو تمہاری غیر موجودگی میں وہ تمہارا تذکرہ اچھے لفظوں میں کرے گا۔

اجلے کپڑے پہننے سے رنج و غم دور ہو جاتے ہیں اور نماز قبول ہوتی ہے

جو شخص یہ چاہے کہ اس کی عمر دراز ہو تو اسے چاہیے کہ ناشتہ سویرے کرے کے اچھا پہنے۔

جسے زیادہ غصہ آتا ہو اس کے دوست کم ہوں گے۔

جسے قرض لینے اور خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں وہ سب سے بڑا مالدار ہے۔

پڑھنے سے انسان بیدار ہوتا ہے بولنے سے گفتگو کی تمیز آتی ہے لکھنے سے ذہین ہو کر معاشرے کے لیے بہتر انسان بنتا ہے۔

غمگین کے سامنے ہنسنا بے ادبی ہے کسی کو اعلانیہ نصیحت کرنا برائی کا پیش خیمہ ہے۔

ہر بلا مصیبت کے پس منظر میں رحمت و نصیحت ہے۔

جو لوگ تمہارے دوست بننا چاہتے ہیں ان کے دوست بنو۔

اپنی تعریف زیادہ کرنا ہلاکت کا باعث ہے۔

نصیحت وہی کارگر ہوتی ہے جو عمل کی زبان میں ہو۔

اگر تو اپنی امانت کی حفاظت ضروری نہ سمجھے گا تو تیری آنکھ میں غفلت کا پانی اتر آئے گا اور حق تعالیٰ اپنی رحمت کا دروازہ تجھ پر بند کر دے گا۔

اے عمل کرنے والے اخلاص پیدا کر ورنہ مشقت فضول ہے۔

برے کاموں کا اعتراف گویا اچھے کاموں کی ابتدا ہے۔

موت کو یاد رکھنا نفس کی تمام بیماریوں کی دوا ہے

(مسز نگہت غفار، کراچی)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

''چٹ پٹی خبریں''

ڈی خان

وہ خبریں جو آپ کا موڈ بدل ڈالیں......

آٹھواں عجوبہ

کیا اب لوگ جانتے ہیں کہ پاکستان اور چین کو ملانے والی قراقرم ہائی وے کو دنیا کا

آٹھواں عجوبہ قرار دے دیا گیا ہے۔ چین سے شائع ہونے والے جریدے کے مطابق چین اور پاکستان کے درمیان سی پیک روڈ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ یہ شاہراہ 13 سو کلومیٹر طویل ہے جو حسن ابدال سے شروع ہوتی ہے اور مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی پہاڑوں اور دریاؤں کے درمیان سے گزرتی ہوئی چین کے شہر کاشغر پہنچ جاتی ہے۔ یہ ایک معروف سیاحتی مقام کی بھی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا شمار دنیا کی بلند ترین گزرگاہوں میں ہوتا ہے۔ ویسے چینی اخبار ہی اس شاہراہ کو آٹھواں عجوبہ سمجھ سکتے ہیں ورنہ ساری دنیا تو پاک چین دوستی کو آٹھواں عجوبہ سمجھتی ہے۔

Never Under Estimate The Power Of Woman

پچھلے دنوں عائشہ گلالئی کے عمران خان پر لگائے جانے والے الزامات نے سیاست میں تہلکا مچادیا۔ عائشہ کا کہنا تھا کہ خان صاحب نے انہیں ایسے میسجز کیے جو انتہائی غیر اخلاقی ہیں...... وہ خاتون ہونے کے باوجود میڈیا کے سامنے اس ایشو کو اجاگر کررہی ہیں یہ انہی کی ہمت ہے...... حالانکہ میسجز بقول اُن کے کئی سال پہلے بھیجے گئے تھے...... بھئی ہم تو اُن لوگوں کو مشورہ دیں گے جو عورتوں کو کمزور گردانتے ہیں کہ Never Under Estimate The Power Of Woman کیونکہ خواتین اگر لڑنے پر آجائیں تو اُن سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ عمران خان صاحب عائشہ کو پارٹی سے نکالنے کا حکم دے
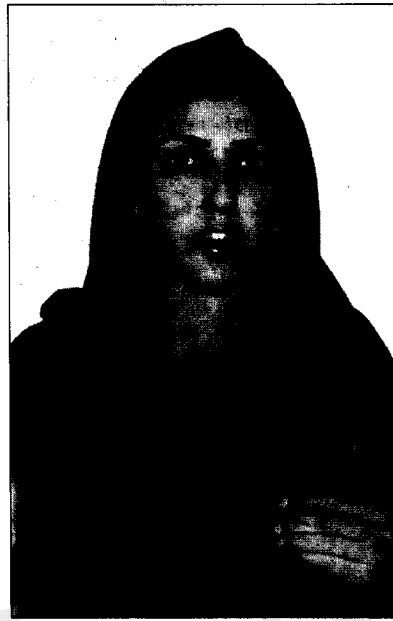
چکے ہیں مگر لگتا ہے کہ عائشہ خان صاحب کو پارٹی بدر کردیں گی۔

زمانے کو پتہ ہے مگر پھر بھی خفیہ

ماہرہ خان کو کون ہوگا جو پسند نہیں کرتا ہوگا بات اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں کی ہو یا خوبصورتی کی کوئی اُن کا ثانی نہیں رکھتا۔ پھر ہمارے ملک میں تو کوئی کتنا ہی مشہور نہ ہو جب تک پڑوسی ملک میں کام نہ کرلے آج کل کچھ لوگوں کے مطابق کامیاب مانا ہی نہیں جاتا اور پھر ماہرہ نے تو شاہ رخ کے مقابل فلم رئیس میں کام کیا ہے۔ شاہ رخ خان کے ساتھ کام کرنا اُن کی بچپن کی خواہش تھی ایسا اُن کا کہنا ہے۔ اب سنا ہے کہ ماہرہ اپنے شوہر سے علیحدگی کے بعد بھارت سے ہی اپنے نئے شوہر کا انتخاب کرنے جارہی ہیں۔ ماہرہ کی پہلی شادی 2007ء میں علی عسکری سے ہوئی تھی جن سے اُن کا ایک بیٹا بھی ہے۔ دونوں کی علیحدگی 2015ء میں ہوگئی تھی۔ ذرائع بتاتے ہیں

کہ نئے شوہر کا انتخاب ماہرہ کربھی چکی ہیں مگر یہ بات انتہائی خفیہ رکھی جارہی ہے۔

ناک آؤٹ یا گھر سے آؤٹ

پاکستانی نژاد برطانوی باکسر عامر خان اہلیہ کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

معافی مانگنے پر بھی نہ پگھلے وہ کہتے ہیں کہ ماضی میں بھی میری فیملی پر فریال نے انتہائی بے ہودہ الزامات لگائے تھے گو کہ اب انہوں نے سارا معاملہ کلیئر کردیا ہے اور اپنے کیئے پر شرمندہ بھی ہیں۔ تب بھی وہ طلاق کے فیصلے پر قائم ہیں ہماری بیٹی ہے اور ہمیں اب صرف اسی کے لیے ہی سوچنا ہوگا۔ ٹھیک کہا عامر آپ نے فریال آپ کو ناک آؤٹ کرنے کے چکر میں خود ہی گھر سے آؤٹ ہوگئیں۔ ایسا تو ہوتا ہے ایسے کاموں میں......

گل مکئی

ملالہ پر بننے والی فلم 'گل مکئی' کا پوسٹر جاری کردیا گیا ہے اور فلم بھی جلد ریلیز ہوگی۔ فلم میں ملالہ کا کردار ریم شیخ ادا کررہی ہیں۔ ریم ڈراموں

میں کام کرنے کے حوالے سے شہرت رکھتی ہیں۔ انہوں نے اس کردار کے لیے بہت محنت بھی کی ہے۔ لباس، انداز اور دیگر باتوں میں انہوں نے ہو بہو ملالہ یوسف زئی کو کاپی کیا ہے اور بہت اچھا کام کیا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ چند ماہ میں یہ فلم نمائش کے لیے پیش کردی جائے گی۔

ہائے یہ تیری بجلیاں

FBR نے اداکارہ نور اور صبا قمر کے گھر Sealed کردیئے ہیں۔ فیڈرل بورڈ آف ریونیو کے مطابق دونوں اداکاروں نے ٹیکس نہیں دیا اس لیے ان کی جائیداد بحکم حکومت Sealed کردی گئی FBR کے اعلیٰ افسران قابل تعریف ہیں کہ انہوں نے دونوں اداکاؤں کو سزا دی۔ پاکستان کا پیسہ کھانے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے آخر کو یہی ٹیکس کا پیسہ تو ہے جس سے سڑکیں

بنتی ہیں، اسپتال، اسکول بنائے جاتے ہیں سستا اور یقینی انصاف ہر شہری کو میسر آتا ہے۔ اب پاکستانیوں کو ایسی سہولیات سے محروم کرنے والوں کے گھروں پر تالا تو لگنا ہی چاہیے۔ مگر خدارا ذرا اِدھر اُدھر بھی نظر ڈالیں جناب FBR والوں..... اس ملک میں اربوں روپے کھانے والے سرکاری پروٹوکول میں گھوم رہے ہیں۔ سرکاری ٹی وی پر بول رہے ہیں اور یہ پیسہ بھی عوام کا ہی ہے جو وہ ٹیکس کی صورت دیتے ہیں تو چھوٹے چوروں کے ساتھ ساتھ ذرا بڑے چوروں پر بھی اپنے انصاف کی بجلیاں گرائیں ورنہ زمانہ کیا کہے گا۔

☆☆......☆☆

افشاں چوہدری

دوشیزہ قارئین کی فرمائش پر اب سے انتہائی سہل کھانے کی تراکیب پیش کی جارہی ہیں وہ تراکیب جو عام زندگی میں سہولت کے ساتھ استعمال کی جاسکیں۔

چکن چاؤمن

ترکیب:

مرغی کے ٹکڑوں کو سرکے، سویا ساس اور کارن

فلور میں مکس کرکے آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔

نوڈلز کو ابالیں اور ٹھنڈے پانی سے نتھار لیں۔

پھر ایک چمچہ مکھن ملالیں۔

تیل گرم کریں اس میں پیاز ادرک لہسن فرائی کریں پھر چکن بھی ملالیں جب مرغی رنگ تبدیل کرلے تب پسند کی سبزیاں ملالیں فرائی کریں اور چکن اسٹاک بھی شامل کرلیں۔

اس کے بعد تھوڑا سا سرکہ، سویا ساس، کالی مرچ، نمک، چینی، آٹا مزید پانچ منٹ پکائیں اور گرم گرم سرو کریں۔

چکن لولی پاپ

اجزاء

چکن ونگ: 4 یا 5 عدد

کالی مرچ: آدھا چائے کا چمچ

اجینوموتو: آدھا چائے کا چمچ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded from Paksociety.com

سویا ساس: 2 بڑے چمچے

نمک: حسب ذائقہ

کارن فلور: 2 بڑے چمچے

ترکیب:

پیالے میں دو چمچ سویا ساس، کالی مرچ، اجینو موتو، نمک اچھی طرح مکس کرلیں اور چکن پر

لگادیں۔ دو چمچے کارن فلور میں ایک چمچ پانی، کالی مرچ، اور نمک مکس کرلیں اور چکن کو اس آمیزے میں ڈبو کرکے فرائی کریں۔

ڈش میں سلاد پتے سجائیں اور چکن لولی پاپ رکھ کر ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

بیف چلی

اجزاء:

گائے کا گوشت: ایک کلو

ہری مرچ: 6 عدد (باریک کاٹ لیں)

تیل: ایک پیالی

پیاز: چار (چھلے دار کاٹ لیں)

لہسن: ایک چائے کا چمچ

شملہ مرچ: 4 عدد

سویا ساس: 4 چائے کے چمچے

اجینو موتو: 4 چائے کے چمچے

نمک: حسب ذائقہ

ترکیب:

گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کاٹ لیں۔ لہسن اور

نمک ڈال کر پانی میں چڑھادیں اچھی طرح گل جائے تب کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ گوشت ڈالیں اور پانچ منٹ تک پکائیں پھر تمام باریک کٹی سبزیاں مکس کردیں۔ جب سبزیاں تیار ہوجائیں۔ ان میں سویا ساس اور اجینو موتو ڈالیں۔ گرم گرم چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

☆☆......☆☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM